پس نوشت

سوم

ڈاکٹر پرویز پروازی

نیازمانہ

نیازمانہ پبلیکیشنز

ISBN 978-969-9179-07-05

پس نوشت

سوم

ڈاکٹر پرویز پروازی

2010

محمد شعیب عادل نے

حاجی حنیف پریس سے چھپوا کر

نیا زمانہ پبلیکیشنز،

14 بی، ٹیمپل روڈ، لاہور سے شائع کی

ماہنامہ نیا زمانہ، 14 بی ٹیمپل روڈ، لاہور، فون 042 5065015

Email:niazamana@yahoo.com, www.niazamana.com

قیمت —— 400 روپے

مندرجات

1 گھنگرو ٹوٹ گئے۔ قتیل شفائی۔ 14

2 چاہِ یوسف سے صدا۔ یوسف رضا گیلانی۔ 22

3 عدالت عالیہ تک کا سفر۔ جسٹس ریٹائرڈ محمد اسلام بھٹی 27

4 سوانح عمری۔ محمد کاظم 32

5 داستاں میری۔ ڈاکٹر تصدق حسین راجا 37

6 سرگزشت۔ کرنل سید حسنین احمد 38

7 زبدہ سے مہران تک۔ فتح اللہ عثمانی 39

8 نوشاد کی خودنوشت۔ موسیقار عظیم نوشاد علی لکھنوی 40

9 حکایت ہستی۔ ڈاکٹر صغرا مہدی 43

10 سچا گیت گایا۔ ملکہ پکھراج 47

11 آپ بیتی پاپ بیتی۔ ساقی فاروقی 53

12 میری آخری منزل۔ جنرل محمد اکبر خان رنگروٹ 58

13 تجربات جو ہیں امانت حیات کی۔ ثاقب زیروی 64

14 میں تو بھارتی جاسوس نہیں تھا۔ میجر محمد اکرم خاں 70

15 لخت لخت داستان۔ بریگیڈیئر اسماعیل صدیقی 74

16 ایوان اقتدار کی کچھ جھلکیاں۔ کیپٹن گوہر ایوب خاں 78

17	واقعہ بھٹو سمیت۔ میجر جنرل راحت لطیف	84
18	غیر مرئی عورتوں کا ملک۔ ڈاکٹر قانتہ احمد	90
19	آہنگِ بازگشت۔ مولوی محمد سعید	96
20	ہنگاموں میں زندگی۔ مشتاق احمد خاں وجدی	104
21	جیون دھارا۔ مہر جیون خاں	111
22	جو بچے ہیں سنگ۔۔۔ راجہ تجمل حسین	119
23	راجہ تجمل حسین کی واقعاتی غلطیاں	124
24	تین صدور کا اڈی کانگ۔ ایمبیسیڈر ارشد سمیع خاں	130
25	آپ بیتی۔ رائٹ آنریبل سید امیر علی	135
26	لمحہ بہ لمحہ زندگی۔ ابوالامتیاز ع۔ س۔ مسلم	141
27	ذکرِ میر۔ میر تقی میر	147
28	شناسائیاں رسوائیاں۔ کشور ناہید	152
29	یادوں کا سفر۔ اخلاق احمد دہلوی	158
30	کچھ دیر پہلے نیند سے۔ سجاد نقوی	165
31	ایک ادھوری سرگزشت۔ انیس ناگی	169
32	ایسا بھی ہوتا ہے۔ سیف الدین بوہرہ	172
33	زندگانی کی گذرگاہوں میں۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز	173
34	بلاکم وکاست۔ مہدی علی صدیقی	179
35	بلبلیں نواب کی۔ موسیٰ رضا	183
36	فضائیہ میں گذرے ماہ وسال۔ ائیر مارشل ظفر احمد چوہدری	186
37	ایک دل ہزار داستان۔ آغا اشرف	192
38	تماشا گاہِ عالم۔ زبیدہ سلطانہ	195

39	جہادِ زندگانی۔ مولوی فیروز الدین	198
40	سفیر اور سفارت کاری: ایک دور کی کہانی۔ ایمبیسیڈر سمیع اللہ قریشی	204
41	یادوں کی دھنک۔ بریگیڈئیر ظفر اقبال چوہدری	210
42	معراج نامہ۔ ملک معراج خالد	213
43	مبالغہ نہ مغالطہ۔ میاں محمد ارشد	216
44	ذوقِ پرواز۔ محمد صدیق تہامی	220
45	کچے دھاگے سے بندھی یادیں۔ توصیف چغتائی	224
46	رودادِ قفس۔ مولانا حفیظ نعمانی	226
47	کاروانِ حیات۔ مولانا اطہر مبارک پوری	228
48	آشرم۔ شکیل الرحمن	231
49	مردِ آہن۔ حق نواز اختر	235
50	دھوپ چھاؤں۔ ڈاکٹر فاطمہ شاہ	241
51	اور میں پاکستان آگیا۔ ڈاکٹر منظر حسین کاظمی	247
52	یاد ہے سب ذرا ذرا۔ عبید الرحمن ایڈووکیٹ	251
53	ان کی باتیں ہماری یادیں۔ ایس این خاں	255
54	قصہ بے سمت زندگی کا۔ وہاب اشرفی	257
55	سفر جاری ہے۔ ملک مقبول احمد	260
56	کچھ لمحے میرے نصیبوں کے۔ محمد اعظم سبزواری	263
57	ہوک۔ سکے دار	265
58	پرواز۔ اے پی جے عبدالکلام	267
59	کیا دن تھے۔ قاضی جلیل عباسی	274
60	بیتی کہانی۔ نوابزادی شہر بانو بیگم	278

61	شاد کی کہانی شاد کی زبانی۔خودنوشت شاد عظیم آبادی	281
62	تیسرا جنم۔ڈاکٹر خالد جمیل اختر	285
63	کچھ یادیں کچھ باتیں۔ڈاکٹر شمیم جیراج پوری	289
64	سفرنامہء حیات۔ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی	292
65	چند خوشگوار یادیں۔بشیر احمد رفیق	296
66	دیکھی تیری دنیا۔پروفیسر افضل توصیف	302
67	کھلی کتاب۔عبدالستار ایدھی	306
68	بیتے لمحوں کی چاپ۔پروفیسر سمیع اللہ قریشی	310
69	ہم کہاں کے دانا تھے۔شیخ منظور الٰہی	317

✓

انتساب

میں اردو خودنوشتوں کے تجزیہ کے سلسلہ میں اپنی تیسری کتاب پس نوشت سوم کو بھی اپنے کرمفرما محترم شیخ منظور الٰہی مرحوم ومغفور کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں۔اے کاش ان کی خودنوشت ہم کہاں کے دانا تھے ان کی زندگی میں چھپ گئی ہوتی۔بہرطور اس کتاب کا تجزیہ اس کتاب کا حصہ ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

ڈاکٹر پرویز پروازی پاکستان اور ہندوستان میں چھپنے والی آپ بیتیوں کا محاکمہ کرنے میں برسوں سے اتنی تندہی کے ساتھ مصروف ہیں کہ انہوں نے اپنے اس تحقیقاتی اور معلوماتی کام کو اوجِ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ دو تین جلدوں میں اب تک وہ سینکڑوں آپ بیتیوں کی خوبیوں اور خامیوں پر اظہارِ خیال کر چکے ہیں ان میں زیادہ تر کا تعلق گزشتہ ساٹھ ستر سال میں برصغیر کے مختلف شہروں سے شائع ہونے والی خودنوشت سوانح عمریوں سے ہے۔ چند ایسی بھی ہیں جو ایک ڈیڑھ صدی قبل لکھی گئیں۔ انگریزی اور فارسی میں لکھی ہوئی کچھ ایسی ہیں جن کا اردو ترجمہ بعد میں ہوا۔ ''پس نوشت اور پسِ پس نوشت'' کے بعد اب انہوں نے ستر کے قریب مزید آپ بیتیوں کا جائزہ ''پس نوشت سوم'' کے عنوان سے زیرِ نظر کتاب میں کیا ہے۔ اس میں قتیل شفائی مرحوم اور پاکستان کے موجودہ وزیرِ اعظم یوسف رضا گیلانی کی جیل میں لکھی گئی آپ بیتی سے لے کر بھارت کے سابق صدر سائنس دان عبدالکلام ملکہ پکھراج، موسیقار نوشاد علی، فلمی کہانیاں لکھنے والے اداکار سکے دار، راجہ تجمل حسین اور درجنوں دوسری آپ بیتیوں کی چھان پھٹک کی ہے۔ آپ بیتیاں لکھنے والے ان لوگوں میں ادیب شاعر، عسکری افراد، سفارت کار اور سیاسی رہنما غرضیکہ ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے شامل ہیں۔

پروازی صاحب اردو زبان کے ادیب اور نقاد ہیں برسوں قبل وہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہو کر بیرون ملک چلے گئے۔ کئی برس سویڈن کی ایک یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ اب برسوں سے کینیڈا میں مقیم ہیں مگر پاکستان بالخصوص اردو زبان سے ان کی وابستگی میں کوئی فرق نہیں آیا اور

تصنیف و تالیف کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ اردو شعر و ادب سے ان کے تعلق کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی آپ بیتی لکھنے والے نے کسی شعر کا ایک مصرعہ تحریر کیا ہے تو وہ دوسرا مصرعہ لکھ کر اور شعر مکمل کر کے باذوق پڑھنے والوں کی ذہنی تسکین کا سامان بھی مہیا کر دیتے ہیں۔ اس کی ایک مثال لندن میں مقیم اردو کے معروف شاعر ساقی فاروقی کی خودنوشت ''پاپ بیتی'' کے ذکر میں ملتی ہے۔ ساقی نے رسا چغتائی کے ایک شعر کا بقول ان کے کیسا ظالم مصرعہ لکھا ہے ''پھر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا، ایسا کھلا'' اس پر انہوں نے یہ لکھتے ہوئے کہ ساقی اس شعر کا پہلا مصرعہ بھی لکھ دیتے تو لطف دگنا ہو جاتا پورا شعر تحریر کر دیا ہے جو یہ ہے۔ ''صرف مانع تھی حیا بندِ قبا کھلنے تک۔ پھر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا! ایسا کھلا!''۔ یہ ان کے ذوق اور طرزِ تحریر کا کرشمہ ہے کہ ان کے بظاہر تنقیدی مضامین بھی پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ میری جیسا آدمی جو عمر بھر نقادوں اور محققوں سے دور بھاگتا رہا ہے، آپ بیتیوں کے جائزوں پر مشتمل ان کی کتاب کو دو تین نشستوں ہی میں پڑھنے پر مجبور ہوا۔ اپنی صاف شستہ سلیس اور رواں تحریر کے ذریعہ وہ بہت گہری باتیں بھی کر جاتے ہیں۔ آپ بیتیاں لکھنے والوں کے لئے انہوں نے خاصا کڑا معیار قائم کر رکھا ہے اور اس کا ذکر وہ خاصے مؤثر انداز سے کرتے ہیں۔ مثلاً ان کی پہلی کتاب میں اس بات پر بار بار زور دیا گیا ہے کہ آپ بیتی لکھنے والے کو اپنی زندگی کے حالات و واقعات کا ذکر کرتے ہوئے اس امر کا وقوف ہونا چاہیئے کہ کون سے حالات و واقعات لکھنے ہیں اور کون سے چھوڑ دینے ہیں۔ میں اپنے بارہ میں آج یہ راز کی بات بتا رہا ہوں کہ جس زمانے میں میں نے ان کی یہ کتاب پڑھی میں اپنی آپ بیتی لکھنے کے عمل کا آغاز کر چکا تھا۔ ان کے کڑے اصولوں کی روشنی میں جب میں نے اپنے لکھے ہوئے ساٹھ ستر صفحات پڑھے تو میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ ان میں سے کون سا حصہ ضروری ہے اور کون سا غیر ضروری۔ چنانچہ میں نے یہ بساط ہی لپیٹ دی۔ خیر یہ جملہ معترضہ تو ایسے ہی بیچ میں آ گیا۔ اصل بات وہ ہے جو میں اس سے قبل اپنے ایک کالم میں لکھ چکا ہوں یعنی آپ بیتیوں پر ادب کا کوئی طالب علم ڈاکٹریٹ کرنا چاہے تو اسے دو اڑھائی سو کتابیں پڑھنے کی ضرورت نہیں وہ اس موضوع پر پروازی صاحب کی دو تین کتابیں پڑھ کر سرخرو ہو سکتا ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے برسوں وطن سے دور رہنے کے باوجود انہیں ہندوستان یا پاکستان میں شائع ہونے والی کسی بھی آپ بیتی کا پتہ بھی چل جاتا ہے اور ایسی ہر کتاب ان تک پہنچ بھی جاتی ہے۔اس سلسلہ میں انہوں نے معروف صحافی اور ہمارے دوست خالد حسن کا جن کا کچھ عرصہ قبل واشنگٹن میں انتقال ہوا ہے ایک تبصرے کا ذکر کیا ہے جس میں اس نے ذکر کیا تھا کہ پروازی صاحب نے ہندوستان اور پاکستان میں اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں جو انہیں شائع ہونے والی ہر آپ بیتی کی اطلاع بہم پہنچاتے ہیں۔خود میرے لئے زیادہ حیرت کی بات اپنے موضوع پر ان کی گرفت اور گہرائی کی ہے۔کسی بھی زیر تبصرہ کتاب میں کوئی تضاد بیانی ہو یا کسی لکھنے والے نے واقعات بیان کرنے میں غلطی کا ارتکاب کیا ہو تو برسوں بلکہ عشروں قبل شائع ہونے والی کسی دوسری آپ بیتی کے مستند حوالوں سے مع اس کتاب کے صفحہ نمبر کے متعلقہ تحریر کے ذریعہ صحیح واقعات سامنے لے آتے ہیں۔دوڈھائی سو کتابوں کے جن کی اشاعت کا زمانہ ستر اسی برس پر محیط ہو متن سے ایسے حوالوں کو ڈھونڈھ نکالنا یا یاد رکھنا ہمارے جیسے خاکی انسان کے بس کی تو بات ہی نہیں،ایسا جناتی کام پروازی صاحب جیسا آدمی ہی کر سکتا ہے جسے اپنے علمی اور تحقیقاتی کام سے جنون کی حد تک لگاؤ ہو۔

سید یوسف رضا گیلانی نے جیل میں اپنی آپ بیتی ''چاہ یوسف سے صدا'' لکھی۔اس میں کارگل کا سانحہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے اپنی یادداشت پر بھروسہ کیا اور اصل حقائق سے روگردانی کے مرتکب ہوئے۔پروازی صاحب نے کارگل سے فوجوں کی واپسی سے متعلق گیلانی صاحب کی کتاب سے متعلقہ پیرا نقل کرنے کے بعد اس وقت کے امریکی صدر بل کلنٹن کی خودنوشت ''مائی لائف'' کے صفحہ ۵۱۳ پر لکھی ہوئی وہ تحریر بھی نقل کر دی جس سے کارگل کے واقعہ کے بعد پاکستانی فوج کی واپسی کی نواز شریف کی کوششوں اور متعلقہ واقعات صحیح صورت میں سامنے آگئے۔

اسی طرح پروازی صاحب نے راجہ تجمل حسین کی خودنوشت ''جو بچے ہیں سنگ'' کی اگرچہ اس لحاظ سے بہت تعریف کی ہے کہ ان کی آپ بیتی مصنف کی صاف گوئی اور بے لاگ تبصروں کی وجہ سے پڑھنے کی چیز ہے مگر اس کے ساتھ ہی ان کی بعض غلطیوں کی نشان دہی اور ایک دوسری

آپ بیتی کے ذریعہ ان کی تصحیح بھی کر دی ہے۔۔راجہ تجمل حسین کی کھلی اور بے لاگ تحریر کے ذکر میں انہوں نے راجہ صاحب کے بڑے بھائی الطاف گوہر اور ضیاء الحق کی ایک ملاقات کا ذکر بھی کیا ہے۔جو اس طرح ہے ''ضیا صاحب نے گوہر صاحب سے کہا آپ شاید ہمارے ساتھ کام کرنے سے ڈرتے ہیں۔انہوں نے کہا نہیں سر میں آپ سے نہیں ڈرتا ان سے ڈرتا ہوں جو آپ کے بعد آئیں گے۔اس پر ضیا نے جو فقرہ بولا وہ تاریخی تھا اور وہ یہ تھا ''اگر تمہاری مراد بھٹو سے ہے تو وہ تو اس وقت زندہ نہیں ہوگا''۔چونکہ راجہ تجمل حسین کی آپ بیتی میں ایسے بہت سے تاریخی واقعات کا ذکر موجود ہے اس لئے پروازی صاحب نے اس کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔لیکن تجمل صاحب کی کتاب کے باب ''پاکستان بن گیا'' میں بعض غلطیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے پروازی صاحب نے لکھا ہے کہ ''اس باب میں مصنف نے زیادہ تر اپنی یادداشت پر انحصار کیا ہے اور قیام پاکستان کی تاریخ پر شائع ہونے والی کتب سے استفادہ نہیں کیا۔مثلاً باؤنڈری کمشن کے بارہ میں انہوں نے اپنی اس آپ بیتی میں سنی سنائی باتیں لکھ دی ہیں۔اصلاح احوال کے لئے انہوں نے سر محمد ظفر اللہ کی آپ بیتی ''تحدیث نعمت'' کے متعلقہ حصے کے اقتباسات کے ذریعہ اصل واقعات کی نشان دہی کر دی ہے۔ہم نے محض دو مثالیں پیش کی ہیں۔یہ کام پروازی صاحب درجنوں بار کر چکے ہیں۔

پس نوشت سوم میں جہاں کچھ آپ بیتیوں کا جائزہ کئی صفحات پر پھیلا ہوا ہے وہاں کچھ ایسی کتابوں پر تبصرہ ایک ڈیڑھ صفحے تک محدود ہے۔مصنف نے ہر کتاب کی اہمیت اور معیار کے لحاظ سے اس کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے مگر کسی کتاب کا ذکر چار چھ صفحات پر مشتمل ہو یا ایک ڈیڑھ صفحے پر تشنگی کا احساس کہیں نہیں ہوتا۔پڑھنے والے کی دلچسپی بھی برابر قائم رہتی ہے۔ میں ان کی اس کاوش کو ان کا ادبی کارنامہ قرار دوں تو غلط نہ ہوگا۔یہ امر یقینی ہے کہ ان کی اس محنت سے اہل ادب کے طالب علم نسل در نسل استفادہ کرتے رہیں گے۔

حمید اختر

لاہور

۳۰ نومبر ۲۰۰۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

الحمدللہ کہ اردو کی خودنوشتوں پر میرے تجزیاتی اور تحقیقاتی کام کی تیسری جلد پس نوشت سوم کے عنوان سے چھپنے کو جارہی ہے۔ پہلی اور دوسری جلد میں ۱۵۲ کتابوں کا تجزیہ شامل تھا تیسری جلد میں مزید ۵۷ کتب شامل ہوگئی ہیں اس طرح برادرم ڈاکٹر انور سدید کی قومی زبان کے تبصرہ میں کہی گئی بات پوری ہوگئی ہے کہ یہ کتاب اردو کی خودنوشتوں پر سب سے زیادہ ضخیم کتاب بن گئی ہے۔ خدا کرے اہلِ ذوق وعلم سے علمی لحاظ سے بھی وقعت ووسعت کی سند پائے۔

میں طول طویل دیباچوں کا قائل نہیں مگر پچھلی جلد میں جو باتیں میرے ناقص علم کی وجہ سے نادرست لکھی گئی ہیں ان کی تصحیح ہو جانی چاہیئے۔ میں نے اخلاق احمد دہلوی کی کتاب کے تجزیہ کے سلسلہ میں لکھا تھا کہ سر سلطان احمد جو وائسرائے کی کونسل کے رکن تھے مدراس کے رہنے والے تھے۔ جناب منصور کاظم نے خط کے ذریعہ مجھے توجہ دلائی کہ ان کا تعلق مدراس سے نہیں پٹنہ سے تھا۔ دوسری بات رشید امجد کی خودنوشت میں مذکورہ واقعہ سے متعلق تھی کہ ایئر مارشل ظفر چوہدری نے جو فضائیہ کے چیف آف سٹاف تھے پشاور کے مشاعرہ میں احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کے مابین صلح کروانے کی سعی کی تو احمد فراز نے یہ کہہ کر بات بگاڑ دی کہ اوراق تو قاسمی صاحب کی چیزیں چھاپ سکتا ہے مگر قاسمی صاحب وزیر آغا کی چیزیں چھاپ کر فنون کا معیار نہیں گرا سکتے۔ میں بھی چونکہ اس موقعہ پر موجود تھا میں نے غلط فہمی میں رشیدؔ امجد کی بات کی تردید کردی۔ مگر انگلستان میں محسن احسان اور رشید قیصرانی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے رشید امجد کی بات کی تصدیق کی۔ اسی طرح جناب انور سدید نے بھی اپنے تبصرہ میں رشید امجد کی بات کو درست قرار دیا۔ عقدہ یوں کھلا

کہ ایئر مارشل ظفر چوہدری کے چیف آف سٹاف ہونے کے زمانہ میں دو مشاعرے پشاور میں ہوئے میں پہلے میں حاضر تھا مگر دوسری تقریب میں جس میں یہ صلح صفائی کا سلسلہ ہوا میں حاضر نہیں تھا اس لئے میں نے لاعلمی میں رشید امجد کی تردید کردی۔ اصل بات وہی ہے جو جناب انور سدید نے لکھی ہے کہ رشید امجد بہ طور مبصر پنڈی سے تشریف لائے تھے اور اس موقعہ پر پشاور میں موجود تھے میں موجود نہیں تھا۔ میں اپنی کوتاہی اور لاعلمی کا اعتراف کرتا ہوں اور جناب رشید امجد سے معذرت خواہ ہوں۔

خدا کرے میری یہ تحقیقی کاوشیں مستقبل کے ریسرچرز کے لئے مفید اور معین ثابت ہوں۔

غریب الوطنی میں بیٹھ کر ایسے موضوع پر کام کرنا جس میں دن بہ دن نئی کتب کا اضافہ ہو رہا ہو بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن الحمدللہ کہ میں اپنے عبدالوہاب خان سلیم جیسے کتابوں کے عاشق اور علمی کاموں میں ہر ممکن اعانت کرنے والے مخیر دوست اور پروفیسر شمیم احمد اور عبدالکریم قدسی جیسے کتاب پرستوں اور دوسرے علم دوست احباب کے تعاون سے یہ کام کرنے میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے سرخرو ہوتا چلا گیا۔ خالد حسن مرحوم کا تعاون شامل نہ رہتا تو شاید میں حوصلہ ہار بیٹھتا۔ مگر یہ سب ہمارے بزرگ استادوں کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ ہم نے نایابی اور کمیابی کے اسباب سے دل گرفتہ ہو کر دل چھوڑ دینا نہیں سیکھا۔

میرے بزرگ استاد استاذی المکرم مبارک احمد انصاری اور راجہ کرنل محمد اسلم نے دقت نظری سے حسب معمول پروف پڑھے اور میری باریک در باریک کتابت کی غلطیوں کا سراغ بھی لگالیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

پرویز پروازی
۵۹۱۴ لانگ ویلی روڈ۔ مسی ساگا۔ اونٹاریو
ایل ۵ ایم۔ ۶ جے ۶۔ کینیڈا
۳۱ جنوری ۲۰۱۰

گھونگرو ٹوٹ گئے

مشہور شاعر، فلمی گیت نگار اور دنیائے ادب کی جانی پہچانی شخصیت اورنگ زیب خاں قتیل شفائی کی خودنوشت ''گھونگرو ٹوٹ گئے'' کے عنوان سے ان کی وفات کے بعد پچھلے برس لاہور سے الحمد والوں نے شائع کی ہے۔ قتیل شفائی اپنی زندگی میں اس خودنوشت کو اپنے شاگرد نعیم چشتی کو ریکارڈ کروا رہے تھے کیونکہ انہیں نثر لکھنے میں کچھ حجاب اور تامل و تردد تھا۔ نعیم چشتی صاحب نے ان کی اس مشکل کا حل یہ نکالا کہ وہ اپنی یادداشتیں انہیں ریکارڈ کرواتے جائیں وہ ان کا ٹرانسکرپٹ تیار کر کے کتاب کی صورت میں مرتب کر دیں گے چنانچہ یہ یادداشتیں ریکارڈ ہوئیں اب ان کی وفات کے بعد اظہر جاوید صاحب کے دیباچہ کے ساتھ طبع ہو رہی ہیں۔ ماہنامہ تخلیق کے ایڈیٹر اظہر جاوید ان کے رازدان ساتھیوں میں سے تھے۔ کتاب کا نام بھی اظہر جاوید کا رکھا ہوا ہے جو قتیل شفائی کے مشہور زمانہ گیت سے لیا گیا ہے۔ ''مجھے آئی نہ جگ سے لاج۔ میں اتنے زور سے ناچی آج۔ کہ گھنگرو ٹوٹ گئے'' (صفحہ ۳۴) مگر ہم حیران ہیں کہ نعیم چشتی صاحب کہاں غائب ہو گئے ہیں؟

اس کتاب کا اسلوب بیانیہ ہے یعنی جو بات یاد آتی گئی بیان ہوتی چلی گئی البتہ ابتدائی زندگی کے حالات یکجا بیان ہوئے ہیں۔ ان حالات کے بعد چل سو چل کا سلسلہ ہے۔ امیر باپ کی وفات کے بعد مسائل شروع ہوئے۔ جمع جتھا خرچ ہوئی تو گھر کا سامان بیچنے کی نوبت آئی جو ان کے قریبی عزیز رشتہ دار ہی کوڑیوں کے مول ان سے خریدتے اور اپنے گھر بھرتے رہے۔ اس نے انہیں برادریوں رشتہ داریوں سے بدظن کر دیا۔ شادی نوجوانی ہی میں ہو گئی تھی اس لئے اپنے

بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے چھوٹی موٹی ملازمتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ادب سے لگاؤ تھا اور شعر کہنے کا شوق اس لئے سخن گوئی بھی ساتھ ساتھ ہوتی رہی۔ اپنے فن کے زور پر شہرت پائی اور ہری پور سے اٹھ کر پنڈی اور پھر لاہور آ گئے۔ تقسیم ہند سے قبل کا لاہور ان کا مسکن تھا اور ان کے بہت سارے دوستوں میں ہندو اور سکھ دوست شامل تھے اور عمر بھر ان سے رشتۂ مودت و وفا قائم رہا۔ فلمی دنیا سے ان کا تعلق نغمہ نگار کی حیثیت سے قائم ہوا اور انہوں نے اپنے کمال فن کی داد پائی۔ نغمہ نگاری کے علاوہ فلم سازی میں بھی ہاتھ پیر مارتے رہے۔ بمبئی بلکہ آج کل کی ممبئی کی فلمی دنیا سے ان کا ربط رہا۔ مشاعروں میں اپنے شعر کی وجہ سے اور فلمی حلقوں میں اپنے نغموں کی وجہ سے ہمیشہ ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔

ہماری بے نصیبی کہ ہمیں فلم اور فلم کے متعلقات سے طبعاً یک گونہ بے اعتنائی ہے۔ نہ فلم دیکھی نہ فلمی گانوں کی سوجھ بوجھ پیدا ہوئی بلکہ اس کے بعد جب ریڈیو ٹی وی کا زمانہ آیا تو بھی ہماری یہ عادت قائم رہی۔ اس لئے قتیل شفائی سے ہمارا تعارف محض شاعر قتیل شفائی سے رہا۔

ان سے ہماری پہلی ملاقات مظفر آباد ملتان کی کالونی مل والوں کے مشاعرہ میں ہوئی اور آخری ربوہ کے ایوان محمود کے مشاعرہ میں۔ ہم پہلی ملاقات کے وقت گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ میں لیکچراری کر رہے تھے۔ اس مشاعرہ میں قاسمی صاحب بھی تشریف لا رہے تھے اور ثاقب زیروی بھی اس لئے ہمارے رفیق کار ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی نے بہ اصرار ہمیں بھی اپنے ساتھ لیا اور ہم شاعروں اور ان کے ابا اختر شیرانی کے دوستوں کا استقبال کرنے ملتان کے ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ گاڑی آئی شعرا اترے قتیل شفائی صاحب کے ہاتھ میں ٹفن کیریئر تھا شاید انہیں کسی چیز سے پرہیز ہوگا اس لئے اپنا کھانا ساتھ لے کر آئے تھے۔ پلیٹ فارم پر اترے تو ٹفن کیریئر پلیٹ فارم پر رکھا اور میزبانوں اور استقبال کرنے والوں سے ملنا شروع کر دیا اسی طرح ملتے ملتے گیٹ سے باہر نکل آئے۔ ہم نے ان کا ٹفن اٹھا لیا تھا۔ جب باہر نکل کر یہ لوگ کالونی ملز والوں کی گاڑی میں بیٹھنے لگے تو ہم نے آگے بڑھ کر ٹفن ان کی خدمت میں پیش کیا اور کہا ''قبلہ یہ ٹفن آپ کا تو نہیں؟''۔ قتیل شفائی نے برجستہ جواب دیا ''کیوں؟ کیا آپ کسی اور مسافر کا سمجھ کر اٹھا لائے

ہیں''۔اس پہلی ہی ملاقات میں ہمیں اندازہ ہو گیا کہ قتیل صاحب حاضر جواب اور برجستہ گو ہیں۔
ساڑھے چھ سو صفحے کی اس کتاب میں ہمیں تجسس ہی رہا کہ ان کی برجستگی کا یہ پہلو کہیں معرض بیان میں آیا ہو مگر نہیں آیا۔اس کی وجہ بظاہر یہی رہی ہو گی کہ یہ اپنی باتیں ریکارڈ کرواتے ہوئے اپنی حاضر جوابی یا برجستگی کا ہدف کسے بناتے؟ دوسری ملاقات کے وقت ہم گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں پڑھا رہے تھے۔ربوہ والوں پر حکومت کی طرف سے اتنی پابندیاں تھیں کہ وہ پرائیویٹ فنکشنز میں بھی لاؤڈ سپیکر استعمال نہیں کر سکتے تھے ایوان محمود تو بہت بڑا اور وسیع وعریض ہال ہے اس میں کوئی تقریب لاؤڈ سپیکر کے بغیر کیسے ہوتی؟ ہم نے ڈپٹی کمشنر صاحب کا دروازہ جا کھٹکھٹایا کہ لاؤڈ سپیکر استعمال کرنے کی اجازت مرحمت ہو تو ہم مشاعرہ منعقد کروا سکیں۔کہنے لگے کون کون آ رہا ہے ہم نے بتایا لاہور کے شعرا میں منیر نیازی ہیں قتیل شفائی ہیں حبیب جالب ہیں۔ڈی سی صاحب نے ہماری جانب بے اعتباری کی نظروں سے دیکھا اور کہنے ڈاکٹر صاحب اتنے بڑے شاعر آپ کے کہے پر آ بھی جائیں گے؟ ہم نے کہا جناب یہ لوگ وعدہ کر چکے ہیں اور مولوی ہرگز نہیں ہیں کہ وعدے کر کے مکر جائیں۔ڈی سی صاحب نے اجازت تو دے دی مگر معلوم ہوتا ہے انہوں نے اس مشاعرہ کے بارہ میں سرکاری رپورٹ طلب کرنے کے لئے چنیوٹ کے اے سی اور ربوہ کے مجسٹریٹ کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ مشاعرہ میں بطور سامع شریک ہو کر انہیں رپورٹ دیں کہ لاہور سے کون کون شامل ہوا۔خیر مشاعرہ ہوا ربوہ والے اپنی جگہ حیران کہ یہ کیسا نیک دن چڑھا ہے کہ انہیں لاؤڈ سپیکر استعمال کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔اے سی صاحب لوکل مجسٹریٹ صاحب دونوں آئے ان کے آنے کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اے سی صاحب منیر نیازی صاحب کو اپنے مہمان کے طور پر چنیوٹ میں ٹھہرانے کے لئے لے گئے اور ان کی ضروریات کا اہتمام فرما دیا ورنہ ہم تو انہیں مشاعرہ کے ختم ہوتے ہی واپس لاہور بھیجنے کا انتظام کئے بیٹھے تھے۔قتیل شفائی نے اس مشاعرہ میں تحت اللفظ غزلیں سنائیں تب ہمیں اندازہ ہوا کہ لوگ ان کے شعروں کو محض ترنم کی وجہ سے پسند نہیں کرتے ان کے شعروں میں توانائی ہے۔قتیل صاحب نے ملاقات کے وقت بتایا کہ اس وقت میری عمر اکہتر برس ہے تو ہم نے حیرت سے انہیں دیکھا وہ چہرے مہرے

سے ہرگز اتنے عمر رسیدہ نہیں لگتے تھے۔اب کتاب میں یہ انکشاف بھی موجود ہے کہ ان کی زندگی کا آخری رومان کہیں اسی برس کے لگ بھگ کی عمر میں وقوع پذیر ہوا۔ہر مردے و ہر کارے۔

قتیل شفائی نے بھرپور زندگی گزاری کتاب کا انتساب یہی کہتا ہے''زندگی کے نام جس سے کوئی شکوہ نہیں جس پر کوئی پچھتاوا نہیں''۔یہ انتساب قتیل صاحب کا اپنا تجویز کردہ نہیں اظہر جاوید کے بیان کے مطابق ان کا اخذ کردہ ہے۔مگر یہ خود نوشت ان دونوں باتوں کی گواہ ہے۔فلمی دنیا سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کے ہاں عائلی زندگی سے ماورا کچھ رومانی سرگرمیاں ساری عمر جاری رہیں ابتدا میں چندر کانتا سے ان کا تعلق ہوا جو ان کی خاطر ہجرت کر کے ہندوستان نہیں گئیں۔اقبال بانو سے ان کا تعلق جوڑ نکے کی چوٹ قائم رہا اور زبان زد عام۔حتیٰ کہ ان کا آخری معاشقہ جو جوش صاحب کی طرح ان کے لئے بھی''فتنہء آخر الزمان'' کہلانے کا مستحق ہے اواخر عمر میں برپا ہوا اور خاصا ہنگامہ خیز ثابت ہوا مگر قتیل صاحب اس سے بھی نپٹ لئے۔اظہر جاوید نے اس فتنہء آخر الزمان کی تصویر اور تفصیل دیباچہ میں بیان کر کے گویا قتیل صاحب کے بیان نزعی کا تتمہ لکھا ہے۔

خوبی یہ ہے قتیل صاحب کو اپنے بارہ میں کوئی کامپلیکس نہیں۔کامیابیاں بھی بہت آئیں اور ناکامیاں بھی ان کی راہ کا پتھر بنیں دونوں سے بڑی خوبی سے عہدہ برآ ہوئے۔گر بہ دولت برسی مست نہ گردی مردی۔گر بہ نکبت برسی پست نہ گردی مردی۔قتیل صاحب امارت میں مست نہیں ہوئے اور غربت میں پست نہیں ہوئے۔اس زمانہ میں ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں؟

عقائد کے لحاظ سے سنی العقیدہ مسلمان رہے مگر نظریات کے لحاظ سے سوشلسٹ اور کسی جگہ اپنے نظریات کا اخفا روا نہیں رکھا البتہ اعلاء بڑھ چڑھ کر کیا۔مولویوں سے انہیں چڑ رہی بزرگ ادیب حمید اختر نے اپنے کالم میں ان کا بیان کردہ وہ لطیفہ درج کیا ہے جو سید عطاء اللہ شاہ بخاری اپنے وعظ میں برملا سنایا کرتے تھے کہ ایک مرید نے کہا پیر بادشاہ بھیڑیا میری بکریاں اٹھا کر لے جاتا ہے مجھے کوئی تعویذ لکھ کر دو۔شاہ جی نے اسے سمجھایا کہ صرف تعویذ سے کام نہیں چلے گا تم کوئی کتا پال لو۔مرید کو بہت غصہ آیا اس نے پیر صاحب سے کہا''نا سائیں نا۔میرا تو پیر بھی توں تے

میرا کتا بھی توں بس تو تو مجھے تعویذ دے دے'' (صفحہ ۴۲۱) یہ لطیفہ شاہ جی خود سنایا کرتے تھے اور ہم نے بھی چنیوٹ کی ایک مجلس میں ان کے دہان مبارک سے سنا ہؤا ہے اس کا قتیل صاحب کی خودنوشت سے کوئی تعلق نہیں سرا ہے اس کا ذکر درمیان میں آ گیا ہے۔

واقعاتی غلطیاں بھی دو چار درمیان میں آ گئی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شہنشاہ ایران ''دراز قد آدمی تھے خوب صورت، خوش پوش اور خوش آواز'' (صفحہ ۵۸۶) مگر قتیل صاحب کو شاید پتہ نہیں کہ شہنشاہ اونچی ایڑی کے جوتے پہنتے تھے جو ان کے قد میں کم از کم تین انچ کا اضافہ کر دیا کرتے تھے۔ مختار مسعود کے ہاں لوح ایام میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ پھر قتیل صاحب نے لکھا کہ ''جوش صاحب کی بہت سی بیٹیاں تھیں'' (صفحہ ۵۴۹) ان کی صرف ایک ہی بیٹی تھی سعیدہ اس کا نام تھا۔ یادوں کی برات میں سب کچھ موجود ہے البتہ یہ بات درست ہے کہ ان کی اولاد معاشی لحاظ سے ان پر بوجھ تھی۔

ظہور نظر کے بارہ میں قتیل صاحب نے بڑی افسوسناک بات لکھی ہے کہ ''مولویوں نے ظہور نظر کا جنازہ دو دن تک نہیں پڑھا کہ اس پر احمدی ہونے کا شبہ تھا'' (صفحہ ۴۲۲)۔ مولوی تو تکفیر اور جنازہ نہ پڑھنے کے سلسلہ میں ہمیشہ دلیر رہے ہیں ظہور نظر کے ماں باپ اور اکثر رشتہ دار احمدی تھے ربوہ بھی اس کا آنا جانا تھا مگر ربوہ تو ہر شریف آدمی کا آنا جانا تھا قتیل شفائی بھی ربوہ تشریف لا چکے تھے اور مشاعرہ پڑھ چکے تھے۔ الحمدللہ کہ قتیل صاحب کے ساتھ ایسی کوئی واردات نہ ہوئی۔

ممتاز مفتی کی شخصیت کا یہ پہلو ان کے ہاں بیان ہؤا ہے کہ وہ مبتدی افسانہ نگاروں کی حوصلہ شکنی کیا کرتے تھے ''میں نے ایک افسانہ لکھا اور مفتی صاحب کے پاس لے گیا۔۔۔ افسانہ سن کر کہنے لگے یار تم یہ افسانہ لکھا ہے۔۔ میں نے کہا ہاں میں نے افسانہ ہی لکھا ہے کہنے لگے یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ میں نے کہا آپ کا کیا خیال ہے اس میں امپرو ومنٹ ہو سکتی ہے کہنے لگے قطعاً نہیں ہو سکتی۔ اس میں کوئی گنجائش نہیں'' (صفحہ ۲۱۵)۔ اچھا ہی ہؤا کہ ممتاز مفتی نے انہیں یکسو کر دیا اور پھر یہ افسانہ نگاری کی جانب لوٹ کر نہیں گئے۔ بعض اوقات شر میں سے خیر کے پہلو نکل آتے ہیں۔

یہ خودنوشت احوال الرجال کے پیرایہ میں ہے اس لئے اس میں بیشمار علمی سیاسی ادبی اور فلمی لوگوں کا احوال بیان ہؤا ہے۔ احمد ندیم قاسمی، عدم، نقوش والے محمد طفیل، طفیل ہوشیار پوری، صدر ایوب جن کے ساتھ ان کا ہم وطنی کا تعلق بھی تھا، لتا منگیشکر، مہندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی، کمال امروہوی، گلزار، خوشتر گرامی، اختر شیرانی، ساحر لدھیانوی، (داڑھی لگا کر ایکٹر بننے والے حمید اختر)، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، فیض، حفیظ ہوشیار پوری، حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی، وغیر ہم غرض ادیبوں شاعروں کی ایک کہکشاں ہے جو موجود ہے۔ قتیل صاحب رائٹرز گلڈ کے سکرٹری بھی رہے۔ روس کے دورہ پر بھی گئے انڈیا کا دورہ تو ان کا مسلسل رہتا تھا۔ مگر شاعروں سے زیادہ خوش نہیں ہیں۔ خاص طور پر شاعر افسروں سے تو ان کی ٹھنی رہی۔ ''میرا تجربہ یہ ہے کہ جس ادارے کا سربراہ شاعر ہوگا اور وہ اندرونی طور پر محسوس کر رہا ہو کہ اسے جتنی شہرت ملنی چاہئے تھی وہ نہیں ملی تو وہ انتقام پر اتر آئے گا اور اس کا بدلہ دوسرے شاعروں سے لے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہؤا حضرت ضیا جالندھری شاعروں سے بدلہ تو لے ہی رہے تھے کیونکہ ان کے گیتوں کے ساتھ ان کا نام نہیں دیتے تھے لیکن انہوں نے میرے ساتھ یہ کیا کہ ٹیلیفون پر حکم صادر کر دیا کہ میرے گیتوں پر بین ہے۔'' (صفحہ ۴۳۴)۔

ہم یہ بات نظر انداز کر دیتے مگر حال ہی میں کشور ناہید کی آپ بیتی کا احوال الرجال والا حصہ چھپا ہے اس میں وہ یوں لکھ رہی ہیں گویا ضیا جالندھری کا تقرر ان کی اور صوفی تبسم کی سفارش کی وجہ سے ممکن ہؤا تھا بہرحال اس تعلّی آمیز بات کے بعد آگے چلئے ''ضیا جالندھری کی مراد بر آئی۔ عہدہ مل گیا پھر اختر وقار عظیم کا کمرہ تھا اور افسر بنے ضیا جالندھری تھے فرمایا یہ ذرا کشور ناہید اور یوسف کامران کو ٹی وی پر مت بلایا کرو۔ انہی دنوں خوشی خوشی سرمد صہبائی ان کے کمرے میں چلا گیا۔ پوچھا کیوں آئے؟ اس نے کہا ایک شاعر سربراہ مقرر ہؤا دل خوش ہؤا بولے کان کھول کر سن لو ضیا نثار احمد ایم ڈی ٹیلیویژن ہؤا ہے ضیا جالندھری نہیں'' (شناسائیاں رسوائیاں صفحہ ۱۱۵)۔ ہم ذاتی طور پر ضیا جالندھری سے اتنے واقف نہیں کہ ان دونوں باتوں کی تصدیق یا تردید کر سکیں۔ ہماری ضیا جالندھری سے دو ملاقاتیں ہوئیں ایک ساقی فاروقی کے گھر۔ یہ لندن آئے ہوئے تھے

میں اتفاق سے لندن میں وارد ہؤا تو ساقی نے بلالیا کہ آؤ ضیا جالندھری آئے ہوئے ہیں ان سے ملو۔ان دنوں اردو کی خودنوشتوں کے بارہ میں میرے مضامین علامت میں چھپ رہے تھے جس کے اعزازی مدیر ضیا جالندھری تھے۔ہم اس محفل میں پہنچے تو جس طرح ضیا جالندھری نے کھڑے ہو کر کھلے بازوؤں سے ہمارا استقبال کیا اس سے ہمارا جی خوش ہو گیا۔تین روز بعد ضیا جالندھری ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں برمنگھم آئے اتفاق سے اس مشاعرہ کی نظامت ہمارے سپرد تھی۔ضیا کے ساتھ ان کی بیگم شفقت ضیا بھی تھیں۔شفقت بھابی نے خواتین کے لئے علیحدہ انکلوژر میں بیٹھنے کی بجائے ضیا جالندھری کے ساتھ ہی بیٹھنا پسند کیا۔جب ضیا جالندھری کی باری آئی تو ہم نے معنیٰ خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا جناب ’’ضیا جالندھری سے درخواست ہے کہ از رہِ شفقت اپنا کلام عطا فرمائیں‘‘۔حاضرین نے دل کھول کر اس بات کی داد دی اور ضیا اور شفقت دونوں نے اس بات کی برجستگی پر سر دھنا۔اس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ضیا جالندھری کے مزاج میں کوئی افسرانہ کیڑا تھا مگر دو ادیبوں کی گواہی کو ہم کیسے جھٹلا دیں۔ہم نے اپنا تجربہ درج کر دیا ہے اب قتیل صاحب کے قاری جانیں اور وہ۔

اسی طرح نقوش والے محمد طفیل کے بارہ میں بھی ان کی باتیں سخن گسترانہ ہیں۔حالانکہ قتیل صاحب تو اپنے دوستوں کے جائز و ناجائز دفاع پر مستعد رہتے ہیں۔ساحر لدھیانوی کی مردانگی یا رجولیت کے بارہ میں تو ساحر کے دفاع پر پورا مضمون لکھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ساحر میں رجولیت تھی مگر وہ ذہنی نامردی کا شکار تھا اس لئے شادی کرنے سے بھاگتا تھا۔(صفحہ ۴۱۶)۔ امرتا پریتم کے ایک بچے کی شباہت ہو بہو ساحر کی تھی۔امرتا پریتم نے اس کا جواز یہ پیش کیا تھا کہ دوران حمل ساحر اس کے حواس پر اس طرح چھایا ہؤا تھا کہ اس کی شبیہہ بچے کی شبیہہ بن گئی۔ قتیل شفائی نے بزعم خود سائنسدان بن کر سائنسی بنیادوں پر اس کی اس بات کو جھٹلایا ہے اور کہا ہے کہ ’’امرتا پریتم کی توجیح غیر سائنسی ہے‘‘ (صفحہ ۴۱۳) حالانکہ آج کی سائنس اس بات کو قطعی طور پر رد نہیں کرتی۔

چواین لائی صاحب پاکستان تشریف لائے تو قتیل صاحب نے اپنی دانست میں ایک

چینی نغمہ مقامی چینیوں سے مدد لے کر تیار کیا اور ان کے اعزاز میں ہونے والی تقریب میں پیش کیا۔چواین لائی بہت خوش ہوئے اور پوچھا یہ نغمہ کس زبان میں تھا؟ (صفحہ ۴۸۵) غیر ملکی زبانوں کے سلسلہ میں یہی حال ہوتا ہے شاہ ایران نے بھی تو اقبال کے کلام کی قوالی سننے کے بعد فرمایا تھا بھئی آپ کی زبان ہماری زبان سے بہت ملتی ہے۔

غرض قتیل شفائی کی یہ خودنوشت ان کے عہد کی فلمی اور ایک حد تک ادبی روایت کی اچھی تصویر کشی ہے اور دونوں حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

چاہِ یوسف سے صدا

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے نشیب وفراز کو بیان کرنے کے لئے ایک محاورہ استعمال کیا ہے ''تلک الایام نداولھا بین الناس''۔ لفظی ترجمہ یوں ہے کہ ہم انسانی زندگی کے حالات میں ادل بدل کرتے رہتے ہیں۔اس بات کا مشاہدہ تو ہر شخص کرتا رہتا ہے کہ حالات کبھی ایک جیسے نہیں رہتے۔نہ عشرت کو دوام نہ عسرت کو۔ابھی انہی دنوں جیل کی کوٹھری سے نکل کر وزارت عظمیٰ پر فائز ہونے والے مخدوم سید یوسف رضا گیلانی کی خودنوشت نگارشات پبلشرز لاہور کی جانب سے چھپ کر سامنے آئی ہے۔ یہ خودنوشت جیل میں لکھی گئی اور ان کی اسیری کی حالت ہی میں جو ۲۰۰۶ میں پہلی بار شائع ہوئی۔مگر اپریل ۲۰۰۸ میں اس کا پانچواں ایڈیشن چھپا ہے تو وہی اسیرِ زنداں یوسف ''عزیزِ مصر'' کے مرتبہ پر فائز ہو چکا ہے گردشِ روزگار کی ایسی کروٹ بھی انسانی آنکھوں نے کم ہی دیکھی ہوگی۔

اس خودنوشت کا عنوان حالی کے شعر سے لیا گیا ہے ''چاہِ یوسف سے صدا''۔شعر ہے ''آرہی ہے چاہِ یوسف سے صدا۔ دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت''۔خدا کرے انہیں سیاسی میدان میں دوست اور حلیف ہی ملیں حریف ''بھائیوں'' سے ان کا واسطہ نہ پڑے بسبیل اتفاق'' ''دو بھائی'' تو ان کے سیاسی اتحاد میں شامل ہیں اور وہ اسی سیاسی اتحاد کی بنا پر وزارت عظمیٰ پر بیٹھے ہیں۔

یوسف رضا گیلانی پنجاب کی خانقاہی وڈیرہ شاہی کے ایک بڑے گھرانے سے متعلق ہیں اس خانقاہی کا سلسلہ پنجاب اور سندھ تک ممتد ہے۔ملتان، بہاولپور اور سندھ کی پیر جو گوٹھ ایک ہی صہری رشتہ میں پروئے ہوئے ہیں۔ان کے دادا انگریزوں کی ملازمت کرتے رہے پھر ریٹائر ہونے کے بعد ۱۹۴۵ کے انتخابات میں مسلم لیگ کی جانب سے اسمبلی کے رکن بنے۔ان کے والد

مخدوم سید علمدار حسین گیلانی پنجاب اسمبلی کے رکن رہے اور دولتانہ وزارت کی برطرفی کے بعد نون کی وزارت میں وزیر مقرر ہوئے گویا سیاست ان کو ورثہ میں ملی۔ کچھ عرصہ مرکز میں بھی وزیر مملکت رہے مگر ان کے والد صوبائی سطح کی سیاست کو پسند کرتے تھے جب ننھے ''یوسف نے اپنے ابا سے یہ کہا کہ میں وفاقی وزیر بنوں گا تو ان کا جواب تھا مرکزی وزیر بننے کے لئے امریکہ سے تعلقات بہت ضروری ہیں'' (''چاہِ یوسف سے صدا''۔صفحہ ۴۰)۔اب سید یوسف رضا نہ صرف مرکزی وزیر ہیں بلکہ وزیر اعظم ہیں خدا جانے ان کے والد مرحوم کی فرمائی ہوئی بات کہاں ان کے آڑے آتی ہے۔

یہ خودنوشت سیدھی سادہ زبان میں لکھی گئی ہے۔جیل میں وقت گذارنا کارے دارد ہوتا ہے یوسف رضا گیلانی نے بھی بیکاری کا ایک علاج یادداشتیں لکھنے میں تلاش کیا۔خوش قسمتی سے سیاسی قیدی تھے اس لئے اے کلاس کی تمام سہولتیں انہیں میسر تھیں اس لئے اپنی سیاسی زندگی کے اتار چڑھاؤ کا قصہ بیان کرتے چلے گئے۔زندگی آسائش میں گذری اس لئے ان کے ہاں عسرت اور تنگدستی کا ذکر نہیں آیا۔ بڑی روحانی درگاہ سے وابستہ تھے اس لئے لوگ ان کے پاؤں چھوتے رہے اب ایسے مرتبہ پر آ گئے ہیں جہاں لوگ خاص طور سے حزب اختلاف کے لوگ ان کے پاؤں چھونا تو در کنار ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچنا بھی فرض عین سمجھیں گے ان کے لئے اپنی کرسی کی حفاظت سے زیادہ عزت سادات کی پاسداری زیادہ اہم ہوگی۔

ان کی سیاسی زندگی کا آغاز مسلم لیگ میں شمولیت اور ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ کی رکنیت سے ہوا (صفحہ ۶۶)۔ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ کو لوگ ''ابلیس کی مجلس شوریٰ کہا کرتے تھے'' (تمنا بے تاب از رشید امجد صفحہ ۳۳۵)۔مخدوم صاحب تو جنرل جیلانی کے کہنے پر ضیاء الحق کے ریفرینڈم کے حق میں تگ و دو بھی فرماتے رہے اور دورے کرتے رہے اور ووٹر لسٹ سے زیادہ ڈالے جانے والے ووٹوں کو نکلواتے رہے (صفحہ ۷۶)

جونیجو صاحب کی کابینہ میں وزیر رہے۔ مسلم لیگی دھڑوں خاص طور سے نواز شریف کی سیاسی سازشوں سے بددل ہو کر پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے۔ پیپلز پارٹی میں شمولیت کے بعد بے نظیر کے دور حکومت میں نیشنل اسمبلی کے سپیکر چنے گئے۔ اسمبلی میں ان کو خوش آمدید کہتے ہوئے

نواب اکبر بگٹی نے بلوچی میں تقریر کی تو انہیں تو کوئی اعتراض نہ ہوُا مگر جب اپنے چیمبر میں پہنچے تو ''فون کی گھنٹی بجی۔ اور فون پر گرجدار لہجے میں کہا گیا سپیکر صاحب آپ نے نواب اکبر بگٹی کو بلوچی زبان میں تقریر کرنے کی اجازت کیوں دی اس کا فوج نے بہت برا منایا ہے اس سے پیشتر کہ میں کوئی جواب دے پاتا فون بند ہو گیا'' (صفحہ ۱۵۹)۔ انہیں خفیہ قوتوں کا اندازہ تو ہو گیا ہو گا؟

ضیاء الحق کے مرنے کے بعد بے نظیر اور نواز شریف کے مابین جو سیاسی ''میوزیکل چیرز'' کا سلسلہ شروع ہوُا اس وقت دونوں نے اپنے ''سیاسی حریفوں کی بدعنوانیوں کی فائلیں تیار کیں اگر وہ ایسا نہ کرتے تو نیب کو ان رہنماؤں کے خلاف قدم اٹھانے کا جواز نہ ملتا'' (صفحہ ۲۳۵) گویا یہ رہنما اپنے ہی بچھائے ہوئے دام میں خود پھنس گئے اور یہ تو بہت پرانا محاورہ ہے کہ جو دوسروں کے لئے گڑھا کھودتا ہے خود اس میں گرتا ہے۔ امید ہے سید صاحب وزارت عظمیٰ پر بیٹھ کر ان تمام باتوں سے جو ان پر بیت چکی ہیں سبق سیکھیں گے اور وہی غلطیاں نہیں دہرائیں گے جو ان کے پیش رووں سے سرزد ہوئیں۔ ''طالب علمی کے زمانہ میں یہ لوگوں کے نیچے سے کرسیاں کھینچ لیا کرتے تھے'' (صفحہ ۴۳) امید ہے جناب وزیر اعظم اس حرکت سے بھی مجتنب رہنے کی کوشش فرمائیں گے ہاں وسیم سجاد ان سے کہا کرتے تھے کہ ''آپ بادشاہ گر ہیں'' (صفحہ ۱۶۰) اب بادشاہ گری تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو گا ہمارے اور اپنے دوست وسیم سجاد کو نہ بھولیں۔

بے نظیر کے دوسرے عہد حکومت میں ان کی سپیکر شپ کے دوران منتخب صدر جناب فاروق لغاری اسمبلی سے خطاب کرنے سے پہلے ''میرے چیمبر میں آئے تو ان کے سٹاف نے الگ سے ایک شیروانی اٹھائی ہوئی تھی۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ شیروانی کیوں ساتھ لائے ہیں انہوں نے کہا مجھے ہنگامے کے پیش نظر خطاب کے بعد شیروانی تبدیل کرنا پڑے گی اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حالات کس قدر کشیدہ تھے'' (صفحہ ۱۷۶) میں سوچ رہا ہوں اب گیلانی صاحب وزیر اعظم ہیں اور ان کی وزارت عظمیٰ کے دوران صدر صاحب پارلیمنٹ سے خطاب کرنے کو ضرور تشریف لائیں گے کیا ان کا سٹاف بھی ایک فالتو شیروانی ساتھ لائے گا؟ حالات تو اس وقت کی کشیدگی سے کہیں زیادہ کشیدہ ہیں کہیں صدر کے سٹاف کو ایک سے زیادہ شیروانیاں لانے کی ضرورت نہ پڑ جائے!

چوہدری الطاف حسین نے نواز شریف کے زمانہ میں ایک پولنگ سٹیشن پر جعلی ووٹ ڈالنے والے ایک پولیس افسر کو جعلی ووٹ ڈالتے ہوئے تھپڑ مار دیا۔ گیلانی صاحب اس وقت ان کے ساتھ تھے پولیس الطاف صاحب کو گرفتار کرنے پر مصر تھی مگر آپ نے انہیں پولیس کے حوالے نہ کیا خدا کی شان کہ نواز شریف کی برطرفی کے بعد'' چوہدری الطاف پنجاب کے گورنر بنا دئے گئے۔ جب یہ گورنر کے ہمراہ جہلم پہنچے تو وہی انتظامیہ ان کا استقبال کر رہی تھی''۔ (صفحہ ۱۵۰) خدا کی اس شان کا نظارہ گیلانی صاحب نے اپنے استقبال کے سلسلہ میں بھی دیکھا ہو گا۔

کارگل کے مسئلہ پر جناب گیلانی صاحب کی معلومات یک طرفہ اور نامکمل ہیں۔ لکھتے ہیں ''نواز شریف پر اپنی فوجیں واپس بلانے کے لئے سفارتی سطح پر عالمی دباؤ بڑھ گیا انہوں نے امریکہ کے صدر کلنٹن سے ہنگامی طور پر ملاقات کی اور انہیں آگاہ کیا کہ اگر کارگل سے فوج واپس بلائی گئی تو اس کا فوج کی طرف سے شدید رد عمل ہونے کا خدشہ ہے۔ صدر کلنٹن نے انہیں اس خدشے سے محفوظ رکھنے کی یقین دہانی کروائی لیکن فوجیں واپس بلانے پر مصر رہے۔ وائٹ ہاؤس امریکہ میں one to one ملاقات کے فوراً بعد مشترکہ اعلامیے میں صدر کلنٹن کی موجودگی میں نواز شریف کو فوجیں واپس بلانے کا اعلان کرنا پڑا۔'' (صفحہ ۲۱۰)۔ مجھے وثوق ہے کہ گیلانی صاحب نے اس وقت تک صدر کلنٹن کی خودنوشت My Life نہیں دیکھی ہو گی۔ کلنٹن صاحب نے صاف لکھا ہے کہ ''نواز شریف نے چار جولائی کو امریکہ آنے کی خواہش کی میں نے انہیں کہا کہ چار جولائی کو انہیں صرف اس صورت میں امریکہ آنے کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ پیشگی اس بات کی یقین دہانی کروائیں کہ وہ کارگل سے اپنی فوجیں حتمی طور پر واپس بلا لیں گے۔ نواز شریف نے ایسی یقین دہانی کروائی تب ہم نے انہیں چار جولائی کو آنے کی اجازت اور دعوت دی''۔ (میری زندگی۔ خودنوشت صدر بل کلنٹن۔ صفحہ ۵۳۱)۔ صدر پرویز مشرف نے بھی اپنی خود نوشت میں اس مسئلہ پر اپنی اور فوج کی رائے بیان کی ہے۔ اگر محض مجبوری کے طور پر فوجوں کو واپس بلانے کا مسئلہ تھا تو امریکہ کے اخباروں میں اپنی ہی فوج کے خلاف پورے پورے صفحہ کا اشتہار شائع کروانا کہاں کی عقلمندی تھی؟ (گولیوں کی زد میں۔ خودنوشت۔ پرویز مشرف صفحہ ۱۳۷)۔

اب نواز شریف ان کے سیاسی حلیف ہیں مگر گیلانی صاحب کو اپنا لکھا سامنے رکھنا چاہئے کہ ''نواز شریف کے اتحادیوں نے انہیں ایک ایک کر کے چھوڑ دیا۔ اختلاف رائے کو برداشت نہ کرنا۔ ایک ہی صوبے سے صدر اور وزیر اعظم کا ہونا، ایک ہی خاندان سے وزیر اعظم اور وزیر اعلیٰ پنجاب کا ہونا، کابینہ اور پارلیمانی پارٹی کا اجلاس بلانے میں تاخیر کرنا، پنجاب کا نعرہ لگانا بھٹو مخالف نعرہ لگانا، پیلو کیب سکیم کے معاملات، کوآپریٹو سکینڈل فوج کو مختلف سول اداروں میں تعینات کرنا اور فارن کرنسی اکاؤنٹس کو منجمد کرنا نواز شریف کی ناکامی کا سبب بنے۔'' (صفحہ ۲۱۲)۔ ان کو پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے ایسا نہ ہو امیر المؤمنین بننے کی کوشش میں پندھرویں ترمیم پاس کروانے (صفحہ ۲۱۱) کی آرزو رکھنے والے انہیں پھر لے ڈوبیں۔ قدم رکھنے کے سلسلہ میں پطرس بخاری کی بات سنہرے لفظوں میں لکھنے کی ہے کہ پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا مطلب یہ نہیں کہ'' آپ پھونکیں ہی مارتے رہیں اور قدم رکھنے کی نوبت ہی نہ آئے'' (یادوں کا سفر۔ خودنوشت اخلاق احمد دہلوی۔ صفحہ ۳۵۸)۔ ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں۔

یہ خودنوشت ایک نیک طینت نوجوان سیاست دان کی زندگی کی داستان ہے جس کا تعلق ایک مضبوط سیاسی خانوادہ سے ہے۔ اس نے اپنے باپ دادا سے ''لج پال'' اور غریب پرور ہونے کا ورثہ پایا ہے۔ اگرچہ اس خودنوشت سے ان کی گہری سیاسی بصیرت کا کوئی تاثر مرتب نہیں ہوتا مگر ملک کے سیاسی اتار چڑھاؤ سے انہوں نے جو سبق سیکھے ہیں وہ ان کی راہنمائی کو کافی ہیں توقع ہے کہ یہ نوجوان ملک کی ڈولتی ہوئی کشتی کو کنارے لگا لینے میں کامیاب ہو جائے گا اور ہم سب کی نیک تمنائیں اور دعائیں ان کے ساتھ ہیں اور ہمیں تو اس بات سے ہی بہت حوصلہ ہوا ہے کہ سید یوسف رضا گیلانی نے ذوالفقار علی بھٹو کے کارہائے نمایاں میں ان کے مذہبی امور میں دخل اندازی کرنے اور نام نہاد نوے سالہ مسئلہ حل کرنے کی مساعی کا ذکر نہیں کیا اور یہ بات ان کی سلیم الطبعی اور کشادہ ظرفی پر دال ہے۔

✓

عدالتِ عالیہ تک کا سفر

کالج کے زمانہ کے ہمارے دوست اور ہمارے کالج کے مجلّہ المنار کے سینئیر ایڈیٹر جسٹس (ریٹائرڈ) محمد اسلام بھٹی کی خودنوشت ''عدالتِ عالیہ تک کا سفر'' لاہور سے ۲۰۰۹ میں شائع ہوئی ہے۔ یہ خودنوشت ہمارے ہم عمر اور ہم سبق ساتھیوں دوستوں میں کسی کی پہلی سرگزشت ہے۔ جسٹس اسلام بھٹی بارش کا پہلا قطرہ ہیں اب دیکھئے ان کے بعد کون کون اس میدان میں اترتا ہے؟

جسٹس ریٹائرڈ محمد اسلام بھٹی کی ساری عمر عدالت کی کرسی پر بیٹھے گذری۔ تیسرے درجہ کے سول جج سے آغاز کیا اور ہائی کورٹ کے رتبۂ بلند تک پہنچے۔ یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا۔ وہ دوست جو قلم سے بھاگتا تھا آخر قلم ہی کے گھاٹ اترا۔ لکھنے میں تردد کا علاج احمد طاہر مرزا صاحب نے کیا کہ ان کی باتیں ریکارڈ کرتے اور پھر انہیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتے رہے اس لئے ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ان کی خودنوشت کا مواد بن گئے۔ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ بولی ہوئی یا لکھوائی ہوئی خودنوشتوں میں مرتب کرنے والے کا عمل دخل بہت بڑھا ہوا ہوتا ہے اور لوگ کتاب کو مصنف سے زیادہ مرتب کا کمال سمجھتے ہیں اس کی دو مثالیں تو ہمارے اپنے زمانہ کی ہیں صدر ایوب کی فرینڈز ناٹ ماسٹرز ہرچند کہ صدر ایوب سے منسوب ہے مگر لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ'' ہرچند کہیں کہ ہے نہیں ہے''۔ کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔ وہ معشوق الطاف گوہر تھے۔ اب ایک اور صدر پرویز مشرف کی خودنوشت چھپی ہے In the Line of Fire تو ان کے مددگاروں میں الطاف گوہر کے صاحبزادے کا نام ہے۔ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ مگر ہم علی وجہ البصیرت کہہ سکتے ہیں کہ اسلام بھٹی صاحب کی یہ خودنوشت کسی دوسرے کی مرتب کردہ تو ہے کسی

غیر کے قلم سے نکلی ہوئی نہیں اور اس کی گواہی اس خودنوشت کا اسلوب ہے جو جسٹس ریٹائرڈ محمد اسلام بھٹی کے سوا کسی اور کا نہیں۔ اور ہم اس اسلوب کے کالج کے زمانہ سے گواہ ہیں۔

جج صاحب موصوف ایک غریب کاشتکار گھرانہ میں ایک قریباً ان پڑھ باپ کے گھر پیدا ہوئے۔ بچپن درمیانہ طبقہ کی معیشت میں گذرا۔ ماں نہایت نیک دیندار اور دعا گو عورت تھی ان کی اور بزرگ اساتذہ کی دعائیں انہیں لے چلیں۔ سکول میں بھی اچھے طالب علم رہے کالج میں بھی اپنی تعلیمی صلاحیتوں سے دوسروں کو متاثر کیا۔ وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد جوڈیشل سروس میں چنے گئے اور اس طرح ان کا عدالتی کیریئر شروع ہؤا۔ پہلی بار ملازمت پر جانے لگے تو باپ نے جو کچھ کہا وہ آب زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ ''دیکھو بیٹا جتنی ملکیت تمہارے سب ماموؤں کی ہے اتنی میرے اکیلے کی ہے میں ساری عمر خود ہاتھ سے کام کرتا رہا ہوں اور ہمارے باپ دادا ہمیشہ زمیندارہ کر کے خود ہاتھ سے ہل چلایا کرتے تھے اور یہی میرا ابھی دستور رہا ہے اور زمیندارہ سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتا ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ بیٹا اگر تمہاری ملازمت میں حق حلال کی کمائی سے تمہارا گذارہ نہ ہو تو ''وڈی'' یعنی رشوت نہ لینا نوکری چھوڑ کر گھر آ جانا تمہارے گذارے کے لئے ہماری تھوڑی سی کھیتی باڑی ہی کافی ہوگی مگر میرے شریک رشتہ دار یہ نہ کہیں کہ تمہارا بیٹا بھی وڈی لیتا ہے'' (عدالت عالیہ تک کا سفر صفحہ ۶۹۔۷۰)۔

جسٹس ریٹائرڈ محمد اسلام بھٹی طبعاً بہت محتاط ہیں اس لئے خودنوشت کے چھپنے سے پہلے ہمارے گرد ہو گئے کہ اس پر ایک نظر ڈال لیں اور نظر ہم نے یوں ڈالی کہ اپنے مشترکہ کلاس فیلو دوست کرنل راجہ محمد اسلم کو ساتھ شامل کر کے اس کتاب کی پروف ریڈنگ کر لی۔ زبان میں یا اسلوب میں یا مندرجات میں ہم دونوں نے کوئی دخل نہیں دیا اگرچہ وہ باب جس میں ہمارے اپنے سکول کے کالجوں کے دوستوں کا ذکر ہے ہمیں بہت للچاتا رہا کہ کہیں دخل اندازی کریں مگر ہم نے دل پر جبر کر کے ایسی حرکت نہیں کی ورنہ اس وقت اس کتاب پر تبصرہ نہ لکھ رہے ہوتے۔ کتاب کے آغاز میں ہمارا جو ابتدائیہ شامل ہے وہ رسمی تعارفی ابتدائیہ ہے باقی جو کچھ ہے وہ ''مشک آنست کہ خود ببوید'' کے زمرہ میں آتا ہے۔ یہ خودنوشت اپنی سادہ زبان اور اس سے بھی زیادہ سادہ لب و

لہجہ اور دلچسپ واقعات و تجزیات کی وجہ سے قارئین کے دلوں کو متاثر کرے گی۔

ہمارے ہاں عدالتی نظام سے وابستہ مشہور شخصیتوں نے اپنی خودنوشتیں لکھی ہیں۔ اکثر نے انگریزی میں کہ انہیں انگریزی لکھنے میں سہولت نظر آئی۔ جسٹس جاوید اقبال نے اور جسٹس ریٹائرڈ محمد احمد خاں صمدانی نے اردو میں خودنوشتیں لکھیں۔ جسٹس جاوید اقبال صاحب تو حسب عادت اپنے ساتھیوں اور عدالتی ساتھیوں کے کیریکٹر سرٹیفکیٹ لکھتے رہے اور اپنے تعصبات کا کھل کر اظہار کیا۔ صمدانی صاحب با اصول جج تھے ریٹائر ہونے کے بعد بھی آپ نے اپنے اصولوں کو خیر باد نہیں کہہ دیا ایک جگہ اپنے تبصرہ میں ہم نے انہیں ٹوکا بھی تھا کہ انہیں پارلیمنٹ کے اس حق پر اظہار خیال کرنا چاہیئے تھا کہ آیا کوئی پارلیمنٹ مملکت میں رہنے والے افراد کے عقائد کی تعیین کر سکتی ہے یا نہیں؟ جسٹس نسیم حسن شاہ ہمارے ہم عصر جج ہیں یونیورسٹی کے زمانہ میں جسٹس نسیم حسن شاہ لاء کالج میں استاد تھے اور ہمارے یونیورسٹی یونین کے نگران بھی تھے اور طلبا کی سرگرمیوں میں بھر پور حصہ لیا کرتے تھے آپ کی خودنوشت انگریزی میں ہے مگر ہم اس پر اپنا تبصرہ لکھتے ہوئے اس رائے کا برملا اظہار کر چکے ہیں کہ شاہ صاحب عدالتی مصروفیات اور پرائیویٹ مصروفیات میں کوئی حد فاصل رکھنے کے قائل نہیں تھے نہ انہوں نے رکھی اور اس طرح جو انصاف آپ نے فرمایا وہ لوگوں کے نزدیک انصاف کے معیاروں سے کہیں کمتر اور لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنے والا تھا۔ اب اپنے دوست اور جج کا معاملہ آن پڑا ہے تو ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ جسٹس ریٹائرڈ محمد اسلام بھٹی کا سوشل کیلنڈر بھی جسٹس نسیم حسن شاہ صاحب کی طرح بھرا ہؤا ہوتا تھا اور وہ بھی عدالت کے بعد کی بھرپور مصروفیات میں یقین رکھتے تھے مگر ہم نے اپنے اس دیانت دار دوست کے عدالتی فیصلوں پر کسی کو انگلی رکھتے نہیں دیکھا۔

ہمیں ان کے ایک پٹھان دوست کی بات بہت خوش آئی جس نے انہیں دعوت پر بلایا تھا اور حالت یہ تھی کہ اس کے کئی مقدمے ان کی عدالت میں تھے جب جسٹس بھٹی نے ان کی دعوت قبول نہ کرنے کا عندیہ دیا تو اس نے کہا ''یہ بات تو پختون روایات کے خلاف ہے کہ ہم آپ کو کھانے پر بلائیں اور آپ انکار کر دیں عدالتی مصروفیات اور ہیں کھانے کی دعوت اور۔ آپ کو اگر

اس بات کا ڈر ہے تو آپ سارے مقدمات کا فیصلہ میرے خلاف کر دیں مجھے اس کی ذرا بھی پروا نہیں۔ کیونکہ میرے مقدمات آپ کی عدالت تک تھوڑے ہی رہیں گے وہ سپریم کورٹ تک چلیں گے'' (صفحہ۹۲)۔

ضیاءالقاسمی اور جسٹس صاحب کی ملاقات کا ذکر بھی دلچسپ ہے ''جس زمانہ میں میں سیشن جج گوجرانوالہ تھا ایک روز میں ایک قتل کے مقدمہ کی سماعت میں مصروف تھا کہ میرے اردلی نے بتایا کہ ایک مولانا صاحب آئے ہیں اور کہتے ہیں جج صاحب کے لئے کوئی ضروری پیغام ہے جو وہ ذاتی طور پر دینا چاہتے ہیں۔ جب میں فارغ ہوا اور ریٹائرنگ روم میں گیا تو دیکھا قاسمی صاحب بیٹھے ہیں۔ فرمانے لگے میں غلام غوث ہزاروی صاحب کا ایک پیغام لے کر آیا ہوں۔ میں نے کہا فرمایئے۔ کہنے لگے ہزاروی صاحب کہہ رہے تھے وہ ہمارا پٹھان جج ہے وہ ضرور ہماری مدد کرے گا۔ میں نے کہا کام بتایئے۔ فرمانے لگے بات یہ ہے کہ ہمارے ایک مولوی صاحب کسی مسجد کے امام ہیں وہ شغف صوفیا میں مصروف تھے کہ پکڑے گئے۔ ہزاروی صاحب کی درخواست ہے کہ آپ ان کے ساتھ نرمی کا سلوک کریں اور ان کی ضمانت کر دیں'' (صفحہ۲۱۰)۔ جج صاحب نے شغف صوفیا کے نیچے لکیر تو کھینچ دی ہے اس شغف کی تفصیلات خدا جانے کیوں بیان نہیں فرمائیں۔

لاہور کی شاہی مسجد کے امام مولانا آزاد کا ذکر انہی قاسمی صاحب کی زبانی سنئے'' کہنے لگے آج میں نے اللہ تعالیٰ سے ایک فریاد کی ہے۔ قاسمی صاحب نے پوچھا کیا فریاد کی ہے تو فرمایا میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ یا باری تعالیٰ مجھے دو مربعے آباد نہری زمین اور دو کروڑ روپیہ دے دے تو میں اس کتی دنیا کا پیچھا چھوڑ دوں۔ اس پر ضیاءالقاسمی صاحب نے کہا آپ کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ ''بل ڈاگ'' اس کتی دنیا کا پیچھا کبھی نہیں چھوڑے گا'' (صفحہ۲۱۱)۔

ایک ملاقات بھی یاد رکھنے کی ہے۔ جج صاحب بہاولپور سے ٹرین میں لاہور آ رہے تھے'' جب ٹرین ملتان چھاؤنی پر رکی تو ایک خوش وضع خوش لباس شخص بھی اس کمپارٹمنٹ میں آ کر بیٹھ گیا۔۔۔ کچھ توقف کے بعد انہوں نے میرا حال چال پوچھا اور کہا سنائیں کیسے ہیں آپ اور آج کل کہاں ہیں؟ اور کیا ہو رہا ہے؟ میں نے مختصر ان کے سوالوں کے جواب دیئے۔۔۔ لگتا تھا وہ

مجھے اچھی طرح جانتے ہیں اور مجھے اپنے آپ پر افسوس ہو رہا تھا کہ میں انہیں کیوں trace نہیں کر پا رہا۔ کافی دیر کے بعد کہنے لگے آپ نے مجھے صحیح طور پر پہچانا نہیں۔ میں نے کہا جی میں نے اپنے ذہن پر زور تو بہت دیا ہے اور مجھے یہ احساس ضرور ہے کہ کہ ہم ایک دوسرے سے ملتے رہے ہیں اور ہماری ملاقات بھی کافی رہی ہے۔ کہنے لگے جی ملاقات تو کافی رہی ہے اور کافی دیر تک رہی ہے ۲۸۹۱ میں میرا آپ کے پاس کسٹم کی عدالت میں مقدمہ تھا مقدمہ کی کارروائی خاصی دیر تک چلتی رہی اس مقدمہ میں آپ نے مجھے کافی لمبی سزا سنائی تھی جو کئی سالوں پر محیط تھی وہ کاٹ کر ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی جیل سے رہا ہوا ہوں'' (صفحہ۳۰۹)۔

جسٹس سجاد علی شاہ نے اپنی خودنوشت میں رفیق تارڑ صاحب کے کارہائے نمایاں پر تفصیلی روشنی ڈالی کہ کس طرح انہوں نے سپریم کورٹ کے ججوں میں افتراق پیدا کیا اور کوئٹہ بنچ کے لئے سوٹ کیس بھر بھر کر مشورے لے کر گئے اور اس خدمت کے عوض صدر پاکستان کے عہدے پر سرفراز ہوئے۔ جسٹس بھٹی نے ان کے عدالت عالیہ لاہور کے جج ہونے زمانے کا ذکر کیا ہے کہ ''ایک دعوت میں جج صاحبان بھی مدعو تھے وہاں تارڑ صاحب نے کہا کہ میں عمرہ پر جا رہا ہوں واپسی پر آپ کے والد صاحب کی عیادت کے لئے حاضر ہوں گا جب عمرہ کر کے واپس آئے تو تارڑ صاحب کی سوچ و فکر اور شکل و صورت سبھی بدل چکے تھے عمرہ کے بعد ان میں انقلابی تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ میرے والد صاحب کی عیادت کے لئے آنا تو درکنار ان کی وفات پر مجھ سے تعزیت کرنا بھی گوارا نہ کیا'' (صفحہ۲۱۷) اور اس کے بعد جج صاحب نے ان کے انہی کارناموں کو دہرایا ہے جو سجاد علی شاہ بیان کر چکے تھے۔ محسن بھوپالی کا برمحل شعر جج صاحب نے لکھا ہے کہ نیرنگیء سیاست دوراں تو دیکھئے۔ منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے۔ (صفحہ۲۱۹)

غرض جسٹس محمد اسلام بھٹی کی خودنوشت اپنے خلوص اور اپنے عقائد پر ثابت قدمی سے قائم رہنے کی وجہ سے سعید روحوں کو متاثر کرتی رہے گی اور بہتوں کو تحدیثِ نعمت خداوندی کا سبق دیتی رہے گی۔

سوانح عمری

مشفق خواجہ مرحوم کو خود نوشت سوانح عمریوں سے یک گونہ شغف تھا اور وہ ان کے حصول کی جستجو کرتے رہتے تھے۔ لکھنؤ اور اودھ کے تعلق میں لکھی جانے والی سوانح عمریوں میں محمد کاظم کی سوانح عمری کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ فارسی میں لکھی گئی مگر اب اردو میں منتقل ہو چکی ہے۔ فارسی سے اردو میں ترجمہ کس نے کیا ہے اس کا علم نہیں ہو سکا۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل نے ''تاریخ لکھنؤ کے سوانحی مآخذ'' والے مضمون میں لکھا ہے کہ مشفق خواجہ کے انتقال کے بعد ان کے کاغذات سے اس اردو ترجمہ کا مسودہ دستیاب ہؤا مگر اس پر ترجمہ کرنے والے کا نام نہیں۔ بہر حال ۱۸۸۸ میں لکھی گئی اس سوانح عمری کا جائزہ پیش کرتا ہوں کیونکہ یہ سوانح عمری لکھنؤ کی تاریخ کا ایک چشم دید اہم ماخذ ہے۔ یہ سوانح عمری پہلی بار ۱۸۹۱ میں لکھنؤ کے مکتبہ گنگا پرشاد وورما برادران سے فارسی میں شائع ہوئی۔

محمد کاظم اس سوانح عمری کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں ''اللہ تعالیٰ کی بے حد تعریف اور شکر یہ کہ ان مبارک ایام میں خالقِ زمان و زمین کی مدد سے یہ رسالہ موسوم بہ ''سوانح عمری'' مرتب ہؤا۔ جس میں مؤلف نے اپنے آبا و اجداد اور ان کے بعض حالات جناب مجتہد العصر (غفران مآب سید دلدار علی) کے خاندان کا تذکرہ اور اپنی زندگی کے حالات و واقعات بیان کئے ہیں نیز اپنے عہد کے ارباب کمال جیسے علمائے کامل، حکمائے حاذق اور قادر الکلام شعرا اور ان شاہان ملک اودھ کا مجملاً ذکر ہے جو غازی الدین حیدر سے لے کر واجد علی شاہ تک حکمرانی اور فرماں روائی کے مرتبہ تک پہنچے۔ اور وہ حالات تحریر کئے ہیں جو واجد علی شاہ کے زوال سلطنت کے بعد

زمانہ ءغدر میں واقع ہوئے جب باغی فوج نے اپنے انگریز افسروں کے خلاف قتل و غارت کا آغاز کیا۔ بعد ازاں انگریزی فوج نے باغی فوج سے نبرد آزما ہو کر غلبہ پایا روسائے ''بھٹوا'' اور گورا فوج میں لڑائی اور باغی سرداروں کا انجام یہ تمام حالات نہایت اجمال و اختصار کے ساتھ قلم بند کئے گئے ہیں'' (سوانح عمری صفحہ ۲) گویا یہ سوانح عمری نہ صرف ان کے خاندان کی تاریخ ہے بلکہ سلطنت اودھ کے عروج و زوال کے زمانہ کی مستند معلومات سے مملو ہے۔

ابتدا میں اپنے اسلاف میں ملا محمد عابد کے حالات اور سیرت کا بیان ہے۔ ان کی دیانت اور تقویٰ کا واقعہ بیان ہؤا ہے کہ آپ جہان آباد میں تھے کہ ''ایک عورت ایک پیتل کا لوٹا بیچنے کو لائی۔ آپ نے وہ لوٹا پیتل کے بھاؤ خرید لیا بعد کو پتہ چلا کہ وہ لوٹا پیتل کا نہیں سونے کا ہے۔ لوگ دوڑائے گئے کہ اس بڑھیا کو ڈھونڈیں وہ لائی گئی اور اسے لوٹا واپس کر دیا گیا کہ پیتل کی قیمت پر خرید اگیا تھا مگر سونے کا ہے اس لئے اپنا لوٹا واپس لے جاؤ اور جس کا ہے اسے دے دو'' (صفحہ ۷)۔ یہ دستور تو غربت کا شکار ہونے والے معززین کا تھا ہی کہ ضرورت کے وقت بزرگوں کی نشانیاں یا گھر کی چیزیں بیچ بیچ کر اپنی ضرورت پوری کر لیتے تھے مگر کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے تھے۔

سلطنت اودھ کے بارے میں جو تاریخی معلومات دستیاب ہیں وہ بہت کم ہیں۔ اس کی ایک وجہ لکھنؤ والوں کا اسلوب تحریر ہے جو اپنی نظیر آپ تھا مقفیٰ مسجع عبارت اور عریض و طویل لفظ آرائی اس کا طرہ ءامتیاز تھا ذرا سی بات کو بھی بنا سجا کر محمد حسین آزاد کے لفظوں میں ''لفظوں کے طوطے مینا بناتے تھے'' مگر یہی اس زمانے کا دستور تھا۔ اس کتاب میں بھی وہی لکھنوی عبارت آرائی موجود ہے۔ غازی الدین حیدر کی تخت نشینی سے قبل نوابان اودھ نواب کہلاتے تھے اب بادشاہ کہلانے کے سزاوار ہوئے جشن تخت نشینی پر عبارت آرائی دیکھئے ''مقررہ روز تمام امراء عظام، اراکین ذوی الاحتشام، اور صاحبانِ ذی شان نے جمع ہو کر در دولت و اقبال کو بساطِ عشرت وابتہاج بنایا اور اسبابِ طرب و شادمانی اور سامانِ بہجت و کامرانی مہیا کئے۔ نقارے کی آواز گنبدِ زمردیں سپہر میں گونج اٹھی اور آوازہ ءخوش دلی و نشاط اقصائے عالم میں پہنچ گیا۔ بادہ ءعشرت جام مبارکباد میں جوش زن ہؤا نغمہ ءبے غمی نے طنبور کے تارِ طرب نوا سے بلند ہو کر پردہ ءگوش تک

رسائی کا قصد کیا۔۔۔'' (صفحہ ۱۹) یہی اسلوب عبارت آرائی ساری کتاب میں جاری وساری ہے اور ہر تخت نشینی کا بیان ایسی ہی عبارت میں کیا گیا ہے۔ میں نے محض نمونہ کے طور پر یہ عبارت درج کی ہے ورنہ عام قاری تو شاید ان الفاظ کے معانی تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔

شاہان اودھ کی عیش وعشرت بادہ نوشی اور ہمہ گیر عیاشی سلطنت اودھ کے زوال کا سبب ہوئی۔ غازی الدین حیدر کے عہد سے لے کر واجد علی شاہ کے دور تک کے شاہان کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ انہیں سوائے اپنے عیش کے اور کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ ایک امجد علی خاں تھے جن کے عہد مبارک میں دینداری کا ذرا سا چرچا سننے میں آتا ہے۔'' آپ مبانیء دین وملت کے استحکام، اتباعِ احکامِ شریعت، اور کرم وسخاوت میں عدیلِ بےنظیر تھے، تقدس ورع اور راستبازی آپ کی طبیعت (میں) اس قدر مضمر تھی کہ مجتہد العصر کی اجازت کے بغیر قدم نہیں اٹھاتے تھے اور تمام کلی وجزوی امور میں احکام شریعت کی پیروی لازمی خیال کرتے تھے'' (صفحہ ۳۱) ان کا ایک واقعہ ڈاکٹر آغا سہیل کی خودنوشت '' خاک کے پردے'' میں درج ہے کہ '' کسی عالمِ دین نے امجد علی شاہ سے شکایت کی کہ آپ کے صاحبزادے پری خانے میں رقص کا شغل فرما رہے ہیں۔ باپ نے بیٹے کو طلب کیا کہ وہ جس حالت میں ہوں حاضر ہوں۔ وہ حاضر ہوئے۔ دیر تک باپ بیٹے میں مکالمہ ہوا اور پھر اجازت ملنے پر وہ واپس چلے گئے۔ عالمِ دین نے کہا آپ نے شہزادے کو تنبیہہ نہیں کی۔ امجد علی نے کہا قبلہ آپ نے دیکھا کہ اس کے دونوں پاؤں گھنگھروؤں سے لدے ہوئے تھے لیکن ایک گھنگھرو کی بھی آواز پیدا نہیں ہوئی۔ میں واجد علی کو سزا دوں یا اس کے فن کو قتل کروں؟'' ('' خاک کے پردے''۔ صفحہ ۵۳)۔ فن کے ساتھ ایسی دلبستگی رکھنے کے باوجود امجد علی خاں دینی معاملات میں سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ شراب کی بھٹیاں بند کر دی گئیں۔ بھنگ خانے برباد کر دئے گئے تاڑی کا استعمال روکنے کے لئے تاڑ کے درخت بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکے گئے۔ ہیجڑوں پر قہر نازل ہوا۔'' ایک ہیجڑا انار دانہ جو بڑا مشہور تھا اس نے آپ کو پیغام بھیجا میں چاہتی ہوں کہ اس گنہگار کے غریب خانہ پر تشریف لا کر دعوت قبول کریں۔ قوی امید ہے آپ انکار نہیں فرمائیں گے کیونکہ دعوت قبول نہ کرنا گناہ ہے۔ آپ نے فرمایا اگر تم توبہ اختیار کرو تو بہتر ہے نسوانی

وضع ترک کر کے داڑھی رکھ لو تو ضرور دعوت قبول کروں گا ورنہ نہیں'' (صفحہ ۳۴)۔ مؤلف اس بارہ میں خاموش ہیں کہ حضور پرنور کی تحریک اور حکم پر '' انار دانہ'' نے کیا وضع اختیار کی؟

امجد علی خاں نے پانچ سال سے کم عرصہ تک حکومت کی اور ۴۵ یا ۴۷ سال کی عمر میں رہگرائے قضا ہوئے۔ ان کے بعد ان کے فرزند دلبند واجد علی خاں تخت نشیں ہوئے۔ آغازِ سلطنت میں تمام تر بحث عدل گستری وانصاف کے قیام اور ظلم وتشدد کو دور کرنے پر مرکوز تھی۔۔۔ کچھ عرصہ بعد شاہ کی طبیعت عیاشی اور لہو ولعب سے نشاط اندازی کی طرف بے انداز مائل ہوئی۔۔۔ امور سلطنت کا انتظام نائبوں اور کارگزاروں کے حوالے کر دیا اور سر تا پا عیش وعشرت میں مصروف رہتے۔ تمام ازواج ومحلات سے شغف پیدا کر لیا آپ نے اس قدر ازواج اور محلات وبیگمات جمع کیں کہ حد شمار سے باہر ہیں۔ موسیقی، سرود وغنا اور رقص کا بے اندازہ شوق تھا۔۔۔ اس تمام عیش و عشرت اور سامان فرحت کے باوجود اس قدر پابند صلوٰۃ تھے کہ پانچوں وقت باقاعدگی سے نماز ادا کرتے اور نکاح یا متعہ کئے بغیر کسی عورت پر ہاتھ نہ ڈالتے'' (صفحہ ۳۶)۔ سلطنت میں بدنظمی پیدا ہوئی تو انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ شاہ کو ایک لاکھ روپے کا وظیفہ دے کر رخصت کر دیا۔ کلکتہ میں سلطان عالم نے مٹیا برج کے قیام پر زمین خرید کر ایسی عالیشان عمارتیں باغات اور عمدہ کوٹھیاں بنوائیں کہ قیصر باغ ان کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔۔۔ وہاں بھی بہت سی بنگالی عورتوں سے شادی کی اور داد عیش وعشرت میں مشغول رہے اور رنگ رلیوں میں زندگی بسر کی۔'' (صفحہ ۴۱)۔ ایسی رنگ رلیوں کے لئے ایک لاکھ ماہانہ ناکافی تھا۔ رائٹ آنریبل سید امیر علی نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ '' ۱۸۷۸ میں حکومت نے سابق شاہ اودھ (واجد علی شاہ) کے معاملات کی تحقیق کے لئے ایک کمیشن مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ بدنصیب حکمران اپنے ناقص مصاحبوں کے ہاتھوں جلد ہی بری طرح مقروض ہو گیا۔ اس وظیفہ کا بڑا حصہ جو برطانوی حکومت اسے دیتی تھی قرض خواہ چھین لیا کرتے تھے۔ اس کے بچے جن کے بارہ میں خیال کیا جاتا تھا کہ وہ بہت سے اتالیقوں سے تعلیم پا رہے ہونگے لیکن وہ تعلیم سے محروم ہی رہے'' (سید امیر علی کی آپ بیتی صفحہ ۶۲)۔ حکومت نے اس کمیشن کی سفارش پر جس کے ایک رکن جسٹس امیر علی بھی تھے واجد علی

شاہ کے وظیفہ سے پانچ ہزار روپے کی رقم بچوں کی تعلیم کے لئے مخصوص کر دی مگر بادشاہ اودھ اس بات پر بہت ناراض ہوئے۔ ہمارے ہاں جنرل شاہد حامد نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھا تھا کہ ''میرے دل میں ہمیشہ سے ایسی کتاب لکھنے کی خواہش موجود رہی جس میں واجد علی شاہ پر عائد کردہ الزامات کا جواب دیا جائے۔ سلطان عالم کے باب میں انگریز ان تمام حوالوں اور آراء کو عوام سے چھپانے میں کامیاب ہو گئے تھے جو اصل حقائق کو ظاہر کرتی تھیں۔ آج بھی ایسی دستاویزات عوام کے لئے دستیاب نہیں کیونکہ انہیں حساس تصور کیا جاتا ہے''۔ (ایک جنرل کی آپ بیتی ضمیمہ اول) جنرل صاحب نے ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کیا تھا کہ ''سلطان عالم کے عہد میں لکھنؤ ہندوستان کا ثقافتی مرکز بن گیا تھا اور اس نے دہلی کی رونقوں کو بھی ماند کر دیا تھا۔ جو کچھ لکھنؤ میں ہوتا تھا اس کی تمام ملک میں نقل کی جاتی تھی۔ سامراجی حکمرانوں کے نزدیک یہ ثقافتی سرگرمیاں انحطاط اور بدکاری کی علامتیں تھیں اگر اس طرح ہوتا تو اودھ کی مسلم فوجیں جدوجہد آزادی کی مشعل بردار ہراول دستہ کس طرح ثابت ہوتیں۔ مجھے اس تہذیب کا ساختہ پرداختہ ہونے پر فخر ہے جس نے ایک مہذب معاشرہ کی بنیاد رکھی'' (ایک جنرل کی آپ بیتی صفحہ ۲۰۷) مگر واجد علی خاں کے ہمعصر محمد کاظم کی آپ بیتی تو ان تمام الزامات کی تصدیق کر رہی ہے جن کی تردید کا خیال جنرل صاحب کے لئے سوہان روح بنا ہوا تھا۔

چھپن صفحات کی اس کتاب کے آخر میں مصنف پھر اپنے حالات کی طرف لوٹتا ہے اور مجمل طور پر اپنے حالات بیان کر کے کتاب کو ختم کرتا ہے۔ ''مخفی نہ رہے کہ جو کچھ اس رسالہ میں درج ہے کچھ تو میں نے خود دیکھا ہے اور کچھ دوسرے معتبر لوگوں کی زبانی سنا ہے اور کچھ ایک تاریخ میں دیکھا۔ واللہ اعلم بالصواب'' (صفحہ ۵۶)

کتاب کا مجموعی تاثر صداقت اور سچائی کا بنتا ہے اور تاریخ روایت کرنے کو یہی ایک صفت کافی ہے۔ محمد کاظم کی سوانح عمری ادب اور تاریخ میں معتبر نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔

✓

داستاں میری

ڈاکٹر تصدق حسین راجا کی خودنوشت ''داستاں میری'' فروری ۱۹۹۵ میں اسلام آباد کے مکتبہ دانیال سے شائع ہوئی۔ اولاً اس خودنوشت کا عنوان ''جادہ ءحیات'' رکھا گیا تھا مگر بعد کو نامعلوم وجوہات کی بنا پر اس کو داستاں میری کا عنوان دیا گیا (صفحہ ۱۴۳)۔ یہ کوہستان نمک کے ایک عام مگر صاحب عزم آدمی کی داستان ہے جس نے اپنی محنت سے پرائیویٹ طور تعلیم حاصل کی اور پھر محکمہ تعلیم سے وابستہ ہو کر علم کا نور پھیلاتے رہے۔ ایم اے کرنے کے بعد مختلف کالجوں میں پڑھاتے رہے مشرقِ وسطیٰ میں بسلسلہء ملازمت قیام کے دوران امریکہ کی ایک کاغذی یونیورسٹی سے نسیم حجازی پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔ اواخر ملازمت میں مقتدرہ قومی زبان سے وابستہ رہے۔ کتاب سے مصنف کے کسی اعلیٰ علمی وادبی ذوق کا کوئی تاثر نہیں ابھرتا۔ البتہ کتاب کے عقبی ورق پر لکھی ہوئی نسیم حجازی کی یہ بات باون تولے پاؤ رتی کی ہے کہ ''مصنف طبعاً فیاض اور حیا چشم نظر آتا ہے''۔ مقتدرہ کے زمانے میں انہیں ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب اور ڈاکٹر وحید قریشی صاحب سے بہت قریب رہنے کا موقع ملا چاہتے تو ان دو ادبی شخصیات پر اپنے ذاتی علم کی بنا پر اچھے جاندار خاکے لکھ سکتے تھے مگر ان کی ساری توجہ مقتدرہ اور مقتدرہ کی اندرونی آویزشوں پر مرتکز رہی۔ صحبتِ روشن دلاں والے باب میں شہاب صاحب کا ذکر خیر بھی موجود ہے ''جہاں تک میرا ذاتی معاملہ ہے مجھے قدرت اللہ شہاب کی آپ بیتی میں شامل کہانیوں کی سچائی پر کبھی شبہ نہیں ہوا جس شہاب سے میں ملا تھا اس کی سرگزشت ایسی ہی ہونی چاہئے تھی'' (صفحہ ۲۳۲)۔ کیا جانئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا!

✓

سرگزشت

کرنل سید حسنین احمد کی آپ بیتی ''سرگزشت'' کے نام سے چھپی ہے مجھے اس کتاب کا جونسخہ میرے کرمفرما عبدالوہاب خاں سلیم نے بھجوایا ہے اس پر نہ سن اشاعت درج ہے نہ مقام اشاعت ۔صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ مولانا آزاد لائبریری کی جانب سے سلیم صاحب کو بھیجا گیا تھا۔

حسنین صاحب سادات امروہہ سے تعلق رکھتے ہیں اوراحوال کے بیان میں بار بار امروہہ کی طرف لوٹتے ہیں ۔اپنے جدامجد سید محمد صاحب کی پرہیز گاری اور نیکی کی کیا عمدہ مثال دی ہے کہ ''سید محمد انتہائی پرہیز گاراور مذہبی انسان تھے انہوں نے صرف چارشادیوں پراکتفا کی'' (صفحہ۱۲) یہ بیان نہیں ہؤا کہ ان بزرگ کے بعدان کے خاندان میں پرہیز گاری کی کیا کیفیت رہی ؟۔حسنین صاحب پاکستان کی فوج کے انجینر نگ کے محکمہ سے وابستہ رہے ۔پانچ سال کی محنت کے بعد (صفحہ۱۲۹) ۱۲۹صفحات کی سرگزشت رقم کر پائے ۔زبان وبیان کی بے شمار غلطیاں کتاب میں راہ پاگئی ہیں ہوسکتا ہے ان کی وجہ پروف ریڈنگ میں کوتاہی ہومگر اس مختصر سی کتاب کو اتنی لاپرواہی سے چھپوانا کون سی اچھی بات ہے ۔امروہے کا رہنے والا اگر فی البدیہہ کو''فی البدی'' (صفحہ۲۷)اور معرکوں کو''مارکوں'' (صفحہ ۲۸) لکھے تو کون اس سے صرف نظر کرے گا؟ اور خدا کی مشیت کو''خدا کی مشیعت'' (صفحہ۶۴) کہہ کر مطمئن ہوجائے گا۔

کرنل صاحب اگر ذراسی محنت کرتے تو ان کی پانچ سال کی محنت اکارت نہ جاتی۔

✓

نربدہ سے مہران تک

''نربدہ سے مہران تک'' سندھ کے مشہور سیاسی کارکن کامریڈ فتح اللہ عثمانی کی خودنوشت سوانح حیات ہے جس کا ذیلی عنوان ہے ''ایک راہروانِ سیاست کے لیل ونہار''۔یہ خودنوشت فکشن ہاؤس لاہور والوں کی جانب سے ۲۰۰۵ میں شائع ہوئی انہیں بھی کتاب کے سرورق پر موجودلودیتی ہوئی فاش غلطی کا احساس نہیں ہؤا؟

فتح اللہ عثمانی دکن سے ہجرت کر کے سندھ میں آباد ہوئے اور پھر سندھ ہی کو اپنا وطن مالوف بنالیا۔نظریاتی اعتبار سے بائیں بازو سے متعلق رہے اور کبھی اس راہ سے منحرف نہ ہوئے۔فوجی حکومتوں کے دور میں قید وبند کی صعوبتیں اٹھائیں مگران کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔

اس کتاب کوشروع کرتے ہوئے میرا خیال تھا کہ حیدرآباد کے رہنے والے ہیں اس لئے ان کی زبان اگر دلی والوں کی طرح شستہ ورفتہ نہیں ہوگی تو کم ازکم رواں دواں توضرور ہوگی مگر جوں جوں ان کی داستان آگے بڑھتی گئی سیاست کی تلخیاں زیادہ اورزبان وبیان کی نفاستیں کم ہوتی گئیں۔ ابتداہی میں ایک جگہ ''رسالہ ایمان بیچنے والے ایمان فروش'' (صفحہ۱۱۲) کا جملہ دیکھاتو امید بندھی کہ شایدان کے ہاں شگفتگی کا عنصر غالب ملے گا مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدے۔ بہر طور ایک سیاسی کارکن کی سیاسی داستان کوزیادہ ترسیاسی ہی ہونا چاہئے تھا اور سیاست کی اس میں کوئی کمی نہیں۔

خودنوشت لکھنے کا خیال بھی ان کو اپنی دل کی بیماری کی وجہ سے پیدا ہؤا۔ ''آخری دن قریب ہیں خیال پیدا ہؤا خودنوشت لکھ دوں'' (صفحہ۱۷۸)۔ان کی خودنوشت سندھ کی بائیں بازو کی سیاست کی اچھی اور مؤثر تصویر کشی ہے اور مخلص سیاسی کارکنوں کی بےلوث کہانی ہے۔

✓

موسیقارِ اعظم نوشاد

برصغیر کی فلمی دنیا کے نامور موسیقار جناب نوشاد علی لکھنوی کی آپ بیتی ''موسیقارِ اعظم نوشاد'' کے عنوان سے ۲۰۰۶ میں دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ نوشاد صاحب یہ حالات ظہیر ناصر صاحب سے بیان کرتے رہے انہوں نے ہی مرتب کر کے یہ خودنوشت شمع رسالہ میں قسط وار چھپوائی۔ اب فاروق ارگلی صاحب نے اسے کتابی صورت میں چھاپا ہے۔ اس خودنوشت کے تتمہ کے طور پر نوشاد صاحب کا مکمل مجموعہء کلام ''آٹھواں سر'' بھی اس کتاب میں شامل ہے حیرت کی بات یہ ہے کہ پونے پانچ سوصفحات کی اس کتاب کی قیمت صرف ۱۵۰ روپے ہے۔ یہ کسی دور کے زمانہ کی بات لگتی ہے۔

اس بات بیتی میں نوشاد صاحب نے فلمی دنیا اور موسیقی سے وابستہ بے شمار افراد کی باتیں کی ہیں اتنی کہ صرف ان افراد کی فہرست اسماء الرجال مرتب کرنا بھی مشکل ہے۔ واقعات بھی احوال الرجال کے ساتھ بیان ہوئے ہیں لیکن یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ بیان کرنے والے کے ذہن میں کوئی خاص ترتیب ہے جس کے تحت وہ احوال بیان کر رہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں نوشاد صاحب کو یاد ہیں اور بڑی بڑی باتیں بھی۔ ان سب باتوں کا مرکز نوشاد صاحب کی ذات ہے یعنی کوئی ایسا قصہ یا کہانی درمیان میں در نہیں آئی جس کا نوشاد صاحب سے براہ راست تعلق نہیں اس وجہ سے کتاب کی وحدت مجروح نہیں ہوئی۔ دنیا میں جہاں لوگ اکٹھے ہوں وہاں ان میں آویزشیں بھی ہوتی ہیں نوشاد صاحب نے حتی الوسع آویزشوں کے تذکرہ سے گریز کیا ہے ہاں اصولوں پر اختلاف بھی کیا ہے اور لوگوں سے ناراض بھی ہوئے ہیں مگر کسی کی کردار کشی نہیں کی اور

یہ بڑی ہی مستحسن بات ہے۔

ہمیں تو اس ضخیم کتاب میں دلچسپی کی بات یہ ملی کہ ''میری ماہر القادری صاحب سے بمبئی کے ایک مشاعرہ میں ملاقات ہوئی تھی میں نے ان کی ملاقات کاردار سے کروائی اور ماہر صاحب سے درخواست کی کہ اس فلم کے لئے گیت لکھیں۔ انہوں نے معذرت کی کہ فلمی شاعری سے وہ واقف نہیں ہیں مگر میرے اصرار پر انہوں نے ایک کورس گیت ''لو چمک چمک کر آئی چراغوں والی۔ میرے سونے گھر واڑو لے سکھی دیوالی'' لکھا حیرت کی بات یہ ہے کہ ماہر صاحب نے اپنی زندگی کا یہ پہلا فلمی گیت دھن پر لکھا اور خوب لکھا'' (صفحہ ۵۸)۔

قتیل شفائی صاحب نے ایک بار سنایا کہ کسی فلم میں کام کرتے ہوئے قتیل صاحب اور ظہیر کاشمیری سٹوڈیو میں موجود تھے۔ اور ظہیر صاحب اپنی پوری فارم میں تھے وہی گھنگھریالے لہریہ دار بال۔ خوب ترشی ترشائی سرخ داڑھی۔ سرخ کوٹ اور سرخ نکٹائی۔ اتفاق سے ڈائریکٹر صاحب بہت دیر سے آئے اور آتے ہی معذرت کی کہ تاخیر ہوگئی ہے اب ہم جلد ہی کام شروع کرتے ہیں۔ قتیل صاحب کہنے لگے میری تو خیر ہے مگر یہ ظہیر صاحب بڑی دیر سے میک اپ لگائے بیٹھے ہیں انہیں جلدی فارغ کر دیں۔ قتیل صاحب نے یہ بات اپنی خودنوشت میں بیان نہیں کی مگر نوشاد صاحب کی داستان میں بیان ہوا ہے کہ ''فلم شاہجہان کی شوٹنگ شروع ہو چکی تھی چونکہ تاریخی فلم تھی لہذا بہت بڑی تعداد میں ایکسٹرا اداکار اور اداکارائیں شوٹنگ میں حصہ لیتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ شوٹنگ کے بعد یہ اداکار گٹ اپ اور فلمی ملبوسات کے ساتھ سٹوڈیو سے رخصت ہو جاتے۔ اور اگلے دن شوٹنگ کے وقت دوبارہ گٹ اپ اور ڈریس تیار کرانے پڑتے۔ سٹوڈیو کے گیٹ پر ایک چوکی دار کی ڈیوٹی لگادی گئی کہ وہ ہر شخص سے گٹ اپ اور ملبوسات اتروائے۔ حکیم حیدر بیگ کاردار میاں کے قریبی دوست اور محبوب صاحب کے سمدھی تھے۔ وہ کاردار میاں سے ملنے سٹوڈیو آئے۔ ملاقات کے بعد جب وہ گیٹ پر پہنچے تو زبردست ہنگامہ ہو گیا۔ حکیم صاحب زور زور سے چلا رہے تھے۔ ہم نے شور کی آواز سنی تو گیٹ پر پہنچے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ چوکی دار حکیم صاحب سے اصرار کر رہا ہے کہ داڑھی اتار کر جایئے اور حکیم صاحب غصے

میں آگ بگولا ہو کر چوکیدار سے کہہ رہے ہیں۔ ''بدتمیز خبیث تیری یہ مجال کے میرے چہرے کی داڑھی اتروائے بے وقوف یہ اصلی داڑھی ہے۔'' (صفحہ ۷۰) نوشاد صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ جب مولانا ماہر القادری صاحب سٹوڈیو سے واپس جا رہے تھے تو ان کے ساتھ کیا واردات پیش آئی تھی؟

ایک ذرا سا ذکرِ خیر ہمارے بھٹو صاحب کے ذوق اور کن رسی کا۔ ''گیت کی فلم بندی سے پہلے لچھو مہاراج نے مدھو بالا کو بہت پریکٹس کرائی۔ پورا گیت مدھو بالا پر فلمایا گیا۔۔۔جس دن گیت کی پکچرائیزیشن شروع ہوئی پاکستان کے سابق صدر ذوالفقار علی بھٹو مرحوم (جو ان دنوں بمبئی میں رہتے تھے) سیٹ پر آ گئے۔ بھٹو صاحب اور آصف صاحب کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ تقریباً ایک ہفتہ تک یہ گیت اور رقص فلمایا گیا اور بھٹو صاحب روزانہ پابندی کے ساتھ سیٹ پر آتے رہے۔۔۔اس زمانہ میں اس نوجوان کو دیکھ کر کون پیش گوئی کر سکتا تھا کہ ایک دن یہ پڑوسی ملک پاکستان کا حکمراں بنے گا'' (صفحہ ۱۰۵)۔

لتا منگیشکر کے پہلے گیت کا حال۔ ''زہرہ بائی انبالے والی ان دنوں میری موسیقی گاتی تھیں۔ ایک روز میں ان کے گھر بیٹھا ہوا تھا کہ غلام حیدر صاحب ایک ریکارڈ لے کر آئے یہ ایچ ایم وی کا نمونے کا ریکارڈ تھا۔ غلام حیدر صاحب کے کہنے پر زہرہ بائی نے یہ ریکارڈ اپنے گراموفون پر لگایا تو غلام حیدر مرحوم بولے ''اس میں میں نے ایک بچی کو گوایا ہے سنو اور بتاؤ کیسی آواز ہے''۔ گانا سنا گیا زہرہ بائی نے کہا ''کسی کم عمر بچی کو گوایا ہے آپ نے ماسٹر جی'' غلام حیدر مرحوم نے یہ تبصرہ سنا تو ہنسے اور کہنے لگے ''جی ہاں چھوٹی بچی ہے اور مہاراشٹر کی رہنے والی ہے۔'' یہ تھی لتا منگیشکر۔ ''یہ لتا کا پہلا گیت تھا جس کے بول تھے۔ انگریزی چھورا چلا گیا۔ وہ گورا گورا چلا گیا'' (صفحہ ۲۶۴)۔

غرض نوشاد صاحب کی یہ خود نوشت فلمی دنیا اور فلمی گیتوں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بڑی دلچسپ ہوگی۔

✓

حکایت ہستی

ڈاکٹر صغرا مہدی کی صاف ستھری رواں دواں آپ بیتی ''حکایت ہستی'' ۲۰۰۶ میں دہلی سے شائع ہوئی۔ یہ حکایت یوپی کے دور دراز علاقہ کے ایک کوردِہ سے دہلی آنے والی لڑکی کی داستان ہے جس کا تعارف سیدین صاحب نے پنڈت نہرو سے یہ کہہ کر کروایا تھا کہ ''پنڈت جی یوپی کے بہت چھوٹے سے گاؤں کی گریجوایٹ لڑکی سے ملئے'' (حکایت ہستی صفحہ ۱۰۱)۔ یہ لڑکی ڈاکٹر عابد حسین کی بھانجی تھی جسے اس کے ماموں اور ممانی صالحہ عابد حسین دونوں نے اپنا بچہ بنا کر اپنے پاس رکھا اور تعلیم دلائی۔

اس حکایت کا پہلا حصہ گاؤں کی رہنے والی لڑکی ''امامت بی بی عرف جھبو داعی پوری'' (صفحہ ۳۴) کے احوال پر مشتمل ہے جو اپنی خیالی دنیا میں مگن رہتی تھی مگر ارد گرد کے ماحول سے بے خبر نہ تھی اس حکایت میں یوپی کے دیہی شیعہ کلچر کی نہایت عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس دیہی ماحول میں بھی ہندوؤں مسلمانوں میں معاشرتی میل جول تو تھا مگر ایک دوسرے کے برتنوں میں کھانا نہیں کھایا جاتا تھا ہندو مہمان آ جاتے تو ان کے لئے علیحدہ برتن نکالے جاتے اور ان کا کھانا ہندو باورچی پکاتے اور پروستے۔ ہندو مہمان کھانا کھاتے تو گھر کے لوگ بیٹھے دیکھتے رہتے ان کے ساتھ شریک نہ ہوتے اسی طرح مسلمان مہمان ہوتے تو ان کے لئے علیحدہ کھانے پینے کا انتظام کیا جاتا اور ہندو میزبان بیٹھ منہ تکا کرتے۔ اور ایسا ''کرنا عجیب تو لگتا مگر برا نہ لگتا'' (صفحہ ۱۵)۔

یہ تو ہندو مسلم تفریق تھی علی گڑھ کے ہاسٹل میں مچھلی پکائی جاتی تو ''سنی دینیات شیعہ دینیات اور سنی مچھلی شیعہ مچھلی'' کا فرق روا رکھا جاتا۔ ''ایک دن میں کھانے پر گئی تو دیکھا مچھلی ہے

میں خوش ہو کر شروع ہی کرنے والی تھی کہ سعیدہ نے میرے آگے سے پلیٹ گھسیٹ لی بولیں دیوانی بیگم جاؤ اپنے لئے شیعہ مچھلی لاؤ۔'' (صفحہ ۷۸) ہم نے تقسیم ملک سے قبل ریلوے سٹیشنوں پر ہندو پانی مسلمان پانی کی سبیلیں تو دیکھیں تھیں یہ سنی مچھلی شیعہ مچھلی کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارے تجربہ میں تو صرف ایک بات آئی اور اس پر ہم اب تک حیران تھے کہ ایسا کیوں ہے؟ ایک بار ایک متدین، باریش اور ملاصفت صاحب ہمارے سرگودھا ڈویژن کے ڈائریکٹر ایجوکیشن بن کر آ گئے۔ ملاقات ہوئی تو فرمانے لگے یہاں بس ایک ہی تکلیف ہے کہ میرا خانساماں شیعہ ہے خدا جانے وہ میرے کھانے پر کتنی بار تھوکتا ہوگا۔ ہم نے کہا خانساماں کو کھانے پر تھوکنے کی کیا ضرورت ہے فرمانے لگے تمہیں علم نہیں کہ شیعہ باورچی سنیوں کو کھانا پکاتے ہیں تو اس پر تھوکتے ضرور ہیں۔ ہم نے ڈائریکٹر صاحب کی بات سنی اور دل میں لاحول پڑھ کر خاموش ہو گئے کہ یہ ان کے اندر کا بغض ہے ورنہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے کھانے پر کیوں تھوکے گا؟ ہم نے کہا تو خانساماں بدل لیجئے کہنے لگے کیسے بدل لوں؟ یہ سرکاری ملازم ہے میری گاڑی بھی چلاتا ہے کھانا بھی پکاتا ہے۔ اب اس واقعہ کے کوئی تیس برس بعد ڈاکٹر صغرا مہدی کی بات پڑھ کر کرب کا احساس بڑھ گیا ہے کہ امت مسلمہ کن جھمیلوں میں الجھی ہوئی ہے۔ کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

اس خودنوشت کا لہجہ سیدھا سادہ اور زبان صاف ستھری ہے۔ ڈیڑھ سو صفحے سے بھی کم کی یہ خودنوشت جامعہ ملیہ علی گڑھ اور یوپی کے دیہی معاشرہ کی نہایت عمدہ تصویر ہے۔ صغرا مہدی کی تعلیم دیر سے شروع ہوئی اور ان کا تعلیمی ریکارڈ بھی کوئی ایسا شاندار نہیں رہا مگر وہ جامعہ ملیہ میں استاد کی حیثیت سے فائز رہیں اور وہیں سے وظیفہ یاب ہوئیں۔ اپنے ماموں ڈاکٹر عابد حسین اور ممانی صالحہ عابد حسین ان کے آئیڈیل رہے اور یہ بھی ان کی خدمت گذاری میں پیش پیش رہیں۔ آپ نے ماموں ڈاکٹر عابد حسین سے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ شادی نہیں کریں گی تو ماموں نے اس بات کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا مگر بڑی حکمت سے انہیں سمجھا بھی دیا کہ نہ کیجئے مگر یہ دروازہ بند نہ کیجئے۔ ان کی اماں کو تو بہر حال ان کی شادی کی فکر تھی اور انہوں نے کسی عزیز

سے ایسا کہہ بھی رکھا تھا کہ صغرا کی شادی کے لئے کوشش کریں مگر جو رشتہ وہ لائے اس کو صغرا نے اور صغرا کے ماموں نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ صاحب یتیم خانے کے مہتمم ہیں مگر مجسم یتیم خانہ ہی لگتے ہیں۔

علی گڑھ کے لڑکے جامعہ ملیہ کی لڑکیوں کو ان کے لمبے سفید دوپٹوں کی وجہ سے ''جامعہ کے مردے'' (صفحہ ۹۲) کہا کرتے تھے اور یہ ان کی باتوں سے لطف اندوز ہوتی تھیں۔ اسی طرح جب علیگڑھ کی پرانی لڑکیاں انہیں کہیں نظر آ جاتیں تو انہیں دیکھ کر آواز لگاتے کہ یہ تو ''وہی پرانے چاول ہیں'' (صفحہ ۹۶) اور اس پر بھی انہیں ہنسی ہی آتی تھی۔ غرض یہ خودنوشت ایسے فرد کی ہے جسے کوئی احساس کمتری یا برتری نہیں۔ انہیں اپنے بڑوں کی خدمت کا شوق بھی ہے۔ اور وہ اس خدمت سے خوش ہوتی ہیں۔ گاؤں میں پہنچ جائیں تو اسی ماحول کا حصہ بن جاتی ہیں ہم نے تو ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو ایک بار کے شہر کے ہو رہیں تو شہر ہی کے ہو رہتے ہیں گاؤں کی زندگی سے انہیں نفور ہو جاتا ہے۔

سیاسی لحاظ سے ان کی ہمدردیاں مسلم لیگ سے رہیں مگر ان کے چچا بانیء پاکستان سے خواہ نخواہ ناراض تھے۔ ان کی بہن کے خسر برات لے کر آئے ہوئے تھے ''ان لوگوں کے آنے سے دوسرے دن نکاح کی تاریخ مقرر ہوئی مگر اسی دن محمد علی جناح کے انتقال کی خبر آئی۔ ماموں جان نے دولہا کے ابا سے پوچھا کہ کیا نکاح ایک دن کے لئے ملتوی کر دیں تو وہ بولے ''نہیں جی نکاح کیجئے ہم جائیں گے ہمیں ان کا سوگ منانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خود تو چلے گئے ہمیں بے گھر در کا گئے'' (صفحہ ۲۵) عجیب بات ہے یوپی کے ایک اور خودنوشت سوانح نگار نے بھی محمد علی جناح کے باب میں یہ بات کی ہے۔ سر یامین خاں کے نامہء اعمال میں چوہدری خلیق الزمان کے بارہ میں لکھا ہے کہ خلیق الزماں کہنے لگے ''ایک خودسر شخص ہم سب کو تباہ کر کے پاکستان ادھورا لے کر وہاں کا گورنر جنرل بن بیٹھا اور یہاں کشت وخون کروا گیا'' (نامہء اعمال صفحہ ۱۳۷)۔ اور عجیب تر بات یہ ہے کہ یہ خلیق الزماں پاکستان آ گئے اور پاکستان کی برکات سے تمتع کرتے رہے۔ ایسے ناشکرے لوگوں کے بارہ میں کیا کہا جاسکتا ہے۔

دہلی میں جس سکول میں ملازم تھیں وہاں ڈرامہ ہوا۔ جس میں بچیوں نے قوالی اور ڈانس
میں حصہ لیا ''بیرسٹر نورالدین مہمان خصوصی تھے انہوں نے کھڑے ہو کر بلند آواز میں نہایت
لعنت ملامت کی مسلمان لڑکیاں سٹیج پر ناچ گا رہی ہیں مسلمانوں کی غیرت کو کیا ہو گیا ہے؟۔۔۔
اگلے روز مسلمانوں نے اسکول پر دھاوا بول دیا۔۔۔(حالانکہ) ڈانس میں مسلمان لڑکیاں تھیں
بھی نہیں'' (صفحہ ۱۱۴) یہی بیرسٹر نورالدین احمد دہلی کے میئر بنے اور دہلی کی اسمبلی کے سپیکر
رہے۔ ان کی بیٹی امینہ نے ایک ہندو ڈپلومیٹ آہوجہ صاحب سے شادی کی خود نورالدین صاحب
نے ایک ریڈیو اناؤنسر سعیدہ بانو سے اپنی بیوی کی موجودگی کے باوصف تعلقات رکھے اور پھر ان
سے شادی کر لی اس وقت انہیں اپنے مسلمان ہونے کا خیال آیا نہ مسلمانوں کی غیرت کا۔ سعیدہ
بانو احمد کی خودنوشت ''ڈگر سے ہٹ کر'' میں یہ روداد لکھی ہوئی موجود ہے۔ ہمارے لینے کے
پیمانے اور ہیں دینے کے اور۔ اور یہی اس دور میں مسلمانوں کا المیہ ہے۔

ڈاکٹر صغرا مہدی کی خودنوشت عام عوام میں دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

✓

سچا گیت گایا

مشہور مغنیہ ملکہ پکھراج کی خودنوشت ''سچا گیت گایا'' کے عنوان سے ۲۰۰۳ میں
ہندوستان سے انگریزی میں شائع ہوئی۔ ملکہ کے داماد مشہور وکیل ایس ایم ظفر کے قول کے مطابق
یہ کتاب اردو میں لکھی گئی تھی مگر بعض موانع کی بنیاد پر پاکستان میں شائع نہ ہو سکتی تھی اس لئے
''کالی برائے خواتین'' ہندوستان والوں نے سلیم قدوائی سے اس کتاب کا انگریزی ترجمہ کروایا
اور Song Sung True کے عجیب وغریب عنوان سے شائع کر دیا۔ پاکستان میں اس
کتاب کی اشاعت میں جو موانع حائل تھے ان میں سے سرفہرست تو یہ عذر تھا کہ یہ کتاب ملکہ کے
مرحوم شوہر سید شبیر حسین کے ساتھ ساتھ کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ کے نام معنون کی گئی ہے اور
پاکستان میں مہاراجہ ہری سنگھ کا نام لینا بھی مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ کوئی پبلشر یہ
کتاب شائع کر کے مصیبت سہیڑنے کو تیار نہ ہوتا۔ اور اس کتاب کے آخری دو صفحات بھی
شاید ان کے خاندان والوں کے لئے قابلِ قبول نہ ہوتے کیونکہ ملکہ پکھراج نے لگی لپٹی رکھے بغیر
اپنے ایک بیٹے اور بڑے داماد ایس ایم ظفر پر بددیانتی کے الزام لگائے ہیں ''ایس ایم ظفر کے
مشورہ پر میں نے اپنے تمام معاملات اپنے ایک بیٹے کے سپرد کر دئے۔ مجھے یہ بھی مشورہ دیا گیا کہ
میں اپنی زمین میں سے کچھ کنال رقبہ ٹیکس کے معاملات طے کرنے کے لئے فروخت کر دوں۔ ایس ایم
ظفر نے کہا کہ یہ تمام معاملات ان کے دفتر میں طے ہوں اور میں دستخط کرنے کے لئے ان کے دفتر
میں جاؤں۔ انہوں نے میرے بیٹے سے کہا کہ وہ مالی معاملات کی نگرانی کرے۔ مجھے وہ وقت
اچھی طرح یاد ہے جب میں نے ان کاغذات پر دستخط کئے اس کے بعد جو سودے ہوئے وہ میرے

علم کے بغیر کئے گئے۔ نوا یکڑ زمین میرے جعلی دستخطوں سے بیچی گئی حتیٰ کہ میرا مکان بھی میرے علم کے بغیر بیچ دیا گیا۔۔۔ اس گھر سے میری یادیں وابستہ تھیں۔۔۔ ایسا تو نہیں کہ مجھے قبل از وقت متنبہ نہیں کیا گیا۔ میرے اس بیٹے نے جو فوج میں ہے مجھے بتایا تھا کہ میرا بیٹا میرے ساتھ دھوکہ کر رہا ہے مگر میں نے اسے جھڑک دیا تھا کہ خدانخواستہ وہ ایسا کیوں کرنے لگا وہ نمازی پرہیز گار ہے قرآن باقاعدہ پڑھتا ہے۔۔۔ ''میری بیٹی اور داماد ایس ایم ظفر نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنے مکان کے لئے سات کنال اراضی لینا چاہتے ہیں میں نے قیمت خرید پر وہ اراضی انہیں دے دی۔ میرے اس پرہیز گار بیٹے نے بتایا کہ ظفر نے سات کنال کی بجائے آٹھ کنال زمین لے لی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میری بیٹی کا معاملہ ہے اس لئے میں کچھ نہیں کہوں گی''۔۔۔ ''مجھے افسوس ہے کہ مجھے یہ سب کچھ لکھنا پڑ رہا ہے مگر میں خود ساری عمر اپنے معاملات میں دیانت دار رہی ہوں اس لئے میں نے یہ سب کچھ لکھ دیا ہے۔ مگر اب مجھے ان چیزوں کی کچھ پروا نہیں'' (سچا گیت گایا۔ صفحہ ۳۷۵۔۳۷۶)۔

ملکہ پکھراج جموں کے قریب ایک گاؤں حمیر پور سدھڑ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے گاؤں کے قریب ایک سادھو تھا جس کی دعا سے ان کی ولادت ہوئی تھی اس نے ان کو ملکہ کا نام دیا ان کی خالہ نے جو لاولد تھیں انہیں پکھراج کہنا شروع کیا اس طرح ان کا نام ملکہ پکھراج ہو گیا۔ بچپن میں ہی موسیقی اور رقص کی تربیت حاصل کی۔ بڑے غلام علی خاں کے والد علی بخش ان کے پہلے استاد تھے اور اپنی ناداری کے باعث صرف دو وقت کے کھانے کی اجرت پر سبق دیا کرتے تھے۔ پھر دہلی گئیں اور استادِ ممن خاں سے رقص سیکھنے لگیں۔ جموں واپس آئیں تو صرف سات سال کی عمر میں اپنے رقص اور موسیقی پر ان میں اتنا اعتماد پیدا ہو چکا تھا کہ مہاراجہ کے دربار میں بلائی گئیں اور پھر مہاراجہ ہری سنگھ کی ہو رہیں۔ مہاراجہ نے بھی ان کی خوب قدردانی کی اور ان پر خوب دولت نچھاور کی۔ اعلیٰ ترین لباس اور زیورات انہیں بنوا کر دئے۔ ہر شام دربار میں مدعو کی جاتیں اور انعامات سے مالا مال ہو کر لوٹتیں۔ ان کے نانا اور نانی اور ان کی والدہ ان کی دیکھ بھال کرنے والے تھے۔ باپ سے جو اپنے زمانہ کا مشہور جواری تھا اور جوئے کے معرکوں میں بلایا جاتا تھا ان کا

زیادہ تعلق نہیں رہا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ ان کی والدہ نے ان کی تعلیم کی خاطر ان کے ابا سے صلح کر لی تھی تاکہ بچی کی تعلیم و تربیت کے لئے گاؤں سے نکل سکیں۔ باپ کی وفات تک ان کا محبت نفرت کا رشتہ چلتا رہا اس کے بعد ان کا کوئی ذکر کہیں نہیں آتا۔

دلی کے حالات میں دونی جان اور چونی جان کا ذکر ملکہ پکھراج نے کیا ہے۔ یہ دونوں طوائفیں مغلیہ خاندان کی چہیتی تھیں اور ملکہ اپنے استاد کے ساتھ ان کے گھر بھی گئی تھیں۔ شاہد احمد دہلوی نے لکھا ہے ''دلی کی دو ڈیرے دار طوائفیں اب سے چالیس سال پہلے بہت مشہور تھیں نام تو خبر نہیں ان کے کیا تھے دونی اور چونی کہلاتی تھیں۔ دلی کے شہزادوں میں ایک بڑی دھوم دھام کی شادی ہوئی اس میں دونی جان کا مجرا تھا۔ جب مجرا جم گیا اور دونی جان فرمائشی گانے سنا چکیں تو انہوں نے اپنی پسند کے گانے سنانے شروع کئے۔ مرزا چپاتی (توتلے مغل شہزادے) نے کہا ''بائی جی ذرا ٹھہرنا ایک شعر ہو گیا ہے پہلے وہ سن لو'' مجلس میں سناٹا ہو گیا۔ مرزا نے شعر پڑھا ''ڈھستے ڈھستے ہو گئی اتنی ملٹ۔ ساٹ پیسے کی دونی رہ گئی'' (یعنی گھستے گھستے ہو گئی اتنی ملت۔ سات پیسے کی دونی رہ گئی)۔۔۔ دونی جان بڑے لقلقے کی خاتون تھیں۔ ان کی تیوری پر ہلکا سا بل آیا۔۔۔ مگر کہنے لگیں سبحان اللہ مرزا صاحب میں تو بیماری میں بالکل ست گئی تھی۔ اب بھی مجھ میں پوری سی جان کہاں آئی ہے صاحب عالم نے یاد فرمایا تھا اس لئے حاضر ہو گئی'' (بزمِ خوش نفساں۔ از شاہد احمد دہلوی صفحہ ۲۰۵)۔ دونی جان چونی جان کے تذکرہ سے بات مرزا چپاتی تک چلی گئی۔ ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا بات پہنچی تری جوانی تک۔

ملکہ پکھراج نے مہاراجہ ہری سنگھ کی مہربانیوں اور عنایتوں کا ذکر بڑی احسان مندی سے کیا ہے۔ ان کے قلم سے مہاراجہ کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ ایک مہربان، اور فن کے قدردان شخص کی ہے جس میں شخصی حکمرانوں سے منسوب ہونے والی بہیمیت کا کوئی شائبہ نہیں مگر مہاراجہ ہری سنگھ کے صاحبزادے ڈاکٹر کرن سنگھ نے اپنے باپ کا جو ذکر کیا ہے اس میں یہ صراحت سے لکھا ہے کہ ''میرے والد سخت مزاج ترش رو اور صرف اپنے منتخب درباریوں کے درمیان رہنے والے بہت کم یار باش تھے۔۔۔ اور اتنے غضبناک تھے کہ ان کے سامنے بولنا ناممکن تھا۔ کسی پر اعتماد نہیں کرتے

تھے۔۔انتہا پسند تھے میانہ روی ان کے ہاں نہیں تھی (سفر زندگی۔خودنوشت ڈاکٹر کرن سنگھ صفحہ ۴۳)۔ مہاراجہ کے تایا یعنی مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے بارہ میں بھی ملکہ پکھراج نرم گوشہ رکھتی ہیں ہاں اتنا ضرور لکھ دیا ہے کہ ''مہاراجہ صبح صبح اٹھ کر ناشتہ سے پہلے کسی مسلمان کا منہ نہیں دیکھتا تھا'' (صفحہ ۸۸) دیوان سنگھ مفتون کے اخبار ریاست کا ذکر کئی موقعوں پر موجود ہے۔''ریاست'' تو برصغیر کے رجواڑوں کا سب سے بڑا دشمن تھا اور حکمرانوں کی عیاشیوں اور ظلم وستم کا پردہ چاک کرنے میں مستعد تھا۔ریاست نے ملکہ پکھراج اور مہاراجہ ہری سنگھ کے بارہ میں بے بنیاد باتیں اور کہانیاں شائع کیں۔پہلی کا جواب تو ملکہ نے یہ دیا کہ میں دربار سے وابستہ ہوئی تو میری عمر سات سال تھی اس لئے میرا جنسی سکینڈل تو بن نہیں سکتا تھا اس لئے ریاست نے لکھا ''راجہ اندر رات کے نو بجے دربار کرتا ہے اور اس میں نیلم پری اور پکھراج پری گاتی اور قص کرتی ہیں اور مہاراجہ اپنے گلے میں پڑا ہوا قیمتی ہار ان پریوں پر نچھاور کر دیتا ہے'' (صفحہ ۱۸۲) پھر لکھا کہ ''ملکہ پکھراج کی سفارش پر مہاراجہ مسلمانوں کو ملازمت دیتا ہے'' (صفحہ ۱۸۹) جب ان کہانیوں کا کوئی اثر نہ ہوا تو ریاست نے سب سے بڑا اور گھناؤنا الزام یہ لگایا کہ ''ملکہ پکھراج نے مہاراجہ کو زہر دینے کی کوشش کی ہے'' (صفحہ ۲۰۴) غرض مہاراجہ کشمیر کو بدنام کرنے کے بارہ میں دیوان سنگھ مفتوں کی کوششیں کامیاب نہ ہوئیں۔

ریاست پٹیالہ اور رامپور دو بدنام ریاستیں تھیں جن کا ذکر اس خودنوشت میں ہے۔مہاراجہ پٹیالہ کی عیاشیوں اور بہیمیت کی داستانیں زبان زدعام تھیں۔''مہاراجہ کی سواری جارہی تھی کہ ایک برات پر اس کی نظر پڑی اس نے دلہن کو پالکی سے اتار کر اپنی گاڑی میں ڈال لیا اور برات والے منہ دیکھتے رہ گئے'' (صفحہ ۱۸۸) ریاست پٹیالہ سے انہیں کشمیر سے آنے کے بعد میں واسطہ پڑا اور خوش قسمت تھیں کہ وہاں سے صحیح سلامت بچ نکلیں۔اسی ریاست پٹیالہ میں ایک بار کسی جاگیردار کے ہاں مدعو تھیں اس نے ولی عہد کے اعزاز میں دعوت کر رکھی تھی۔''جب ولی عہد رخصت ہو گئے تو ایک جرنیل نے ان سے کہا کہ میں تمہارے گانے سے اتنا متاثر ہوا ہوں کہ تمہاری کار کے نیچے آ کر خودکشی کرنے لگا ہوں اور یہ کہہ کر ان کی کار کے آگے لیٹ گیا۔کوئی ایک درجن آدمیوں نے بمشکل اس جرنیل کو اٹھایا پکڑ کے رکھا تب ان کی کار چلی یہ وہاں سے آ سکیں'' (صفحہ ۲۳۴)

اور ریاست رامپور کو تو عام لوگ بھی حرام پور کہتے تھے اور شرر جیسے شخص نے بھی دربار حرامپور جیسا ناول لکھ دیا تھا۔پاکستان کے حصہ میں تو ریاست رامپور کے شاہی خاندان کے جنرل صاحبزادہ یعقوب خاں اور ان کی ہمشیرہ جہاں آرا حبیب اللہ آئیں اور اس قسم کا کوئی سکینڈل ان کے بارہ میں سننے میں نہ آیا۔

ملکہ پکھراج کے مزاج میں مہاراجہ کی حوصلہ افزائی اور ناز برداری کی وجہ سے یک گونا احساس برتری پیدا ہو گیا تھا'' دربار تاج پوشی کے بعد خواتین میرے قدموں کی خاک چھوتی اور اپنے بچوں کی آنکھوں میں لگاتی تھیں جیسے میں کوئی دیوی ہوں'' (صفحہ ۸۴) پھر آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''لوگوں کا کہنا تھا کہ میں زبان کی ادائیگی میں حرف آخر ہوں'' (صفحہ ۳۱۶)۔ملکہ جب تک کشمیر میں رہیں ان کی زندگی ایک محدود حلقہ تک محدود رہی۔گھر سے دربار اور واپس۔انہیں کہیں کسی جگہ جانے کی اجازت نہیں تھی حتیٰ کہ مہاراجہ انگلستان گئے تو انہیں کہہ گئے کہ تمہیں اپنی جگہ پر ہی رہنا ہے۔ایک بار مہاراجہ انہیں اپنے ساتھ شکار پر لے جانا چاہتا تھا تو انہیں مرد کا لباس پہنا کر لے جایا گیا۔غرض کشمیر میں ان کا قیام بڑا سودمند رہا مگر جب ہندو مسلم فسادات ہونے لگے تو مہاراجہ کا اعتماد کھو بیٹھیں اور وہاں سے لاہور آ گئیں مگر مہاراجہ ان سے ناراض رہا انہیں اس بات کا قلق ہے کہ وفات کے وقت یہ مہاراجہ کے پاس نہیں تھیں اور مہاراجہ کے قریب رہنے والے لوگ ان کے معذرت نامے مہاراجہ تک نہیں پہنچاتے تھے۔

لاہور میں آ کر ملکہ نے کچھ عرصے کے بعد گانا ترک کر دیا۔شادی کرنا چاہی تو ماں روک بننے لگیں۔آخر گھر سے فرار ہو کر سید شبیر حسین صاحب سے نکاح کر لیا۔ماں ناراض رہیں مگر آخر راضی ہو گئیں اور ان کے زیورات کپڑے اور پیسے واپس کر دئے۔شادی کے بعد شبیر صاحب کو شاہ جی کہنے لگیں اور شاہ جی نے بھی ان کی خوب قدر دانی کی۔شادی کے امیدواروں میں ایک رائے صاحب کا ذکر آپ نے مضحک انداز میں کیا ہے اور ان کی قبض کا بڑا انداق اڑایا ہے کیونکہ ان کا کہنا تھا ملکہ کے ''عشق کی وجہ سے وہ شدید قبض کا شکار ہیں (صفحہ ۲۲۹)

ملکہ پکھراج خوش حال رہیں مگر دنیا کے کاروباری معاملات میں ان کی قسمت اچھی نہ رہی

جس کے سپرد اپنے معاملات کئے اس نے انہیں دھوکا ہی دیا۔ کاروبار میں انہیں گھاٹا ہی ہوتا رہا مگر زندگی سے مایوس نہیں رہیں۔ بیوگی کے بعد ان کا زیادہ تر وقت کشیدہ کاری کی مصروفیات میں گذرا اور کشیدہ کاری کی نمائش بھی کرتی رہیں۔ اپنی مرضی سے گانا ترک کیا اور کہیں گئیں بھی تو اپنی شرائط پر گئیں۔

باپ کی وفات کے وقت طاہرہ سید گیارہ برس کی تھیں اس لئے ان کے گانے کا کوئی ذکر اس خودنوشت میں نہیں۔

مجموعی طور سے یہ خودنوشت ایک خود اعتماد گائیکہ اور رقاصہ کی ہے جس نے شہرت کی بلندیوں کو چھولیا اور زندگی نے ان کی خوب قدر دانی کی۔ اولاد میں سے اگر کسی سے انہیں شکوہ یا شکایت ہے تو یہ زندگی کا حصہ ہے۔ اسی برس کی عمر میں یہ خودنوشت لکھی اور غالباً ان کی زندگی میں یہ خودنوشت اشاعت پذیر نہ ہوئی۔ البتہ اپنی نواسی فرازہ سید کے ساتھ مل کر اس پر نظر ثانی کا موقع انہیں مل گیا اس لئے اس کے واقعات کو قابلِ استناد سمجھنا چاہئے۔ البتہ ترجمہ میں ایک بوالعجبی تو عین عنوان میں موجود ہے مگر اندر متن میں بھیبعض مضحکہ خیز باتیں موجود ہیں۔ ایک جگہ ملکہ نے محاورہ استعمال کیا ہے کہ "لوگ عش عش کرنے لگے۔" ترجمہ کرنے والے نے ترجمہ کیا "people started saying ush ...ush .. ہم بھی اس ترجمہ پر عش عش کرتے ہوئے اس تجزیہ کو ختم کرتے ہیں۔

✓

آپ بیتی پاپ بیتی

گورکھپور، سیتا پور اور چاٹگام سے بچپن اور کراچی سے نوجوانی میں مہاجرت اختیار کرنے والے قاضی محمدؒ شمشاد نبی صدیقی مدظلہ نے جو بوچر اور گروسر (صفحہ ۱۳۴) کے واؤچر پر انگلستان وارد ہوئے تھے سترے بہترے ہو جانے کے بعد اپنی آپ بیتی اور ساقی فاروقی کے نام سے اپنی پاپ بیتی لکھی ہے جو کراچی سے جنوری ۲۰۰۸ میں چھپی ہے گویا اس سال کی پہلی خودنوشت ہے۔ اللہ خیر کرے اس سال کا آغاز ہی پاپ بیتی سے ہو رہا ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا! ہم قاضی شمشاد نبی صاحب سے تو اپنے یونیورسٹی کے زمانہ سے آشنا تھے مگر ساقی فاروقی کے روپ سے یورپ آنے کے بعد شناسائی ہوئی ان کی عشق پیشگی کا چرچا خود ان کی زبانی بہت بار سنا۔ اب یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ اس عمر سے ہی اپنے معصوم ہاتھوں سے گدر جسموں کی ٹٹول پھپول کے عادی تھے اور "اپنی متجسس انگلیوں کو لذت کی ٹریننگ دیا کرتے تھے" (صفحہ ۱۸) جس عمر میں ان کی ہم عصر کشور ناہید اجنبی جسم دیکھ کر ڈر جایا کرتی تھیں کہ "ہیں یہ کیا ہے؟"۔ ماشاءاللہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات!

اشفاق نقوی صاحب کی آپ بیتی اسی نام سے چھپ چکی ہے مگر ان کے پاپ صرف پینے تک محدود تھے ساقی نے اپنے پاپ "آٹوگراف" دینے تک بڑھا دئے ہیں اور گواہ کے طور ایک جگہ جناب سلیم احمد جیسے معتبر بزرگ کو درمیان میں کھینچ لائے ہیں اور دوسری جگہ پر تالہ کے سوراخ میں سے تاک جھانک کرنے والے peeping tom حمایت علی شاعر کی نظم درج کردی ہے۔

"کسی کی خلوت میں چوری چوری
یہ تاکنے جھانکنے کی کوشش
ہماری تہذیب میں روا ہے؟

نہیں تو پھر اس کی کیا سزا ہے؟'' (صفحہ ۱۳۷)

ساقی فاروقی ہمارے جدید ادب کا بڑا اہم نام ہے۔اس نام کے ساتھ برہمی، زود رنجی اور برہنہ گوئی کا ایسا تصور وابستہ ہے جس کی کاٹ سے کوئی مامون و محفوظ نہیں۔ یوں لگتا ہے ساقی ''اپی تلوار ہے'' (صفحہ ۱۶۸) اور وہ جس کو اپنا یا ادب کا دشمن جانتا ہے اس پر پل پڑتا ہے اور ادب کے میدان کے بہت سارے مرد بلکہ مرد کی جمع ''مردود'' صفحہ ۱۰۴) اس کی زد میں آئے ہیں خواتین کے لئے اس کے دل میں ایک نرم گوشہ موجود ہے جو اس کی بیوی گن ہلڈ کا جسے ''وہ خباثت سے گنڈی'' کہتا ہے (صفحہ ۱۷۵) کا بنا کردہ ہے۔اس نے کبھی کسی کو بخشا نہیں شاید اسی لئے ان کے پھوپھا ان کی تنقید کو تخریب کاری سے موسوم کرتے تھے (صفحہ ۲۸) کیونکہ گھر کے بھیدی تھے اور اس کی شاعری کو مخرب اخلاق کیونکہ صاحبِ ذوق تھے۔یہی بات مشفق خواجہ نے بھی بارہا کہی مگر ساقی نے ایک کان سے سنی دوسرے سے نکال دی (شاید کانوں کے درمیان کوئی سد سکندری موجود نہ تھی)۔

خودنوشتوں کا ذکر کرتے ہوئے بھی ساقی نے سعیدہ بانو بیگم کی خودنوشت ''ڈگر سے ہٹ کر'' کو پسند کیا ہے اور کشور ناہید کی بری عورت کی کتھا کو صرف شامل فہرست کیا ہے۔سعیدہ بانو بھی اس لئے بچ گئی ہیں کہ ''وہ نہ شاعر ہیں نہ افسانہ نگار'' (صفحہ ۱۴) ہوسکتا ہے اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ سعیدہ بانو احمد نے برملا نورالدین احمد صاحب کے ساتھ بلا نکاح رہنے اور بعد میں نکاح کر لینے کا کام بھی ڈگر سے ہٹ کر کیا تھا اور دہلی جیسے معاشرہ میں رہ کر یہ جرات مندانہ قدم اٹھایا تھا۔میرا جی چاہتا تھا یہاں واللہ اعلم بالصواب لکھوں مگر ساقی فاروقی تو انشاء اللہ کی بجائے ''انشاء الشیطان'' (صفحہ ۶۳) پر زیادہ اعتبار رکھتا ہے۔

خودنوشت کی کامیابی اس نکتہ میں مضمر ہوتی ہے کہ لکھنے والے کی شخصیت اس خودنوشت کے بیانیے میں روح کی طرح موجود رہے۔(سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے) یہ عمل خودنوشت کو بے جان نہیں ہونے دیتا اور زندگی کی طرح آگے بڑھاتا رہتا ہے۔یہ خودنوشت بڑی جاندار ہے اور جانداری میں ساقی فاروقی کی پختہ نثر کا بڑا ہاتھ ہے۔جس طرح نظم میں وہ لفظوں کے تام جھام سے گریز کرتا ہے اسی طرح نثر میں بھی وہ الفاظ کی بچت کی اہمیت سے پورے طور پر شناسا ہے اگر میں عربی میں کہوں کہ اس کی نثر ''ماقلّ ودلّ'' کی عمدہ مثال ہے تو ساقی یہ نہ

کہنے لگے کہ یہ تم گالیاں کیوں بکنے لگے ہو؟ مگر حقیقت یہی ہے کہ اس نے تھوڑے لفظوں میں ایک عہد کو سمیٹ لیا ہے۔

دوسری اہم بات جو خودنوشت کو بنانے یا بگاڑنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے وہ یوں ہے کہ لکھنے والے کی طول بیانی اس پر غالب نہ ہو۔ جہاں قلم بے لگام ہوا خودنوشت کا تانا بانا بکھرا ۔سلمان رشدی کے فتنہ کے سلسلہ میں ساقی نے اپنی نظم پر علمائے سو کے ردعمل کے بیان میں بھی غیر ضروری تفصیلات بیان کرنے میں اپنا اور قاری کا وقت ضائع کیا ہے اور اس بات کا اسے خود بھی احساس ہے۔ ''میرے متجسس قاری کو حیرانی تو ضرور ہو رہی ہوگی کہ مولویوں کے فتویٰ نما بیان اور سلمان رشدی کے نابالغانہ مذہبی رویہ کا پس منظر اجاگر کرنے کی بجائے میں نے اپنے نوجوان دوست محمود جمال (فرنگی محلی) پر اور اپنے میلان خاطر prejudices پر پچھلا صفحہ سیاہ (بلکہ تباہ) کیوں کر دیا'' (صفحہ ۵۰) اس احساس کے باوجود ساقی نے یہ بحث مزید چھ صفحے تک ممتد کی ہے۔رہے فتوے تو وہ ہر صائب الرائے شخص پر لگتے رہے ہیں مگر قرآنی محاورہ میں پھونکوں سے راست گوئی کے چراغ کبھی نہیں بجھائے جاسکتے۔(پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا۔ظفر علی خاں) علمائے سو کے وجوب قتل کے باب میں حضرت مفتی ساقی فاروقی کا ایک فتویٰ بھی کتاب کے صفحہ ۵۹ پر درج ہے۔(ساقی کی سنت جاریہ ہے کہ وہ کم از کم دو سو پونڈ لئے بغیر کسی مقامی مشاعرہ میں بھی شریک نہیں ہوتے۔یعنی جب تک ان کے ساتھ ''ر'' کے دو سو عدد شامل نہ کئے جائیں ان کا دل نہیں پسیجتا۔اگر مفتی میں ''ر'' کے دو سو عدد شامل کر دئے جائیں تو وہ مفتری بن جاتا ہے۔مقام شکر ہے کہ یہ مفتیانہ فتویٰ نہیں ورنہ یار لوگ اسے بھی مفتی کا نہیں کسی مفتری کا فتویٰ سمجھ بیٹھتے۔سند کے لئے ملاحظہ کیجئے مولانا محمد علی جوہر کا بیان دربارہ مفتیء ہند مفتی کفایت اللہ)۔ گستاخی معاف اس طول امل کے جواز میں اگر ساقی فاروقی اپنی وہ نظم بھی درج کر دیتے جس کا یہ سب شاخسانہ ہے تو قاری پر یہ طول بیانی گراں نہ گذرتی۔ میں نے تو وہ نظم ساقی کی زبان سے سنی ہوئی ہے سب لوگوں نے تو نہیں سنی۔میرا خیال ہے اگر وہ نظم درج کر دی جاتی تو اس کی خودنوشت کے قارئین ساقی پر گذرنے والی واردات سے آگاہ ہو کر اس کے جاری کردہ فتویٰ پر زیادہ اعتبار کرتے۔

احوال الرجال کے سلسلہ میں بھی ساقی کا اسلوب منفرد ہے۔عزیز حامد مدنی ''مدنی قیامت کے غزل گو اور اچھے نظم نگار تھے نثر بھی عمدہ لکھتے تھے مشرق ومغرب کے ادب پر بھی آڑی مگر اچھی نگاہ تھی۔تخلیقی گفتگو کرتے تھے ان کی پچیس فیصد نظمیں مجھے پسند ہیں بقیہ نظموں میں علم کو شعر کی اطاعت نہ سکھا سکے'' (صفحہ ۷۰) قمر جلالوی ''بالکل اُمّی تھے۔آخر آخر میں دستخط کرنا سیکھ گئے تھے گاندھی گارڈن میں ان کی سائیکلوں کی دکان تھی لوگوں کی غزلوں اور سائیکلوں کی مرمت کرتے تھے یہ بوڑھے ہی پیدا ہوئے ہونگے'' (صفحہ ۷۴) ''حبیب جالب فراز کی طرح دوغلے تھے نہ لالچی'' (صفحہ ۸۴) اطہر نفیس کے دوہوں کی اتنی تعریف کی کہ اس نے دوہے کہنا ہی چھوڑ دئے۔(صفحہ ۸۸)۔جمیل الدین عالی'' کی ملاقات سویڈن کی ایک مطلقہ خاتون انگرِد سے ہوئی عالی جی جب لندن آتے ہیں تو۔۔۔اسے فون کرتے ہیں یا سویڈن کا چکر لگا آتے ہیں۔خیال اغلب ہے کہ ان کا مثانہ کمزور ہے'' (صفحہ ۱۳۳) ساقی نے ان کے مثانہ کی کمزوری کا ذکر کیا تو جون ایلیا یاد آئے جن کا شعر کل ہی عروج اختر زیدی صاحب نے سنایا تھا ''تہی دامن ہوں خالی ہو گیا ہوں۔جمیل الدین عالی ہو گیا ہوں۔''

ساقی فاروقی کو ''غصیلے نوجوان'' کا خطاب ناصر کاظمی نے دیا تھا (صفحہ ۶۶) اور ان کا اپنا خیال ہے کہ لندن آنے سے قبل انہوں نے اپنے ''غصے کی ربر سے اجنبیت کی سرحد مٹا دی تھی'' (صفحہ ۱۰۰) مگر ان کی خودنوشت اس کی تردید کرتی ہے وہ مہاجرت کے ماحول میں رہ کر حساس تر ہو گئے ہیں اور ان کی طبیعت کی حساسی بعض جگہ زودحسی میں بدل گئی ہے۔چونکہ ''وہ دوستی پر ادبی سچائی کو قربان نہیں کرسکتے'' (صفحہ ۸۹) اس لئے دوستی اور ادبی سچائی کے مابین صلح کرواتے کرواتے ان کا حال وہی ہوا جو لڑائی کے دوران فریقین میں بیچ بچاؤ کرانے والوں کا ہوتا ہے۔

فیض اور راشد کے بھرپور خاکے اس خودنوشت میں شامل ہیں۔از بسکہ میں یہ خاکے پہلے پڑھ چکا ہوں مگر اس خودنوشت میں پیوند ہو کر وہ زیادہ relevant اور بامعنی ہو گئے ہیں۔ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے سلسلہ میں ن م راشد صاحب نے احمد ندیم قاسمی کا جو ردعمل بیان کیا ہے وہ خاصہ حیران کن ہے (صفحہ ۱۵۸) ہم بھی قاسمی صاحب کو جانتے ہیں ان سے ملے جلے ہیں قاسمی

صاحب میں ذوق سلیم کی کوئی کمی نہیں تھی اس وقت خدا جانے راشد صاحب کی کس بات نے انہیں برافروختہ کر دیا ہوگا۔قاسمی صاحب ''بہنوں'' کے ساتھ ''اغوا'' کا قرینہ برداشت نہ کرسکے ہونگے۔ن م راشد صاحب کی صاحبیت کا ذکر تو حمید نسیم صاحب نے بھی اپنی خودنوشت میں کیا ہے اور وہ انہیں ہمیشہ کیپٹن راشد کہہ کر یاد کیا کرتے تھے اور راشد صاحب کو خود بھی اپنی اس کمزوری کا احساس تھا۔ساقی کا تجربہ اسی صفحہ پر درج ہے کہ ''راشد صاحب دل دکھانے میں پہل نہیں کرتے تھے'' مگر حمید نسیم کا تجربہ شاید اس کے برعکس ہے۔یہ سب کچھ لکھنے کے بعد مجھے خیال آرہا ہے کہ ہم دونوں ان مرحومین کی خوبیوں خرابیوں پر جرح کیوں کر رہے ہیں؟ ہم ''اپنی زبانوں پر زپ کیوں نہیں لگاتے'' (صفحہ ۲۱)

میرے لئے تو اس کتاب میں لطف کا ایک سبب وہ مصرعے یا شعر ہیں جو ساقی نے کوٹ کئے ہیں۔یگانہ کا شعر ''صد رفیق وصد ہمدم پر شکستہ و دل تنگ۔داور انمی زبند بال و پر بہ من تنہا'' مدتوں بعد ساقی کے ہاں دیکھا۔اسی طرح ساقی نے اپنے دوست اسد کی بات کرتے ہوئے رسا چغتائی کا کیا ظالم مصرعہ لکھ دیا ہے ''پھر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا ایسا کھلا''۔ساقی پہلا مصرعہ بھی لکھ دیتا تو لطف دونا ہو جاتا۔''صرف مانع تھی حیا بند قبا کھلنے تک۔پھر تو وہ جان حیا ایسا کھلا! ایسا کھلا!!''۔ایسے شعر وہی کوٹ کرسکتا ہے جس کی روح میں ادب عالیہ کا رچاؤ موجود ہو۔ساقی کے مزاج کی اس کیفیت سے میں پہلی بار اس کی خودنوشت پڑھ کر آشنا ہوا ہوں ورنہ میرا خیال تھا ساقی دوسروں کے اچھے شعروں کو بھی اچھے شعر نہیں سمجھتا۔ساقی نے اپنی بے لگام انانیت کو لگام دے کر اس خودنوشت کو چار چاند لگا دئے ہیں۔

ساقی نے اس خودنوشت میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہ ہر کوئی نہیں لکھتا یا نہیں لکھ سکتا اور لکھنے کے بعد وہ خود بھی شاید یہی سوچ رہا ہوگا کہ ما راز بخت جانیءخود ایں گماں نبود۔آخر اس نے اپنی مسلماں ماں کے ساتھ لالہ دوار کا ناتھ کی بہو کا دودھ بھی پیا ہے اور ''اس کے اندر مومن لہو کے ساتھ کافر لہو بھی دوڑ رہا ہے'' (صفحہ ۱۷)

میری آخری منزل

پاکستان آرمی کے پہلے پہلے سالار جنرل محمد اکبر خاں (رنگروٹ) کی خودنوشت ''میری آخری منزل'' کے عنوان سے لاہور سے ۲۰۰۶ میں شائع ہوئی تھی۔ یہ روداد حیات اگست ۱۹۵۰ تک کے واقعات پر مبنی ہے۔ جنرل محمد اکبر خان انڈیا کی برٹش آرمی کے پہلے ہندوستانی تھے جو ۳ اگست ۱۹۴۷ کو میجر جنرل کے عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ (جنرل کری آپا اور راجندر سنگھ بعد کو اس مرتبے تک پہنچے) قیام پاکستان کے وقت انہیں پاکستان کی پہلی کور کے کمانڈر کے طور پر کراچی میں تعینات کیا گیا۔ ۱۹۵۱ میں فوج سے سبک دوش ہوئے اور جنوری ۱۹۸۴ میں رہگزائے قضا ہوئے جنرل اکبر خاں امرتسر میں پیدا ہوئے مگر ان کے والد راجہ فضل داد خاں چکوال کے بڑے زمیندار تھے۔ یہ خاندان فوجی خدمات کے لحاظ سے بڑا نامور خاندان تھا ان کے بھائی جنرل افتخار خاں لاہور کے کور کمانڈر تھے اور پاکستان آرمی کے پہلے کمانڈر انچیف بننے والے تھے مگر ایک ہوائی حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ دوسرے بھائی جنرل انور خاں پاکستان آرمی کے انجینئر انچیف کے مرتبے تک پہنچے۔ ان کے تیسرے بھائی بریگیڈئر کے عہدے تک پہنچ کر ریٹائر ہوئے۔ غرض یہ خاندان پاکستان کا ممتاز مارشل خاندان تھا۔ ۱

جنرل اکبر خاں کی ہمشیرہ کو رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد بہت پسند تھا اور وہ ان سے کہا کرتی تھیں کہ اگر تم ''آزاد پاشا جیسے سالار بنو گے تو میں تمہارے لئے کسی نواب کی بیٹی بیاہ کر لاؤں گی۔ جنرل صاحب نے لکھا ہے کہ ''ان کی دونوں آرزوئیں پوری ہوئیں'' (میری آخری منزل۔ صفحہ ۵۲) یعنی اکبر خاں جنرل بھی ہوئے اور ان کی شادی نواب سربلند جنگ چیف جسٹس

ریاست حیدر آباد کی دختر نیک اختر قدسیہ بیگم سے ہوئی۔ نواب سربلند جنگ مشہور ادیب فرحت اللہ بیگ کے بہنوئی تھے۔ حیدر آباد اور دیگر شخصی ریاستوں میں چیف جسٹس کا تقرر کس طرح ہوتا تھا اس کی مثال مولوی خدا بخش (پٹنہ کی مشہور خدا بخش اورینٹل لائبریری والے) کا تقرر ہے جس کا ذکر فرحت اللہ بیگ نے اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔ مولوی خدا بخش صاحب ۱۸۹۵ میں حیدر آباد گئے اور سید علی بلگرامی کے پاس ٹھہرے۔ مولوی صاحب بنگال میں درجہ دوم کے وکیل تھے درخواست ہوئی کہ انہیں درجہ اول کے وکیل کی سند دی جائے چیف جسٹس نے درخواست نامنظور کر دی کہ ان کی اردو قابل اطمینان نہیں۔ سید علی بلگرامی کو بہت تاؤ آیا ان کے تعلقات نواب سرور الملک سے تھے اور ان کا بہت زور تھا۔ سید علی بلگرامی نے ان سے کہا انہوں نے چیف جسٹس کو سبق سکھانے کی سوچ لی۔ ''ہفتہ کی صبح کو مولوی خدا بخش خاں صاحب کو بلایا اور ایک خط دیا یہ خط ایک فرمان تھا کہ مولوی افضل حسین کی جگہ مولوی خدا بخش کو چیف جسٹس بنایا جاتا ہے چنانچہ انہوں نے فوری طور پر چیف جسٹس کا جائزہ لے لیا اور جن کو وکالت کی سند نہیں مل سکتی تھی ان کو میر مجلسی (یعنی چیف جسٹس شپ) مل گئی'' (میری زندگی۔ خودنوشت مرزا فرحت اللہ بیگ صفحہ ۳۴)۔

کراچی میں تعیناتی کی وجہ سے انہیں قائد اعظم محمد علی جناح کے ساتھ کام کرنے اور انہیں بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ۷ اگست ۱۹۴۷ کو جب قائد اعظم پاکستان کے نامزد گورنر جنرل کی حیثیت سے کراچی تشریف لائے تو جنرل اکبر خاں نے ان کا استقبال کیا اور انہیں اس بات کا تاسف رہا کہ ''انہیں سپریم کمانڈر کی جانب سے پاکستان کے نامزد گورنر جنرل کو گارڈ آف آنر پیش کرنے کی کوئی ہدایت نہ تھی'' (صفحہ ۳۸)۔ کراچی میں فوجی ساز و سامان کا عالم یہ تھا کہ انگریز جاتے جاتے ہر چیز کو تباہ کر گئے تھے۔ ۱۴ اگست کو توپوں کی سلامی کے لئے مناسب مقدار میں توپوں کے گولے تک میسر نہیں تھے۔ جنرل صاحب نے معائنہ کے دوران اسلحہ کی کئی کشتیاں پکڑیں جو پاکستان کو ملنے والا اسلحہ سمندر برد کرنے کے لئے جا رہی تھیں۔ غرض ابتدا میں نئی قائم ہونے والی مملکت پاکستان کے پاس وسائل ہی نہیں تھے اور جو کچھ تقسیم کے معاہدہ کے مطابق پاکستان کو ملنے والا تھا اس کو ہندوستان روک کر بیٹھا ہوا تھا۔ جنرل اکبر کی یہ کتاب انگریزوں اور ہندوؤں دونوں

کی پاکستان دشمنی کی بڑی اچھی عکاسی کرتی ہے۔

عید کے موقع پر قائداعظم نے کہا کہ وہ لوگوں سے خطاب کریں گے اور جنرل اکبر سے کہا کہ وہ اپنی نگرانی میں لاؤڈ سپیکر کا انتظام کریں۔ ''جب لاؤڈ سپیکر نصب ہوا تو چند مولوی صاحبان بھاگ کر آئے اور مائیکروفون کو پکڑ لیا کہ ہم اس شیطانی آلہ کو مسجد میں استعمال نہ ہونے دیں گے۔ اتنے میں کمپنی کے آدمی نے ٹسٹ کرنے کے لئے جیسے ہی بجلی کی تار لگا دی تو مائیکروفون کی تار نے شارٹ مارا تو تینوں مولوی صاحبان اچک کر دھم سے گرے اور حواس باختہ ہو کر زمین پر بے حس لیٹ گئے میں ڈرا کہ کہیں شاک سے مر نہ گئے ہوں مگر انہیں کچھ نہ ہوا تھا یا تو وہ سہمے ہوئے تھے یا پھر ڈرامائی انداز کا مظاہرہ کر رہے تھے بہر حال میرے کہنے پر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور پھر کوئی مزاحمت نہ کی'' (صفحہ ۱۰۷)۔ اور اب انہی مولویوں کی نسل ہر مسجد میں لاؤڈ سپیکر پر دھاڑتی چنگھاڑتی رہتی ہے اور انہیں کوئی نہیں پوچھتا! مولویوں کی بہادری کا ایک اور واقعہ بھی جنرل صاحب نے بیان کیا ہے کہ ''وزیراعظم کا فون آیا کہ فوج کا دستہ لے کر ملیر سے ان کی قیام گاہ پر پہنچوں کیونکہ ''پچاس ہزار کا مجمع ان کے گھر کے سامنے مظاہرہ کر رہا ہے اور ان کے لیڈر کچھ مولوی ہیں اور کچھ خود ساختہ سیاسی لیڈر'' لکھتے ہیں میں وہاں پہنچا اور اعلان کروایا کہ ''حضرات وزیراعظم کے حکم سے ہم آپ مجاہدین کو کشمیر کے محاذ اور بھارت کے خلاف لڑنے کے لئے بھرتی کرنے آئے ہیں آپ حضرات کیو کی لائن میں جلدی کھڑے ہو جائیں اور اپنے اپنے نام اور پتے لکھا دیں ابھی فوجی لاریاں آ رہی ہیں وہ آپ کو ملیر چھاؤنی میں لے جا کر وردی اور اسلحہ دے کر محاذ پر جلد از جلد بھیج دیں گے''۔۔۔ ''وہ علما اور سیاسی لیڈر جو مجھے یہ طعنے دے رہے تھے کہ بجائے کشمیر کے محاذ پر لڑنے کے تم کراچی کے ہوٹلوں میں دعوتیں کھاتے پھرتے ہو اب وہ بھی جب سرکنے لگے تو میں نے عرض کیا ''مولانا صاحبان آپ تو ٹھہرئے میں تو آج ہی شب کے فوجی طیارہ سے آپ حضرات کو کشمیر لے جا رہا ہوں'' مگر جواب ملا ہم امام ہیں ہم لڑنا کیا جانیں ہمارا کام تو تلقین کرنا ہے وغیرہ وغیرہ علاوہ ازیں ہم جسمانی طور سے بیمار بھی ہیں'' (صفحہ ۳۳۴)۔ یہ تو ہمارے علما کا حال تھا اور اس وقت جہاد کشمیر میں حصہ لینے والی صرف ایک ہی

رضا کار پلٹن تھی جس کا نام فرقان فورس تھا۔ جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار!

جنرل اکبر خاں کے بھائی جنگ شاہی کے قریب ایک ہوائی حادثے میں جاں بحق ہوئے تھے جنرل صاحب جلتے ہوئے جہاز کے ملبے تک پہنچے اور محسوس کیا کہ ''بعض لاشیں تو جل گئی تھیں مگر بعض لاشوں کو بعد میں مٹی کا تیل چھڑک کر جلایا گیا تھا'' (صفحہ ۴۲۸)۔ جنرل صاحب کو شبہ ہے کہ لوٹنے والے دوسرے سب لوگوں سے پہلے جائے حادثہ پر پہنچے اور بچی کھچی لاشوں کو لوٹنے کے بعد انہیں نذر آتش کر دیا۔

جنرل اکبر خاں ایک اچھے مسلمان کی طرح اپنی فوج کو بھی ایک اچھا اسلامی لشکر بنانا چاہتے تھے اور اس سلسلہ میں آپ نے سیرۃ نبوی کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی فن حرب اور اس کے اصولوں پر خامہ فرسائی بھی کی تھی مگر مولوی ان کے پیچھے پڑ گئے (صفحہ ۱۴۰) مگر جنرل صاحب اپنے موقف پر قائم رہے۔ ان کا خیال تھا کہ پہلے قدم کے طور پر فوجی دعوتوں میں شراب کی ممانعت ہونی چاہئے۔ آپ نے قائداعظم سے بھی اس بات کا ذکر کیا تو قائداعظم مسکرائے ''اور فرمایا جو لوگ قرآن مجید کے احکامات پر عمل نہیں کرتے وہ میرے احکامات پر عمل پیرا نہ ہونگے'' صفحہ ۲۸۱) مگر جنرل صاحب نے اپنے ایریا کے تمام فوجی میسوں میں شراب کی ممانعت کر دی۔

تقسیم ملک کے وقت جونا گڑھ، جودھ پور، جیسلمیر اور جے پور کی ریاستوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا عندیہ دیا تھا۔ ان کا ایک وفد قائداعظم سے ملنے کراچی آیا تو قائداعظم نے ان سے کہا کہ وہ اپنی من پسند شرائط پر ہمارے ساتھ الحاق کریں۔ اس وفد کے آنے کی مخبری ہو گئی اور ماؤنٹ بیٹن اور وی پی مینن نے فوری طور پر ان ریاستوں پر اپنا شکنجہ ڈال دیا۔ جنرل صاحب کو حیرت ہے کہ اس بات کی مخبری کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ سوائے جنرل صاحب کے اور سکندر مرزا کے اس وفد کے ورود کی کسی کو خبر نہ تھی۔ ایک دو اور مقامات پر بھی جنرل صاحب نے سکندر مرزا کے برطانوی استعمار کا ایجنٹ ہونے کا خدشہ ظاہر کیا ہے۔ ایک جگہ تو قائداعظم کی بات درج کر دی ہے کہ ''کیا تم میر جعفر کے پوتے سے ڈر گئے ہو؟'' (صفحہ ۲۸۶)۔ اب تو جنرل صاحب اور ''میر جعفر کا پوتا'' دونوں وہاں ہیں جہاں ہماری زجر و توبیخ انہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتی اس لئے

کی پاکستان دشمنی کی بڑی اچھی عکاسی کرتی ہے۔

عید کے موقع پر قائداعظم نے کہا کہ وہ لوگوں سے خطاب کریں گے اور جنرل اکبر سے کہا کہ وہ اپنی نگرانی میں لاؤڈ سپیکر کا انتظام کریں۔ ''جب لاؤڈ سپیکر نصب ہوا تو چند مولوی صاحبان بھاگ کر آئے اور مائیکروفون کو پکڑ لیا کہ ہم اس شیطانی آلہ کو مسجد میں استعمال نہ ہونے دیں گے۔ اتنے میں کمپنی کے آدمی نے ٹسٹ کرنے کے لئے جیسے ہی بجلی کی تار لگا دی تو مائیکروفون کی تار نے شارٹ مارا تو تینوں مولوی صاحبان اچک کر دھم سے گرے اور حواس باختہ ہو کر زمین پر بے حس لیٹ گئے میں ڈرا کہ کہیں شاک سے مر نہ گئے ہوں مگر انہیں کچھ نہ ہوا اٹھایا تو وہ سہمے ہوئے تھے یا پھر ڈرامائی انداز کا مظاہرہ کر رہے تھے بہر حال میرے کہنے پر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور پھر کوئی مزاحمت نہ کی'' (صفحہ ۱۰۷)۔ اور اب انہی مولویوں کی نسل ہر مسجد میں لاؤڈ سپیکر پر دھاڑتی چنگھاڑتی رہتی ہے اور انہیں کوئی نہیں پوچھتا! مولویوں کی بہادری کا ایک اور واقعہ بھی جنرل صاحب نے بیان کیا ہے کہ ''وزیراعظم کا فون آیا کہ فوج کا دستہ لے کر ملیر سے ان کی قیام گاہ پر پہنچوں کیونکہ ''پچاس ہزار کا مجمع ان کے گھر کے سامنے مظاہرہ کر رہا ہے اور ان کے لیڈر کچھ مولوی ہیں اور کچھ خود ساختہ سیاسی لیڈر'' لکھتے ہیں میں وہاں پہنچا اور اعلان کروایا کہ ''حضرات وزیراعظم کے حکم سے ہم آپ مجاہدین کو کشمیر کے محاذ اور بھارت کے خلاف لڑنے کے لئے بھرتی کرنے آئے ہیں آپ حضرات کیو کی لائن میں جلدی کھڑے ہو جائیں اور اپنے اپنے نام اور پتے لکھا دیں ابھی فوجی لاریاں آ رہی ہیں وہ آپ کو ملیر چھاؤنی میں لے جا کر وردی اور اسلحہ دے کر محاذ پر جلد از جلد بھیج دیں گے''۔۔۔ ''وہ علما اور سیاسی لیڈر جو مجھے یہ طعنے دے رہے تھے کہ بجائے کشمیر کے محاذ پر لڑنے کے تم کراچی کے ہوٹلوں میں دعوتیں کھاتے پھرتے ہو اب وہ بھی جب سرکنے لگے تو میں نے عرض کیا ''مولانا صاحبان آپ تو ٹھہرئے میں تو آج ہی شب کے فوجی طیارہ سے آپ حضرات کو کشمیر لے جا رہا ہوں'' مگر جواب ملا ہم امام ہیں ہم لڑنا کیا جانیں ہمارا کام تو تلقین کرنا ہے وغیرہ وغیرہ علاوہ ازیں ہم جسمانی طور سے بیمار بھی ہیں'' (صفحہ ۳۳۴)۔ یہ تو ہمارے علما کا حال تھا اور اس وقت جہاد کشمیر میں حصہ لینے والی صرف ایک ہی

رضا کار پلٹن تھی جس کا نام فرقان فورس تھا۔ جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار!

جنرل اکبر خاں کے بھائی جنگ شاہی کے قریب ایک ہوائی حادثے میں جاں بحق ہوئے تھے جنرل صاحب جلتے ہوئے جہاز کے ملبے تک پہنچے اور محسوس کیا کہ ''بعض لاشیں تو جل گئی تھیں مگر بعض لاشوں کو بعد میں مٹی کا تیل چھڑک کر جلایا گیا تھا'' (صفحہ ۴۲۸)۔ جنرل صاحب کو شبہ ہے کہ لوٹنے والے دوسرے سب لوگوں سے پہلے جائے حادثہ پر پہنچے اور بچی کھچی لاشوں کو لوٹنے کے بعد انہیں نذر آتش کر دیا۔

جنرل اکبر خاں ایک اچھے مسلمان کی طرح اپنی فوج کو بھی ایک اچھا اسلامی لشکر بنانا چاہتے تھے اور اس سلسلہ میں آپ نے سیرۃ نبوی کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی فن حرب اور اس کے اصولوں پر خامہ فرسائی بھی کی تھی مگر مولوی ان کے پیچھے پڑ گئے (صفحہ ۱۴۰) مگر جنرل صاحب اپنے موقف پر قائم رہے۔ ان کا خیال تھا کہ پہلے قدم کے طور پر فوجی دعوتوں میں شراب کی ممانعت ہونی چاہئے۔ آپ نے قائداعظم سے بھی اس بات کا ذکر کیا تو قائداعظم مسکرائے ''اور فرمایا جو لوگ قرآن مجید کے احکامات پر عمل نہیں کرتے وہ میرے احکامات پر عمل پیرا نہ ہونگے'' صفحہ ۲۸۱) مگر جنرل صاحب نے اپنے ایریا کے تمام فوجی میسوں میں شراب کی ممانعت کر دی۔

تقسیم ملک کے وقت جوناگڑھ، جودھ پور، جیسلمیر، اور جے پور کی ریاستوں نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا عندیہ دیا تھا۔ ان کا ایک وفد قائداعظم سے ملنے کراچی آیا تو قائداعظم نے ان سے کہا کہ وہ اپنی من پسند شرائط پر ہمارے ساتھ الحاق کریں۔ اس وفد کے آنے کی مخبری ہو گئی اور ماؤنٹ بیٹن اور وی پی مینن نے فوری طور پر ان ریاستوں پر اپنا شکنجہ ڈال دیا۔ جنرل صاحب کو حیرت ہے کہ اس بات کی مخبری کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ سوائے جنرل صاحب کے اور سکندر مرزا کے اس وفد کے ورود کی کسی کو خبر نہ تھی۔ ایک دو اور مقامات پر بھی جنرل صاحب نے سکندر مرزا کے برطانوی استعمار کا ایجنٹ ہونے کا خدشہ ظاہر کیا ہے۔ ایک جگہ تو قائداعظم کی بات درج کر دی ہے کہ ''کیا تم میر جعفر کے پوتے سے ڈر گئے ہو؟'' (صفحہ ۲۸۶)۔ اب تو جنرل صاحب اور ''میر جعفر کا پوتا'' دونوں وہاں ہیں جہاں ہماری زجر و توبیخ انہیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتی اس لئے

رجماً بالغیب سے فائدہ؟

کشمیر کی صورت حالات پر غور کرنے کے لئے لاہور میں جو سربراہی کانفرنس ہوئی اس میں ماؤنٹ بیٹن تو شریک ہوا مگر پنڈت نہرو بیماری کا بہانہ کر کے نہیں آئے۔ جب کسی نتیجہ پر پہنچنے کی بات ہوئی تو ماؤنٹ بیٹن نے عذر کیا کہ وہ تو صرف آئینی گورنر جنرل ہے اسے کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل نہیں۔ یہی ماؤنٹ بیٹن لندن جاتے ہوئے کراچی میں رکا اور جنرل صاحب سے کہا کہ وہ قائداعظم سے ملنے کا خواہشمند ہے مگر قائداعظم نے ٹکا سا جواب دیا کہ ’’وہ تو آئینی گورنر جنرل ہے کیا وہ ایک دوسری آزاد مملکت کے سربراہ سے ملنے کی اجازت اپنے وزیراعظم سے لے کر آیا ہے‘‘ (صفحہ۱۸۴) اور ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔

غرض جنرل صاحب کی یہ خودنوشت بڑی مفید اور کام کی سرگزشت ہے مگر ہم لوگ ایسی باتوں پر کان دھرنے والی قوم نہیں ہیں۔ یہ سرگزشت جنرل صاحب کی وفات کے بعد ان کے ورثا نے چھپوادی ہے مگر معلوم دیتا ہے کہ مسودہ پبلشر کے حوالے کر کے وہ نچنت ہو گئے اور پبلشر نے یا کمپوزر نے اس کتاب کی اچھی اور خوب صورت عبارت کو بھی کتابت کی فاش غلطیوں سے برباد کر دیا جنرل صاحب اچھے صاحب ذوق آدمی تھے آپ نے ہر مقام پر اقبال جوش اور غالب اور حافظ کے اشعار کا حوالہ دیا ہے مگر کاتب نے ان اشعار کا وہ حلیہ بگاڑا ہے کہ پناہ بخدا۔ حافظ کا مشہور شعر ’’درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ای۔ بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش‘‘ کاتب صاحب نے لکھا ہے ’’درمیاں قہر در.یایا تختہ بندم کردہ ای بعد ے گوئی دامن ترکان ہشیلد باش‘‘ (صفحہ ۲۳۷) کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔ پھر ایک مشہور مقولہ ہے ’’من درچہ خیالم وفلک درچہ خیال‘‘۔ لکھا ہے ’’من درجہ خیلام وجلک درجہ خیال‘‘ (صفحہ۳۵۲)۔ مگر ان تمام بوالعجبیوں کے باوجود اسد ملتانی کی ایک نظم ہم نے پہلی بار اس کتاب میں دیکھی ہے اور وہ اس قابل ہے کہ قارئین کی نذر ہو۔

پوچھا جو میں نے ایک حکیم فرنگ سے
انصاف کا یہ کون سا معیار ہے کہ یوں

مغرب میں ہو قتال تو وہ جہد للبقاء
مشرق میں ہو جہاد تو ٹھہرے وہ کشت وخوں
مغرب میں فتنہ گر کو بھی آزادیٔ زباں
مشرق میں راست گوئی بھی اک حرکت زبوں
مغرب میں وہم و خبط کی بھی قدر دانیاں
مشرق میں علم وفضل کی قسمت بھی واژگوں
مغرب میں داستان بھی تاریخ کا مواد
مشرق میں واقعات بھی افسانہ و فسوں
مغرب میں ہو ہوس بھی تو فطرت کا اقتضاء
مشرق میں جوشِ عشق بھی ٹھہرے فساد خوں
مغرب میں شغلِ رقص بھی تہذیب کا نشاں
مشرق میں وحشیانہ روش ’’حرکت و سکوں‘‘
بولے نہیں یہ مشرق و مغرب کا امتیاز
ہے یہ تو صرف سطوتِ ظاہر کا اک فسوں
طاقت وروں کی عقل کے معیار میں اسد
کمزور کو کہاں ہے مجالِ چرا و چوں!

✓

تجربات جو ہیں امانت حیات کی

مشہور شاعر اور صحافی ثاقب زیروی کی روداد حیات ''تجربات جو ہیں امانت حیات کی'' کے ساقط الوزن مصرعہ کے عنوان سے ان کے ٹورنٹو میں بسنے والے صاحبزادے نے لاہور سے شائع کروائی ہے۔ اگر اصل اور صحیح مصرعہ کو عنوان کے طور پر اختیار کرلیا جاتا کہ ''وہ تجربات جو ہیں امانت حیات کی'' تو ایک بے پناہ مترنم اور صاحبِ ذوق شاعر کی روداد حیات پر کسی کو انگشت نمائی کا موقعہ نہ ملتا۔

ثاقب زیروی ایک بلند پایہ شاعر، مؤقر صحافی، شستہ نویس ادیب، علمِ مجلسی کے شناور، محفل آرائی میں فرد، سیاسیات کے تجربہ کار تجزیہ نگار، مردم شناس، بذلہ سنج، صاحبِ ذوق، صاحبِ اصول اور صاحبِ علم انسان تھے۔ تاریخِ اسلام اور تاریخِ ادبیات اردو پر ان کا مطالعہ ایسا تھا کہ بڑے بڑے ان کے سامنے زبان کھولنے سے گھبراتے تھے۔ تاریخِ اسلام سے ان کا شغف ایسا تھا کہ ان کے قلمی ناموں سے لکھے ہوئے مضامین پڑھ کر حیرت ہوتی تھی اور اسلامی تاریخ کے شناوروں کو ان کے تبحر پر غبطہ پیدا ہوتا تھا۔ ان کی مجلس میں بیٹھے ہوئے کسی شخص کو کبھی کسی یبوست یا خشکی کا احساس پیدا نہیں ہوتا تھا اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان کی صحافتی تربیت عبدالمجید سالک جیسے صحافی اور مطائبات نویس کی نگرانی میں ہوئی تھی اس لئے ان کی بذلہ سنجی کبھی ابتذال کے دائرہ میں داخل نہیں ہوتی تھی۔ جماعت احمدیہ کی خدمت کے لئے زندگی وقف کرنے کے بعد امام جماعت احمدیہ نے ثاقب زیروی کو سالک صاحب کے پاس تربیت کی غرض سے بھیج دیا ان کی صحافتی تربیت مکمل ہوئی تو سالک صاحب نے یہ کہہ کر انہیں امام جماعت احمدیہ کے سپرد کیا کہ ''حضور!

لیجئے سالک کا مُثنیٰ حاضر ہے'' (تجربات جو ہیں امانت حیات کی۔ صفحہ ۱۸)۔ ثاقب زیروی نے ۱۹۵۲ میں لاہور سے ہفت روزہ لاہور نکالنا شروع کیا جو آج تک ان کی وفات کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے باقاعدگی سے چھپ رہا ہے۔ روداد حیات میں اس پرچہ کو پیش آنے والی گونا گوں اور متنوع مشکلات کا ذکر بڑی تفصیل سے ہے اور ان مقدمات کا بھی جو اس پرچہ کے ایڈیٹر اور پرنٹر کو بھگتنا پڑے۔ جمہوری دور ہو یا مارشل لاء کی حکومت ثاقب زیروی اور ان کا پرچہ زیرِ عتاب ہی رہے کیونکہ یہ پرچہ جماعت احمدیہ پر ہونے والے ظلم کی تشہیر کرنے والا واحد پرچہ تھا دوسرے نام نہاد حق گو پرچے جماعت احمدیہ کا ذکر آتے ہی چپ سادھ لیتے تھے۔

اس حق گوئی کا ایک نقصان ثاقب زیروی کو یہ ہوا کہ ان کو ریڈیو ٹی وی پر ہونے والے مشاعروں میں شرکت کرنے سے روک دیا گیا بلکہ عام عوام بھی انہیں مشاعروں میں بلانے سے ابا کرنے لگے۔ حالانکہ ثاقب زیروی تقسیم ملک سے قبل بھی مشاعروں کے مقبول شاعر تھے مگر پاکستان کے قیام کے بعد تو ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ انجمن حمایت اسلام کے مشاعروں میں لوگ ان کے کلام کے منتظر رہتے تھے۔ خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل پاکستان تو ان کے ایسے شائق تھے کہ انہیں کسی مشاعرہ میں شرکت کی دعوت دی جاتی تو ان کا پہلا سوال یہ ہوتا کیا ثاقب زیروی آرہے ہیں؟ لاہور کراچی چاٹگام ہر جگہ انہیں بلایا جاتا تھا اور اہلِ ذوق انہیں ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ ان کی اس پذیرائی سے حفیظ جالندھری بڑے نالاں تھے۔ مشرقی پاکستان کے ایک مشاعرہ میں دونوں بلائے گئے۔ اگلے روز ایک اخبار نے سرخی جمائی ''شاعر مرزائیت کا بنگال میں ورود''۔ اس مشاعرہ کے منتظم این ایم خان کمشنر چاٹگام اور اے ڈی اظہر فنانشل ایڈوائزر ریلوے تھے صدارت خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل پاکستان کی تھی۔ اس سرخی سے سرکاری حلقوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ ایڈیٹر سے باز پرس ہوئی تو اس نے جواب دیا یہ خبر ''حفیظ جالندھری نے انہی لفظوں میں بھجوائی تھی'' (صفحہ ۱۷)۔ حفیظ صاحب کے بارہ میں تازہ ترین روایت تو کشور ناہید کی آئی ہے۔ صوفی تبسم والے مضمون میں لکھتی ہیں کہ ''حفیظ کا نام سن کر صوفی صاحب کے منہ کا ذائقہ خراب ہو جاتا تھا'' (شناسائیاں رسوائیاں۔ صفحہ ۱۳) کیونکہ انہوں نے تاشقند سے واپسی پر فیض کے خلاف

بہت باتیں کی تھیں۔ فیض صاحب نے حسبِ روایت کوئی جواب نہ دیا (جوابِ جاہلاں باشد خموشی) مگر صوفی صاحب نے پھر حفیظ سے کبھی بات تک نہیں کی۔ اب دونوں وہاں ہیں جہاں ہماری زجر وتوبیخ یا تعریف وتحسین انہیں کوئی گزند پہنچا سکتی ہے نہ فائدہ دے سکتی ہے۔ اس لئے اس موضوع سے گریز ہی مناسب ہے۔

احمدیت کے بارہ میں انہیں کس قدر غیرت تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایئے ''۱۹۴۷ کے اواخر میں ایک دن میں نے اپنے اساتذہ (یعنی مولانا عبدالمجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر) کو امیر شریعت احرار سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی دعوت چائے میں شریک ہونے کا پروگرام بناتے دیکھا۔ جب بات طے ہوگئی کہ یہ دونوں حضرات دفتر انقلاب سے نکل کر تانگہ پر دہلی دروازہ سے باہر مجلس احرار کے مرکزی دفتر میں جائیں گے تو میں نے عرض کیا کہ کیا میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں؟ وعدہ کرتا ہوں کہ وہاں بھی اسی طرح گم سم بیٹھا رہوں گا جس طرح روزانہ یہاں ڈیوٹی دیتا ہوں۔ مولانا مہر نے اس پر تشویش بھری نگاہوں سے سالک صاحب کی طرف دیکھا تو انہوں نے کہا ''ہم وہاں پہنچتے ہی کہہ دیں گے کہ اسے غیر حاضر سمجھیں یہ صرف ہماری باتیں سنے گا دخل کسی بات میں نہیں دے گا۔۔۔۔ میں نے چائے کے دوران میں بھی اور بعد میں بھی محسوس کیا کہ شاہ صاحب مجھے تشویش بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ شاید انہیں میرے چہرے مہرے سے کچھ شک گذر رہا تھا حتیٰ کہ انہوں نے سالک صاحب سے میرے بارے میں دریافت کر ہی لیا کہ یہ کون ہیں؟ جواب دیا گیا ''یہ نوجوان انقلاب میں صحافت کی عملی تربیت لے رہا ہے آپ یہی سمجھیں یہ یہاں موجود نہیں ہے، ہم اسے اسی شرط پر یہاں لائے ہیں یہ ہماری کسی گفتگو میں دخل انداز نہیں ہوگا بس اسے اپنا یا ہمارا ''سامع'' سمجھیں۔'' خوش گپیاں ہی نہیں پھکڑ تلتے رہے سیاست دانوں کے لطیفے، اخبار والوں کے لطیفے، مقرروں کے لطیفے ایک سے ایک بڑھ کر۔ مگر شاہ صاحب ہر نئی بات شروع کرنے سے پہلے میری طرف ضرور دیکھتے یہاں تک کہ اپنی ایک تقریر کے اثرات بیان کرنے سے قبل انہوں نے براہ راست مجھ سے دریافت کیا'' صاحبزادے کیا تم نے میری کوئی تقریر سنی ہے''؟ میں جواب مین خاموش رہا جب انہوں نے دوبارہ سوال کیا تو میں نے سالک صاحب کی طرف مستفسرانہ انداز میں دیکھا ''اگر سنی ہے تو بتا دینے میں کوئی حرج نہیں انہیں بتا دو'' انہوں نے فرمایا۔ میں نے عرض کیا ہاں ایک دفعہ ایک ثانیہ کے لئے سنی تھی اس کے بعد زندگی میں کبھی خواہش پیدا نہیں ہوئی''۔ شاہ صاحب یہ جواب سن کر قدرے پریشان ہوئے میرے بزرگ استاد بھی خاموش ہو گئے۔ چند کروٹیں لینے کے بعد شاہ صاحب نے دوسرا سوال داغ دیا ''وہ تقریر آپ نے کہاں سنی تھی اور میں نے کیا کہا تھا جو آپ اس کے بعد میری تقریروں سے ہمیشہ کے لئے بیزار ہو گئے''؟ سالک صاحب نے جواب دینے کی اجازت دی تو میں نے کہا ''ایک دفعہ میں فیروز پور سے قصور آ رہا تھا اور قصور کے چیف ایگزیکٹو افسر چوہدری عبداللہ خاں کے بنگلے کی چھت پر سویا ہوا تھا پاس کی منڈی میں مجلس احرار کے زیر اہتمام آپ کی تقریر ہو رہی تھی۔ میری آنکھ کھلی تو میں نے آپ کو یہ کہتے سنا ''مینوں تاں جے اللہ میاں آپ آ کے آکھے کہ عطاء اللہ مرزا غلام احمد سچا اے تے میں آکھاں گا اللہ میاں توں جھوٹا ایں اوہ سچا نہیں ہو سکدا'' (نقل کفر کفر نباشد) اس پنجابی فقرہ کا ترجمہ یوں ہے کہ ''اگر اللہ میاں خود مجھ سے آ کر کہے کہ عطاء اللہ مرزا غلام احمد سچا ہے تو میں کہوں گا اللہ میاں تم جھوٹے ہو مرزا غلام احمد سچا نہیں ہو سکتا''۔ میں نے لاحول پڑھی اور کروٹ بدل کر سو گیا کہ جو شخص اپنے آپ کو خدا سے افضل سمجھتا ہے آئندہ اس کی تقریر نہیں سنوں گا'' (صفحہ ۴۳-۴۴) تمام ادب آداب اور رکھ رکھاؤ سے کوئی اور یہ بات کہہ سکتا تھا؟ اور اپنے ان اساتذہ کی موجودگی میں جن کے سامنے بڑے بڑوں کے زہرے آب ہوتے تھے۔

ان کی رسائی سرکار دربار تک تھی مگر انہوں نے کبھی اپنے لئے یا اپنے اخلاف کے لئے کسی کا احسان نہیں اٹھایا۔ سرکاری افسران سے بے تکلفانہ ملتے تھے مگر کوئی سرکاری افسران سے کوئی سبک بات نہ کر سکتا تھا۔ ثاقب صاحب اپنے تمام تر اوصاف کو احمدیت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ہم نے بڑے بڑے ججوں وکیلوں وزیروں سفیروں کو ثاقب صاحب کی محفل میں شامل اور ان کا کلام سنتے اور سر دھنتے دیکھا ہے۔ ججوں میں جسٹس سید نسیم حسن شاہ کی مہربانی کا ذکر تو ثاقب صاحب نے خود کیا ہے۔ ان کے خلاف حکومت نے ڈی پی آر کے تحت مقدمہ قائم کر رکھا تھا۔ یہ ضمانت

کے لئے ہائی کورٹ میں جسٹس سید نسیم حسن شاہ کی عدالت میں پیش تھے۔

''جج صاحب نے پوچھا ملزم کہاں ہے؟''

میں نے کھڑے ہو کر عرض کیا ''مائی لارڈ میں ہوں ثاقب زیروی''

فرمایا ''وہ ثاقب زیروی جو تحریک پاکستان میں ملک اور قوم کے ترانے گاتا رہا جس کی قومی نظموں کی بڑی دھوم رہی''۔

اور شریک ملزم؟

اس پر میاں محمد شفیع کھڑے ہوئے اور عرض کیا ''مائی لارڈ۔م۔ش''

فرمایا ''وہ م ش (علامہ اقبال کا سکرٹری) جو اس ملک اور قوم کے لئے دو دو دفعہ قید ہوئے''

پھر ایڈووکیٹ جنرل سے مخاطب ہو کر کہا مسٹر ایڈووکیٹ جنرل آپ کو تحریک پاکستان کے ان دو جید کارکنوں سے بہتر لوگ ڈیفنس آف پاکستان رولز کے لئے کہاں سے مل سکتے تھے۔ بہر حال ہم ابھی سماعت نہیں کر رہے انہیں گرفتار نہ کیا جائے'' (صفحہ ۱۳۴) یہ تو ان کی گرفتاری کو بلطائف الحیل ٹالنے کا ایک وسیلہ تھا ورنہ جج صاحب ڈی پی آر کے تحت دائر شدہ مقدمات میں ضمانت نہیں لے سکتے تھے۔ اس تاخیر کا یہ فائدہ ہوا کہ ان کے خلاف مقدمات واپس لے لئے گئے۔

ثاقب زیروی نے جماعت احمدیہ کی منظوم تاریخ ''دورِ خسروی'' کے عنوان سے لکھی ہے اس لئے احمدی لوگ انہیں فردوسیء احمدیت بھی کہتے ہیں مگر اس خودنوشت میں اس دورِ خسروی کا کوئی ذکر اذکار نہیں۔ شاید ثاقب صاحب نے اس لئے اس ذکر کا اخفا روا رکھا کہ یہ بات بزمرہء تعلی و تفاخر نہ گنی جائے حالانکہ حفیظ جالندھری کو دوسرے فردوسیء اسلام نہیں کہتے تھے حفیظ صاحب خود اس بات کا اعلاء کرتے پھرتے تھے جملہء معترضہ کے طور پر عرض ہے کہ ایک بار حفیظ صاحب ڈاکٹر کے پاس گئے کہ مجھے کچھ اعصابی کمزوری کی شکایت ہے اس کا کیا تدارک ہو؟ ڈاکٹر نے کہا ''ذہنی اور علمی کام سے اجتناب کریں'' حفیظ صاحب نے فوراً فرمایا ''جناب میں شاہنامہء اسلام لکھ رہا ہوں میں ذہنی کام سے مجتنب کیسے رہ سکتا ہوں'' ڈاکٹر نے کہا ''شاہنامہ آپ بے شک لکھتے رہیں میں نے صرف ذہنی کام کرنے سے منع کیا ہے''۔ وہ لڑکا جو کہ لیٹا ہے وہ لڑکی جو کہ لیٹی

ہے۔ وہ پیغمبر کا بیٹا ہے وہ پیغمبر کی بیٹی ہے پر کون سی ذہنی توانائی صرف ہوتی ہوگی؟۔ ثاقب زیروی نے ازرہِ کسرِ نفسی اپنے شاہنامہ کا ذکر تک اپنی خودنوشت میں نہیں کیا۔

اس خودنوشت سے مجھے ایک نئی بات کا علم ہوا۔ سر ظفر اللہ خان کی خودنوشت تحدیثِ نعمت کے عنوان سے چھپی ہے۔ اب آ کے معلوم ہوا ہے کہ چوہدری صاحب اس خودنوشت کا نام ''بے کم و کاست'' رکھنا چاہتے تھے مگر ثاقب زیروی کو یہ عنوان پسند نہ آیا کیونکہ ان کے نزدیک بے کم و کاست گفتنی ناگفتنی اور رطب و یابس کا مترادف بھی سمجھا جاتا ہے۔ چوہدری صاحب نے اس بات پر صاد کیا اور ثاقب زیروی کے مجموعہء کلام شہابِ ثاقب کے دیباچہ کا عنوان تحدیثِ نعمت ان سے مانگ لیا۔ (صفحہ ۲۹۴) چوہدری صاحب کی خودنوشت کا اس سے بہتر عنوان شاید ممکن نہ ہوتا اور ثاقب زیروی کے لئے بجا طور پر یہ قابلِ فخر بات ہے مگر ثاقب صاحب نے اس بات کا ذکر سرسری طور سے کیا ہے۔ یہ بڑے اعلیٰ ظرف لوگوں کا حوصلہ ہوتا ہے۔ انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلہ ہیں زیاد۔ غرض یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر پڑھنے والا مصنف کو اپنے عقائد پر ثابت قدمی دکھانے اور ہر اونچ کو جھیل جانے پر داد دے۔ اور آخر میں ثاقب زیروی کا ایک شعر۔

پروانہ بھی شہید گل و غنچہ بھی شہید۔ کس کس جگہ سے خاکِ شہیداں اٹھایئے۔

میں تو بھارتی جاسوس نہیں تھا

پاک فوج کے ایک افسر میجر محمد اکرم خاں کی سنسنی خیز خودنوشت ''میں تو بھارتی جاسوس نہیں تھا'' کے عنوان سے ۲۰۰۲ میں آکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے شائع کی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دسمبر ۱۹۹۶ میں چھپا تھا جس میں یہ ساری داستان موجود تھی مگر اس وقت بھی کسی نے اس میں بیان کردہ حقائق کو جھٹلانے کی کوشش نہیں کی جس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی کو اس کتاب کے مندرجات غلط معلوم نہیں دئے۔ میجر محمد اکرم خان' پاکستان آرمی کے ایک نہایت ہی محبِّ وطن' نیک سرشت' قابل اور ملنسار فوجی افسر تھے۔ ان کے کاکول کے ساتھیوں میں جنرل مجیب الرحمٰن بھی تھے جو لفٹیننٹ جنرل کے عہدے تک پہنچ کر ریٹائر ہوئے مگر یہ فوجی افسر کسی حاسد کے حسد کا شکار ہو کر بھارتی جاسوس ہونے کے الزام میں ملوث کیا گیا اور انتہائی جبر وتشدد اور تعذیب کا نشانہ بنایا گیا اور اس سے ناکردہ گناہ کا اعتراف کروا کے اس کو فوجی عدالت سے ناکردہ جرم کی پاداش میں سزائے موت سنادی گئی۔ سزائے موت کے سائے میں لمبا عرصہ گذارنے کے بعد ان کی سزا عمر پہلے عمر قید میں تبدیل کی گئی اور بعد ازاں سولہ سال کی قید بھگتنے کے بعد انہیں رہا کر دیا گیا۔ میجر محمد اکرم خاں نے یہ ساری روداد خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھی ہے۔ یہ سرگزشت ایک مظلوم افسر کی سرگزشت ہی نہیں اس دنیا کے عاقبت نااندیش' حاسد اور بے گناہوں کو سزا دلوا کر خوشی محسوس کرنے والے اذیت پسند لوگوں کی روداد بھی ہے جو بظاہر کامیاب وکامران ہوتے چلے جاتے ہیں مگر آخر قدرت کے انتقام کا نشانہ بنتے ہیں۔ خدا کے ہاں دیر تو ہوسکتی ہے اندھیر نہیں ہوتا۔ جب ان کے مقدمہ کی سماعت ہونے لگی تو مارشل لاء کورٹ میں پیش ہونے سے وکلاء ڈرتے تھے اس وقت بھی ہمارے کوئٹہ کے دوست خالد ملک کے والد گرامی جناب کرم الٰہی ایڈووکیٹ سامنے آئے

اور نہایت ہمدردی اور دیانت داری سے کیس کی پیروی کی۔ جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار۔

میجر محمد اکرم خاں اپنے سپاہیوں اور ساتھیوں میں ہر دلعزیز سمجھے جاتے تھے۔ گھر بار سے اچھے خاصے خوش حال زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اتفاق یوں ہوا کہ جنرل یحییٰ اور جنرل حمید ان کے گاؤں کے قریب کسی فوجی مشق کا معائنہ کرتے ہوئے آئے۔ میجر اکرم خان نے انہیں شکار کھیلنے کی دعوت دی جو دونوں نے قبول کرلی شکار ہوا' دونوں جرنیل خوش وخرم واپس ہوئے مگر ان کی قسمت کا پہیہ گردش میں آگیا۔ کسی جعلی سورس رپورٹ کی بنا پر انہیں بھارتی جاسوس ہونے کا ملزم گردانا گیا۔ صدر ایوب کو جب ایسی رپورٹ پہنچی تو ان کے منہ سے غصہ کے عالم میں نکلا ایسے شخص کو پھانسی چڑھادو۔ چنانچہ ان کے افسران جن میں کرنل غفار مہدی کا نام میجر صاحب نے بار بار لیا ہے اسی مفروضہ بنیاد پر ان کے خلاف تحقیقات کرنے لگے اور دھوکہ دھانس دھاندلی کے علاوہ ان پر بے پناہ غیر انسانی تشدد کر کے ان سے اقبالی بیان حاصل کیا گیا۔ جس کی بنا پر انہیں فوجی عدالت نے سزائے موت سنائی اور یہ سزا صدر ایوب نے کنفرم بھی کردی۔ کتاب کے ٹائیٹل پر صدر ایوب کے اس حکم نامہ کی تصویری نقل شائع کی گئی ہے مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے اللہ تعالیٰ کو اپنے ایک بے گناہ بندے کو بچانا مقصود تھا ان کی سزائے موت التوا میں پڑتی رہی اس دوران ان کے ماں باپ' ان کی بیوی اور خاندان کے دیگر افراد جس اذیت سے دوچار رہے اور اللہ تعالیٰ سے ایک بیگناہ کی بریت کی دعائیں کرتے رہے وہ الگ سے ایک داستان ہے۔ میجر صاحب نے بھی اپنی بے گناہی پر نظر کر کے اپنی کوششیں ترک نہیں کیں اور انہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہمیشہ ہی بھلائی کی توقع رہی۔ راقم الحروف کے علم میں تین ایسے ہی بے گناہ دوستوں کا کیس بھی ہے جنہیں ضیاء الحق کے مارشل لاء میں مسجد کا دفاع کرنے جرم میں سزائے موت سنائی گئی اور ضیاء اس سزائے موت کو کنفرم کر دینے کے باوجود اس پر عمل درآمد نہیں کروا سکا تا آنکہ اس کی اپنی عقوبت کا فرمان آسمان سے جاری ہوگیا۔ خدا کا اپنا قانون' ہے جس پر کسی انسان کی اجارہ داری نہیں اور ضیا کے ہیبت ناک انجام کو تو بے نظیر بھٹو نے بھی اپنی کتاب دخترِ قسمت یعنی Daughter of Destiny میں ''عذابِ الٰہی سے موسوم کیا ہے''۔ (صفحہ ۳۸۲)

میجر اکرم کی کہانی سولہ سال کی اذیت کے بعد ختم نہیں ہوگئی بلکہ جاری رہی۔انہوں نے اپنے دوستوں مہربانوں کے ذریعہ اپنی بریت اور بحالی کی کوششیں جاری رکھیں ۔ جنرل مجیب الرحمن نے کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ’’ضیاء الحق نے بھی مصلحت کی خاطر انصاف کو قربان کر دیا‘‘ (صفحہ۳) اور انہیں بحالی کے ساتھ تمام مراعات واحترام دینے سے انکار کر دیا مگر آخر کو میجر صاحب ’’۱۹۷۸ میں فیڈرل گورنمنٹ میں بحال ہوئے اور ۱۹۸۹ تک انہوں نے باوقار عہدوں پر خدمات سرانجام دیں‘‘ (بیک ٹائیٹل)۔وہ کرنل غفار مہدی جن کا نام لے کر میجر صاحب نے انہیں اس کتاب کا اہم کردار اور درندہ صفت لوگوں کا سرغنہ نامزد کیا تھا ۶۵ کی جنگ میں نااہلی کی بنا پر فوج سے رخصت کئے گئے۔

میجر اکرم نے اپنے عزیزوں اور اپنی بیوی کی جاں توڑ کوششوں کا ذکر بڑی احسانمندی کے جذبات سے کیا ہے کہ ان لوگوں نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔فیلڈ مارشل ایوب سے ملنے کے لئے اور انہیں اکرم کی بے گناہی کا یقین دلانے کے لئے سیاست دانوں کا ایک وفد بھی ترتیب دیا گیا جن کے سربراہ چوہدری ظہور الٰہی تھے وفد نے جنرل برکی کی وساطت سے فیلڈ مارشل سے انٹرویو کی درخواست کی۔جنرل برکی نے ملاقات کا مقصد معلوم ہونے پر کہا کہ ’’اکتوبر ۱۹۶۱ میں جب جنرل موسیٰ نے ایوب کو مبینہ سورس رپورٹ دکھائی تو ان کی موجودگی ہی میں فیلڈ مارشل پر سکتہ طاری ہوگیا ان کے منہ سے دو ہی الفاظ ’’ہینگ ہم‘‘ برآمد ہوئے۔۔۔ یہ دو الفاظ ہی میری تباہی کا باعث بنے کیونکہ فیلڈ مارشل کی طرف سے میرے قتل کے حکم کو (معاذ اللہ) قرآن کا حرف سمجھا گیا‘‘ (صفحہ ۲۳۵) اور سرتوڑ کوشش کی ملزم بے گناہ بھی ہو تو فیلڈ مارشل کے حکم کو سچ ثابت کر کے دکھایا جائے خواہ اسے برفیلی راتوں میں الٹا ہی لٹکانا پڑے۔

ان کی بیوی فیلڈ مارشل کی والدہ سے ملنے ریحانہ پہنچیں۔انہوں نے اکرم کی داستان سن کر اپنے بیٹے کو ایک خط لکھوایا ’’اگر اس بچے کو پھانسی ہوگئی تو عرش ہل جائے گا اور ساتھ ہی تمہاری اپنی بنیاد بھی۔پھر انہوں نے خط پر اپنا انگوٹھا ثبت کیا اور پوسٹ کرنے کے لئے ایک مخصوص ایڈریس بتایا جو صرف ماں جی کے لئے تھا‘‘ (صفحہ ۲۳۴)۔

کتاب میں جو ضمیمے شامل کئے گئے ہیں ان میں میجر سعید ٹوانہ کا ایک بیان حلفی بھی شامل ہے کہ میجر رضا نے انہیں بتایا کہ اس نے اس وقت کے کیپٹن اکرم کو لاہور مارشل لا ہیڈکوارٹر میں محض ایک پوسٹ کا چارج لینے سے روکنے کے لئے اپنے ایک عزیز کے ذریعہ ایک جعلی سورس رپورٹ کا ڈول ڈالا جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ کیپٹن اکرم کو ناقابلِ اعتبار بنا دیا جائے۔مگر وہ سورس رپورٹ جو اس نے اپنے عزیز کے ذریعہ ڈپلومیٹک بیگ کے توسط سے ماسکو سے پاکستان بھجوائی تھی اکرم کی گردن کا پھندا بن گئی۔اور اس بات پر وہ ساری عمر پچھتاتا رہا ہے اور اب وہ چاہتا ہے کہ اکرم سے معافی مانگے مگر اس اعتراف کے چند روز بعد ہی وہ اچانک فوت ہو گیا۔میجر سعید ٹوانہ نے یہ بیان حلفی آئی ایس آئی کی تحقیقاتی کمیٹی کے روبرو دیا تھا اس کی فوٹو کاپی ضمیمہ میں شامل ہے۔ضمیمہ میں جناب اے کے بروہی اور جنرل راحت لطیف کا بیان بھی شامل ہے۔غرض ان بیانات اور تحقیقات کی روشنی میں میجر اکرم کی بحالی ہوئی اور جب انہیں پنجاب میں ایک سرکاری عہدہ پر متعین کیا گیا تو لوگوں کی طرف سے اس بات پر احتجاج بھی ہوا کہ جاسوسی کے الزام میں سزائے موت پانے والے کو اس طرح معزز عہدوں پر فائز کیوں کیا جارہا ہے۔قومی اسمبلی میں بھی میجر اکرم کی صفائی پیش کی گئی۔غرض اس کتاب کا لب لباب یہ ہے کہ بے گناہ بری تو ہو جاتے ہیں لیکن دنیا میں ان کے وقار اور عزت کو بحال کرنا بہت مشکل ہوتا ہے اور بڑی ثابت قدمی اور جرات چاہتا ہے۔

کتاب کے آغاز میں تعارف کے عنوان سے لکھا ہے ’’اس خودنوشت میں عدلیہ کی بے بسی، قومی اسمبلی میں ظلم کی صدائے بازگشت اور اس کی بے اختیاری، قومی صحافت پر زردی کا نکھار اور اس کی بے جہت حب الوطنی کی بے نیازی کی دلخراش جھلک بھی شامل ہے تلاشِ عدل کے اس مسافر کی اس خودنوشت کا آخری باب اس وقت تک طبع نہیں کیا جاسکتا جب تک یہ اربابِ اقتدار کو اس حد تک جھنجوڑ نہ دے کہ وہ عدل وانصاف کے تقاضے پورے کرنے پر مجبور نہ ہو جائیں‘‘۔

میجر اکرم کی یہ سرگزشت محض سنسنی خیز ہی نہیں سبق آموز سرگزشت بھی ہے کہ فوج میں کس طرح ایک معمولی سا اقدام دوسرے کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن جاتا ہے۔

لخت لخت داستان

''لخت لخت داستان'' کو بریگیڈیئر ریٹائرڈ محمد اسمٰعیل صدیقی صاحب ''کچھ آپ بیتی کچھ جگ بیتی'' کہا ہے۔ اس خودنوشت میں ان کے والدین کا ذکر بھی ہے اور دوستوں بزرگوں کا بھی۔ خودنوشت کا ایک اسلوب احوال الرجال کا اسلوب ہوتا ہے جیسے عبدالمجید سالک صاحب کی سرگزشت کا ہے یا مشتاق احمد یوسفی کی زرگزشت کا۔ صدیقی صاحب نے اسی اسلوب کا سہارا لیا ہے۔ اس میں ان کے ملٹری کے ساتھیوں دوستوں ادیبوں کا بھی ذکر ہے ضمیر جعفری کا۔ کرنل محمد خاں کا۔ جنرل شفیق الرحمٰن کا۔ مصور مشرق عبدالرحمٰن چغتائی کا' پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر کا' پروفیسر عزیز احمد کا اور مسترزادتلوک چند محروم کا ذکر خیر۔ اس طرح ان کی خودنوشت اہلِ ذوق کے لئے خاصی دلچسپی کی چیز بن گئی ہے۔ ان کا اسلوب بھی صاف ستھرا نکھرا ہؤا اسلوب ہے اور پڑھنے میں رواں دواں۔ اگر اس کتاب کی کتابت اتنی باریک نہ ہوتی تو کتاب کے حجم میں تو اضافہ ہو جاتا مگر پڑھنے والے انہیں دعائیں دیتے۔ صدیقی صاحب کا کہنا ہے کہ ''اب اسے مکمل کرنے کے بعد لوٹ کر دیکھتا ہوں تو لگتا ہے یہ داستان تو تمام تر میری رہی ہی نہیں ۔۔۔ یہ تو بہت سی کہانیاں ہیں جو یاد آئیں تو آتی چلی گئیں'' (لخت لخت داستان صفحہ ۸)۔

راولپنڈی ہمارا ابھی آبائی وطن ہے اور اس شہر سے ہمارا ابھی جذباتی تعلق ہے۔ لال کرتی کے مردم خیز علاقہ کو ہم نے بھی خوب چل پھر کر دیکھا ہؤا ہے مگر ہمیں اس خطہ میں رہنے والوں میں تلوک چند محروم کے سوا کسی سے ادبی روشناسی نہیں رہی۔ نور جہاں کے بارہ میں محروم صاحب کی نظم کا حوالہ صدیقی صاحب نے دیا ہے کہ ''برمزار ما غریباں نے چراغِ نے گلے'' (صفحہ ۳۲) یہ نظم

خود نور جہاں کی ہے محروم صاحب کی نہیں۔ محروم صاحب کا کلاسیکی شعر تو یوں ہے۔ ''دن کو بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے۔ کہتے ہیں یہ آرام گہِ نورِ جہاں ہے۔''

اس کتاب میں نیرنگیءدنیا کے سلسلہ میں کرنل محمد خاں کو اواخرِ عمر میں اپنے اخلاف کے ہاتھوں پیش آمدہ حادثہ کا پڑھ کر بہت دکھ ہؤا کہ ان کی اولاد نے انہیں مکان سے بےدخل کر دیا اور کرنل صاحب کے آخری دن بہت اذیت میں کٹے۔ ''مکان بنانے پر زندگی صحت صبر وسکون جس حد تک قربان ہوئے ان کا تو کوئی حد وحساب نہیں۔ مکان مکمل ہوتے ہی کرنل صاحب نے کمال شفقتِ پدری کے تحت وہ مکان بیٹے کے نام کر دیا اور اس میں خود رہائش اختیار کر لی۔ چند سال تو اس میں ٹھیک گذرے پھر ان پر دباؤ پڑنا شروع ہؤا کہ مکان خالی کر دیں۔۔۔ جی ہاں مکان خالی کر دیں۔ یہ حالت کئی سال جاری رہی اور تلخیءایام کا ان دنوں اعادہ ہو جاتا جب بیٹا بیرون ملک سے گرمیوں کی چھٹیاں گذارنے آتا اور آکر مکان ہی میں قیام کرتا۔۔۔ ۱۹۹۸ کی ایک صبح مجھے ان کا فون موصول ہؤا کیا تم تھوڑی دیر کے لئے میرے ہاں آ سکتے ہو؟ میں نے پوچھا کب؟ کہنے لگے ابھی۔۔۔ ان کے ہاں پہنچ کر میں نے ان کے کمرے پر دستک دی تو میری حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ برسہا برس کے تعلقات میں میں یہ پہلی بار دیکھا تھا کہ انہوں نے دروازے کو اندر سے بولٹ کر رکھا تھا۔ اندر داخل ہؤا تو وہ ایک حیرانی پریشانی اور خوف کے عالم میں مبتلا بیٹھے تھے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہؤا کہ اب کی ایک بار پھر ان پر گھر خالی کرنے کا دباؤ ہے اور اب اس دباؤ میں اضافہ کرنے کے لئے ان کے بیٹے کے سسرالی عزیزوں کے جوان لڑکوں نے نہ صرف ان سے بدتمیزی اور بدکلامی کی ہے بلکہ ہتھیار بند نیچے سے اوپر دندناتے پھرتے ہیں ۔۔۔۔۔ اور انہیں مجبوراً چھ ستمبر ۱۹۹۸ کو اپنے ہاتھ سے تنکا تنکا جمع کر کے بنائے گئے آشیانے کو خیرباد کہنا پڑا (اور وہ کرائے کے مکان میں منتقل ہو گئے)۔۔ اس سانحہ کے بعد وہ صرف تیرہ ماہ حیات رہے'' (صفحہ ۲۱۳-۲۱۴)۔ ایسا ہی سلسلہ لاہور کے ادیب، مرزا ادیب کے ساتھ ہؤا تھا۔ کرنل صاحب تو مالی لحاظ سے اپنی اولاد کے دست نگر نہ تھے مرزا ادیب تو مالی لحاظ سے اولاد پر انحصار رکھتے تھے۔ ان کی اولاد نے اپنے عظیم باپ کی عظمت کا لحاظ نہ کیا۔ اس سے بھی زیادہ المیہ

سر سید کا ہے کہ ان کے نامور بیٹے جسٹس سید محمود نے فاتر العقل ہونے کے زمانہ میں باپ کو گھر سے نکال دیا تھا اور ان کا انتقال نواب اسماعیل خاں دتاولی کے ہاں ہوا اور تدفین کے اخراجات نواب محسن الملک نے یہ کہہ کر ادا کئے کہ ''یہ سید صاحب کا آخری چندہ ہے وہ پھر کب چندہ مانگنے آویں گے'' (آپ بیتی میر ولایت حسین صفحہ ۱۲۴)

غرض صدیقی صاحب نے یہ المناک واقعہ درج کر کے ادب کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ محفوظ کر دیا ہے۔ ہمارے ہاں لوگ ایسی باتوں کا اخفا روا رکھتے ہیں مگر تاریخ اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ ایسے ناخوش گوار واقعات کو بھی بیان کر دیا جائے تا کہ ادب کی تاریخ ہر پہلو پر حاوی رہے۔ سر سید کے اواخر زندگی کا تذکرہ بھی میر ولایت حسین نے محفوظ کیا۔ ان سے قبل سر رضا علی نے اپنی خود نوشت نامہء اعمال میں سر سید کی وفات کے بعد ہونے والے ٹرسٹیوں کے اجلاس کی روداد بیان کی تھی جس میں محسن الملک کو سکرٹری منتخب کیا گیا تھا (کیونکہ سید محمود اختلال دماغ کی وجہ سے کام کے اہل نہ تھے) تو سید محمود بھر گئے تھے اور قانونی کارروائی کی دھمکی دیتے ہوئے ہال سے باہر نکلے تھے سید محمود کو راضی کرنے کے لئے محسن الملک نے اپنی ٹوپی ان کے قدموں میں ڈال دی تھی۔ ایسی چیزیں مستقبل کے لوگوں کے لئے سبق آموز ہوتی ہیں اس لئے ان کا اخفاء کرنے کی بجائے ان کا اعلاء کرنا چاہیئے۔ اس امر پر صدیقی صاحب داد کے مستحق ہیں۔

والد محترم کے حالات میں ان کا ایک فقرہ آپ نے درج کیا ہے کہ ''میرے بھائیوں نے یوسف کے بھائیوں جیسا سلوک میرے ساتھ کیا'' (صفحہ ۱۶۶) یہ پڑھ کر ہمیں اپنی بات یاد آئی۔ ۱۹۹۲ میں سویڈن میں ہمارا دل کا بائی پاس اپریشن ہوا۔ ہمارے ایک دوست یوسف ایاز تک یہ خبر پہنچی تو آپ نے ہمیں عیادت نامہ لکھا اور نیچے لکھ دیا

''آپ کا بھائی یوسف''۔ ہمارے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم نے انہیں لکھا دوستی اپنی جگہ عیادت اپنی جگہ مگر ہم ہرگز ہرگز آپ کے بھائی نہیں ہیں کیا آپ نے ہمیں برادرِ یوسف سمجھ رکھا ہے''۔

صدر ایوب کے زوال کے بعد لوگ ان کے بارے میں بری باتیں تو لکھتے ہیں اچھی

باتوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ صدیقی صاحب نے لکھا ہے کہ صدر ایوب کے دونوں بیٹوں اختر ایوب اور گوہر ایوب نے لوئر اردو کا امتحان پاس نہیں کیا تھا اس لئے ان کی ترقی نہیں ہو سکتی تھی۔ صدر ایوب نے دونوں کو متنبہ کیا کہ وہ دونوں امتحان پاس کریں ورنہ وہ انہیں گھر سے نکال دینگے۔ دونوں ان کے پاس آئے اور ان کی کلاسوں میں شامل ہو کر امتحان پاس کر لیا۔ لکھتے ہیں ''قابل تعریف بات یہ ہے کہ جنرل محمد ایوب خاں کمانڈر انچیف پاکستان آرمی نے اپنی تمامتر انسانی خامیوں یا خوبیوں کے باوجود اس کام کے لئے جی ایچ کیو میں اپنے ماتحت عملے میں سے کسی کو اشارہ تک نہیں کیا حتیٰ کہ ڈائریکٹر آرمی ایجوکیشن کو بھی نہیں'' (صفحہ ۱۸۷) اس سلسلہ میں ہم بھی ایک بات درج کرتے ہیں۔ حال ہی میں کپٹن گوہر ایوب صاحب کی خود نوشت ایوان اقتدار کی کچھ جھلکیاں کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ کیپٹن صاحب اس میں رقم طراز ہیں کہ جب ''آپ اپنے ابا کے اے ڈی سی تھے تو ابا کے ساتھ کھانا کھانے کا بل انہیں اپنی جیب سے ادا کرنا پڑتا تھا'' (ایوان اقتدار کی کچھ جھلکیاں صفحہ ۴۱)۔

ضمیر جعفری اور شفیق الرحمٰن کی باتیں تو ایک قریب کے دوست کی باتیں ہیں۔ شفیق الرحمٰن سے ان کی پہلی ملاقات یول کیمپ میں ہوئی تھی جہاں ان کے والد محترم اطالوی قیدیوں کے کیمپ میں اشیائے ضرورت کی فراہمی کے ذمہ دار تھے اور شفیق الرحمٰن وہاں ڈاکٹر تھے۔ پنڈی میں ان کی ملاقاتیں کبھی کرنل محمد خاں کے غرفہ میں ہوتیں کبھی کہیں اور۔۔۔ شفیق الرحمٰن کے ایک فقرہ نے بہت لطف دیا۔ کسی نے پوچھا سر آپ روزانہ لکھتے ہیں۔ کہنے لگے ''چاہتا تو ہوں مگر پڑھنا لکھنے نہیں دیتا'' (صفحہ ۱۲۴)

ضمیر جعفری پر ہماری اپنی یادیں اتنی پیاری یادیں ہیں کہ ان کا ذکر پڑھ کر بہت لطف آیا۔ اور وہ ضمیر جن کے بارہ میں ان کے صاحبزادے جنرل احتشام ضمیر نے خوب لکھا ہے کہ ''آپ کا ضمیر میرا بھی تو ہے'' (صفحہ حاشیہ ۱۲۶) ہم بھی صدیقی صاحب سے یہی کہتے ہیں ضمیر میرا بھی تو ہے۔ لخت لخت داستان اردو کی اچھی خود نوشتوں میں شمار کی جائے گی۔

✓

ایوان اقتدار کی کچھ جھلکیاں

گوہر ایوب خان خلف فیلڈ مارشل ایوب خاں کی خودنوشت Glimpses into the corridors of power کے یعنی ''ایوان اقتدار کی کچھ جھلکیاں'' کے عنوان سے آکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے ۲۰۰۷ میں شائع کی ہے۔ گوہر ایوب، فیلڈ مارشل مرحوم کے دوسرے صاحبزادے ہیں اور اپنے والد محترم کی بدنامی اور ان کے زوالِ اقتدار کا بڑا سبب سمجھے جاتے تھے۔ اپنے باپ کی زندگی ہی میں سیاسیات اور مالی بدعنوانیوں میں ملوث ہونے لگے اور فوج سے مستعفی ہوکر اپنے ابا کے ایما پر اپنے چچا سردار بہادر خاں کو اسمبلی سے دور رکھنے کے لئے ان کی جگہ قومی اسمبلی کے رکن بنے۔ سردار بہادر خاں صدر ایوب کے سب سے بڑے نقاد تھے اور ان کا وہ بیان تو زبان زد عوام وخواص ہے کہ انہوں نے اسمبلی کے قائد حزب اختلاف کی حیثیت سے کہا ''ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے انجام گلستاں کیا ہوگا''۔ صدر ایوب اپنے بھائی کی اس تلخ صاف گوئی کو برداشت نہ کر سکے اور بقول گوہر ایوب ''۱۹۶۴ کے وسط میں ابا نے مجھے کراچی سے بلایا کہ وہ اپنے بھائی کے قائد حزب اختلاف ہونے کی صورت حال زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے اس لئے مجھے ان کی جگہ ۱۹۶۵ کے الیکشن میں ہزارہ سے حصہ لینا ہوگا۔ میں نے اختر ایوب کا نام لیا کہ وہ زیادہ مناسب ہوگا مگر ابا نے کہا بعض اوقات اولاد کو والدین کی خوشنودی کی خاطر وہ کام بھی کرنا پڑتا ہے جو انہیں پسند نہ ہو''۔ (ایوان اقتدار کی بعض جھلکیاں۔ صفحہ ۸۶)

فوج سے مستعفی ہونا عام آدمی کے لئے اتنا آسان نہیں ہوتا کیونکہ فوج ایک افسر کی تربیت پر بے پناہ خرچ کرتی ہے اور کیڈٹ کو فوج میں داخل ہونے پر ایک عہد نامہ بھرنا پڑتا ہے کہ اگر وہ ٹریننگ میں ناکام ہو جائے گا یا فوج سے الگ ہو جائے گا تو اس کے بدلہ میں اس کے

والدین کو یا گارڈین کو ایک معین رقم جو لاکھوں میں ہوتی ہے ادا کرنا پڑے گی۔ ہمیں اس کا ذاتی تجربہ یوں ہے کہ ہمارے ایک ہونہار شاگرد فوج میں شمولیت کے لئے چنے گئے۔ جب کاکول جانے کا وقت آیا تو انہیں حکم دیا گیا کہ وہ پکے کاغذ پر ایک عہد نامہ اپنے والدین کی طرف سے داخل کریں کہ اگر وہ ناکام ہو گئے یا فوج کو چھوڑ گئے تو انہیں اتنا جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔ وہ بچارا بہت پریشان ہؤا کہ اس کے ابا جان نے اسے کہا ہے کہ وہ تو ایسا حلف نامہ دینے کو تیار نہیں۔ وہ عزیز پریشان ہوکر ہمارے پاس آیا۔ ہم نے اسے کہا کہ وہ پریشان نہ ہو ہم یہ حلف نامہ دینے کو تیار ہیں اور اس کے ساتھ جا کر ایک مجسٹریٹ کے سامنے اس حلف نامہ پر دستخط کر دئے۔ مجسٹریٹ صاحب بہت حیران ہوئے کہنے لگے آپ کو علم ہے کہ اگر خدانخواستہ یہ طالب علم ناکام ہو گیا یا نکال دیا گیا تو آپ پر کتنا وبال آئیگا۔ ہم نے کہا یہ طالب علم تعلیم الاسلام کالج ربوہ کا طالب علم ہے اور بہت اچھا سپورٹس مین ہے یہ ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ بچہ فوج میں افسر بنا اور میجر ہوکر ریٹائر ہؤا۔ ہم حیران ہوکر یہ سوچ رہے ہیں کہ گوہر ایوب خاں صاحب تو سینڈہرسٹ تک تربیت شدہ تھے ان کی تربیت پر تو لاکھوں نہیں کروڑوں روپیہ کا خرچ آیا ہوگا کیا ان کے ابا نے وہ خرچ فوج کو واپس کیا تھا؟ اگر نہیں تو وہ اتنے اطمینان سے فوج سے کس طرح فارغ ہو گئے تھے؟ یا ان کے ابا نے اولاد پروری کے سلسلہ میں پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھ دی تھی؟ ایوب صاحب یہ بھی جانتے تھے کہ ان کو سینڈہرسٹ بھیجنے کے لئے ان کے دادا کو اپنی جائیداد کا ایک حصہ فروخت کرنا پڑا تھا مگر انہیں یہ خیال نہ آیا کہ ان کی قوم نے ان کے بیٹے کی تربیت پر کتنا اور کیا خرچ کیا ہوگا۔ کیا یہ سب کچھ سردار بہادر خاں صاحب کو اسمبلی سے باہر رکھنے کے لئے قومی مفاد کو فروخت کر دینے کے مترادف نہ تھا؟ قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند۔

گوہر ایوب خاں صاحب نے کراچی میں اپنے ابا کی فتح مندی پر جو بدنام زمانہ جلوس نکالا تھا اس میں بے پناہ کشت وخون ہؤا تھا اور لوگ اب تک اس جلوس کو نہیں بھولے مگر اس خود نوشت میں اس سانحہ کا ذکر ایسا سرسری طریق سے کیا گیا ہے گویا کچھ ہؤا ہی نہیں تھا لکھتے ہیں ''کنونشن مسلم لیگ نے ابا کی فتح پر ایک جلوس نکالا (حالانکہ کراچی کے لوگوں نے محترمہ فاطمہ جناح کو ووٹ دیا تھا) یہ لوگ مجھے میرے گھر پی ای سی ایچ سوسائٹی سے پولو گراؤنڈ لے گئے جہاں

سے جلوس شروع ہوا۔ مجھے جلوس کے روٹ کا بالکل علم نہیں تھا صرف یہ پتہ تھا کہ جلوس قائداعظم کے مزار پر ختم ہوگا۔۔۔بعض چھوٹے چھوٹے جلوس بھی تھے جن کے درمیان تصادم ہوا اور بہت سی جانوں کا ضیاع ہوا۔ایک مقامی پارٹی لیڈر اس کشت وخون کا ذمہ دار تھا'' (صفحہ ۸۵)۔روئیداد خاں جو اس وقت کراچی کے چیف کمشنر تھے لکھتے ہیں ''میں اپنے لان میں بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے بتایا گیا کیپٹن گوہر ایوب خاں صاحب صدر ایوب کی جیت کے بعد وکٹری جلوس نکال رہے تھے کہ جلوس میں اور مقامی لوگوں میں تصادم ہو گیا ہے۔۔۔قطع نظر اس کے کہ قصور کس کا تھا مجھے اعتراف ہے کہ میں کراچی کے عوام کی جان ومال کی حفاظت کرنے میں ناکام رہا اور میرا ضمیر مجھے کچوکے لگاتا رہتا ہے'' (پاکستان خواب پریشاں صفحہ ۲۱) روئیداد خاں صاحب کا ضمیر تو انہیں کچوکے لگاتا رہتا ہے مگر گوہر ایوب خاں صاحب کا ضمیر اس قتل وغارت کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال کر مطمئن ہے یا خدانہ کردہ ایسا تو نہیں کہ اس نام کی کوئی شے ان کے پاس موجود ہی نہیں؟

اس کتاب کا گیارھواں باب دسمبر ۱۹۶۴ کے انتخابات اور کشمیر کی جنگ کے بارہ میں ہے۔گوہر ایوب صاحب اس سارے پلان یعنی آپریشن جبرالٹر اور آپریشن گرینڈ سلیم کا یوں تجزیہ کر رہے ہیں جیسے آپ کوئی بہت بڑے فوجی مبصر یا نقاد ہوں حالانکہ ان کی حیثیت صرف ایک ریٹائرڈ کیپٹن کی تھی جو اتفاق سے صدر مملکت کا بیٹا تھا۔اپریشن جبرالٹر کی ناکامی کا سبب آپ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ یہ اس لئے ناکام ہوا کہ جنرل اختر ملک نے مجاہدین کی واپسی کا کوئی پلان تیار نہیں کیا تھا مگر یہ کہتے ہوئے ان کی زبان رکتی ہے کہ صدر مملکت نے ایک فتحمند کمانڈر کو کمان سے ہٹا کر دشمن کو اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کا سنہرا موقع فراہم کر دیا تھا۔دنیا کی تاریخ میں آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آگے بڑھتے ہوئے جرنیل کو اس کے اپنے ہی رستے میں روک دیں اور اسے کمان سے ہٹا کر جیتی ہوئی جنگ ہار دیں۔سابق کیپٹن گوہر ایوب کو اپنے ابا کی صفائی کے لئے کیسی کیسی باتیں کرنا پڑ رہی ہیں یہ بھی دیکھنے اور عبرت حاصل کرنے کا مقام ہے۔گوہر ایوب کہتے ہیں کہ الطاف گوہر نے اپنی کتاب ''ایوب پاکستان کا پہلا فوجی حکمران'' کے صفحات ۳۱۸ سے ۳۳۴ پر لکھا تھا کہ جی ایچ کیو نے کمان کی تبدیلی کو اپنی نااہلی چھپانے اور دفتر خارجہ نے اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے استعمال کیا تھا''۔(صفحہ ۹۲) الطاف گوہر نے تو یہ بھی لکھا تھا کہ جنرل اختر کمان

سے ہٹائے جانے کے بعد پھوٹ پھوٹ کر روئے کہ میں اپنے سپاہیوں کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ انہیں اپنی سبکی کی فکر نہیں تھی اپنے سپاہیوں کے مورال کے گر جانے کا خدشہ تھا کیونکہ جنرل اختر محاذ کے اگلے مورچوں پر لڑنے والے جرنیل تھے۔کیپٹن گوہر ایوب نے جنرل اختر ملک پر بے بنیاد الزام تراشی سے بھی گریز نہیں کیا۔فرماتے ہیں ''چھ ستمبر کو میں رات کے نو بجے کے قریب ذوالفقار علی بھٹو سے ملنے کو اور تازہ صورت حال جاننے کو ان کے گھر گیا۔کچھ دیر کے بعد مجھے غسل خانہ جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔مجھے ایک کمرہ میں لے جایا گیا۔میں نے دیکھا کہ اس کمرہ میں ایک پلنگ پر جنرل اختر ملک بے سدھ پڑے ہیں۔ مجھے دیکھ کر جنرل اختر ملک نے اٹھنے کی کوشش تک نہیں کی۔ہم نے ایک دوسرے کو سلام تو کیا مگر میرا خیال ہے جنرل اختر نے مجھے پہچانا نہیں۔۔۔میں نے بھٹو سے پوچھا جنرل اختر ملک کو تو مری میں اپنے ہیڈ کوارٹر میں ہونا چاہئے وہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ بھٹو صاحب نے اپنے کندھے اچکائے'' (صفحہ ۹۵)۔

یہ فقرے کیپٹن صاحب کی انانیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔کیا ان کی شخصیت اتنی اہم تھی کہ ایک حاضر سروس جرنیل کو انہیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہونا چاہئے تھا؟ اور جب وہ نہیں اٹھا تو آپ نے اسے بے سدھ کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی؟ کیا وہ اتنے اہم تھے کہ وہ وزیر خارجہ سے جواب طلبی کر سکتے تھے کہ ایک جرنیل اپنے ہیڈ کوارٹر میں ہونے کی بجائے ان کے کمرے میں کیوں ہے؟ کیا ان کا صدرِ مملکت کا بیٹا ہونا انہیں اس قسم کی آزادیاں دیتا ہے کہ وہ ایک جرنیل پر یوں الزام تراشی کریں وہ بھی صرف اس لئے کہ ان کے باپ نے اس فتحمند جرنیل کو کمان سے ہٹا دیا تھا اور ایک بے وفا جرنیل کو ان کی جگہ کمان سونپ دی تھی؟۔۶ ستمبر کو جنرل اختر حسین ملک کا ہیڈ کوارٹر کہاں تھا اس سے ان کو کیا غرض تھی؟ ان ہمہ مقتدر اور ہمہ عقل کیپٹن کو اتنا تو معلوم تھا کہ جنرل اختر کی جگہ کمان کس کے سپرد تھی اور وہ جرنیل کس طرح فاتح فوج کو پسپا کروا رہا تھا۔اب اس فتح نصیب جرنیل کی شہادت کے بعد اس کے کارناموں پر پردہ ڈالنے اور اس کی کردار کشی کی مذموم کوشش کیوں کی جا رہی ہے؟ پھر کیپٹن صاحب نے یہ فتویٰ بھی دیا ہے کہ اگر ''ابا کے بس میں ہوتا تو وہ ۱۹۶۵ کی جنگ سے گریز کرتے اگر وہ اپریشن جبرالٹر اور گرینڈ سلیم کو خود کمان کر رہے ہوتے اور بھٹو اور کشمیر سیل اور جنرل اختر حسین ملک کے خوش آئند پلان پر اعتبار نہ کرتے تو صورت حال مختلف

ہوتی''(صفحہ۱۰۲) اپنے ابا کی وفات کے بعد وہ ان کی جانب سے تو فتویٰ دے سکتے ہیں دوسروں کے بارہ میں جواب اس دنیا میں نہیں ہیں وہ کیسے وثوق سے باتیں کر سکتے ہیں؟

صدر ایوب جب برطانیہ گئے ہیں تو کپٹن صاحب ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے صدر صاحب کے دورہ کے بارہ میں یہ تو لکھ دیا کہ ''انہیں برطانوی وزیر اعظم نے بتایا کہ ایک غیر ملکی ایجنسی نے بھٹو کو صدر کے خلاف مزاحمت کی تحریک کھڑی کرنے کے لئے بہت سے پیسے دئے ہیں''(صفحہ۱۱۴) مگر صاحب صدر کے دورہء ''کلائیوڈن'' کا ذکر نہیں کیا جس کا سکینڈل برطانوی اخبارات میں دنوں چھپتا رہا اور جہاں مرحوم صدر تیرا کی کی مشق فرماتے رہے؟

کپٹن گوہر ایوب لکھتے ہیں گول میز کانفرنس کے لئے ''مجیب اسلام آباد پہنچا تو سیدھا جی ایچ کیو گیا اور جنرل یحییٰ سے ملا''(صفحہ۱۱۵) الطاف گوہر کے چھوٹے بھائی تجمل حسین اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں ''میں گوہر بھائی کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا اور باہر لان میں ٹہل رہا تھا کہ ایک سرکاری موٹر کار پولیس کی کار سمیت داخل ہوئی اس میں سے مجیب الرحمٰن نکلے میں نے پہچان لیا اور استقبال کیا کہنے لگے مجھے یہ موٹر صدر صاحب کے پاس لے جانے کے لئے ایر پورٹ پر آئی تھی میں نے ان سے کہا کہ پہلے میں آپ کے گھر جاؤں گا لہذا یہاں آ گیا ہوں''(جو بچے ہیں سنگ۔۔۔(صفحہ۱۶۳) تجمل حسین عینی گواہ کے طور پر بات کر رہے ہیں کپٹن گوہر ایوب صاحب حسب عادت سنی سنائی پر انحصار کئے بیٹھے ہیں۔ قاری کس کا اعتبار کرے؟ خود آپ نے زیڈ اے سلہری کی بیوفائی کا قصہ بیان کیا ہے کہ ''سلہری نے اپنے اخبار میں ایک مضمون لکھا کہ کہ صدر ایوب نے پی آئی اے کے لئے ٹرائیڈنٹ طیارے خریدے ہیں اور ان سے بہت سا کمشن لیا ہے۔ ابا نے تراشہ مجھے بھیجا اور کہا کہ سلہری کے خلاف ہتک عزت کا دعویٰ کیا جائے۔ ابا نے سلہری کی اس وقت امداد کی تھی جب وہ بہت مالی پریشانیوں میں مبتلا تھا اور اب وہی آدمی ابا کی شخصیت پر گند اچھال رہا تھا''(صفحہ۱۱۹) یہ تو دنیا جانتی ہے کہ سلہری صاحب کو صدر ایوب نے جنگ ستمبر کے دوران اچانک کرنل کے عہدے پر سرفراز فرما دیا تھا اور انہوں نے اگلے روز ہی کسی صحافی کے کسی سوال پر یہ جواب دیا تھا کہ تم بلڈی سویلین لوگ ہم فوجیوں کے مسائل نہیں سمجھتے ہو؟ سلہری صاحب سے وفا کی امید؟ ہم کو ان سے وفا کی ہے امید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟

جب صدر ایوب کے خلاف تحریک زوروں پر تھی تو ایک پولیس افسر نے اپنے ایک عزیز کے ذریعہ ان سے رابطہ قائم کیا اور فرمایا ''میں صدر ایوب کو بہت پسند کرتا ہوں اور میں ان کا مسئلہ حل کر سکتا ہوں؟ میں نے پوچھا کون سا مسئلہ؟ کہنے لگا یہی بھٹو کا مسئلہ۔ اگر صدر صاحب اسے تحفظ مہیا کریں تو وہ صدر صاحب کو اس مسئلہ سے نجات دلوا سکتا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ نواب کالا باغ نے بھی صدر سے کہا تھا اگر وہ اجازت دیں تو وہ بھٹو کی گردن مروڑ سکتے ہیں مگر ابا نے اس بات کو سخت ناپسند کیا۔ اس پر وہ نوجوان پولیس افسر بڑا مایوس ہو کر رخصت ہو گیا(صفحہ۱۴۶) یہ افسر مسعود محمود تھا۔

جب یہ نواز شریف صاحب کی کابینہ میں تھے تو فرماتے ہیں ''جنرل آصف نواز اور نواز شریف کے تعلقات اتنے بگڑے کہ ایسی باتیں ہونے لگی تھیں کہ نواز شریف جنرل آصف نواز کو ان کے بیرونی ملکوں کے دورہ کے دوران برطرف کر دینے کی سوچ رہے ہیں''(صفحہ۲۲۶) مگر جنرل آصف نواز کی اچانک موت نے یہ مسئلہ حل کر دیا۔ گویا نواز شریف آرمی چیف کو اتنا ہی بے حقیقت سمجھتے تھے اور پھر اپنی نادانی کی سزا بھی پائی۔

اس کتاب میں صدر ایوب کی ایسی خوبی بھی بیان ہوئی جسے پڑھ کر میرا سر فخر سے بلند ہو گیا کہ ''جب گوہر ایوب خان صدر کے اے ڈی سی تھے تو ابا کے ساتھ کھانا کھانے کا بل انہیں اپنی جیب سے ادا کرنا پڑتا تھا''۔(صفحہ۴۱)۔

اسی تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھئے۔ جنرل کے ایم عارف نے اپنی کتاب ''ضیاء الحق کے ہمراہ'' میں لکھا ہے کہ ''ضیا نے سرکاری اور ذاتی اخراجات میں شاید ہی کبھی امتیاز کیا ہو''(صفحہ ۱۷۳) گویا سارا بیت المال ان کا ذاتی اثاثہ تھا تس پر وہ اپنے کو امامت ملت اسلامیہ کا اہل گردانتے تھے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

غرض کپٹن گوہر ایوب خاں صاحب کی خود نوشت ان کی شخصیت کا یہ پہلو بڑی خوبی سے اجاگر کرتی ہے کہ صدر ایوب کا خلف ہونے کے ناطے انہیں بہت سر بلندیاں حاصل ہوئیں مگر ان کے ذاتی اوصاف کی پونجی اوچھی ہے اور وہ دوسروں پر الزام تراشی کرنے میں دلیر ہیں۔

✓

۔۔واقعہ ءبھٹوسمیت

میجر جنرل خواجہ راحت لطیف' کا شمار پاکستانی فوج کے چند ذہین مگر نمود پسند جرنیلوں میں ہوتا ہے ۔ جب بھٹو صاحب کا مقدمہ سپریم کورٹ میں اپیل کے مرحلہ میں تھا اس وقت خواجہ صاحب بریگیڈئر تھے اور راولپنڈی ایریا کے سب مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تھے اور اس حیثیت میں راولپنڈی جیل ان کے حیطہ ءاختیار میں تھی ۔ اگرچہ جیل کا انتظام وانصرام جیل کے حکام کی ذمہ داری سمجھا جاتا تھا مگر مارشل لاء حکام کی جانب سے لفٹیننٹ کرنل رفیع الدین کو بھٹو صاحب کی سیکیورٹی کا انچارج بنایا گیا تھا۔ اور کرنل رفیع الدین کے افسر بریگیڈئیر راحت لطیف تھے۔ بھٹو صاحب کی پھانسی کے بعد بہت سی افواہیں گردش میں تھیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ جیل میں بھٹو صاحب سے کسی کاغذ پر دستخط حاصل کرنے کے لئے بڑا تشدد کیا گیا اور اس تشدد کا ذمہ دار کوئی بریگیڈئیر تھا جس نے بھٹو صاحب پر اتنا تشدد کیا کہ وہ جاں بحق ہو گئے اور ان کی لاش کو محض دکھاوے کے لئے پھانسی پر لٹکایا گیا۔ اس وقت بریگیڈئر خواجہ راحت لطیف ہی ایسے بریگیڈئیر تھے جن کا براہ راست تعلق جیل سے اور جیل کے حکام سے تھا اس لئے انہی کا نام لوگوں کی زبان پر آتا رہا۔ راحت لطیف بعد کو میجر جنرل بنے اور اسی حیثیت میں فوج سے ریٹائر ہوئے ۔ آپ نے اولیں فرصت میں اپنی خودنوشت مرتب کی کہ لوگوں کے اس شبہ کا ازالہ کرسکیں کہ بھٹو صاحب پر آخری وقت پر کوئی تشدد کیا گیا تھا نہ ان کی موت اس تشدد کے نتیجہ میں ہوئی ۔ ان کی موت کا سبب ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق پھانسی پر لٹکائے جانے اور گردن کا منکا ٹوٹنے سے ہوئی ۔ جنرل خواجہ راحت لطیف کو اس الزام سے بریت کا اتنا شوق اور وثوق تھا کہ آپ نے اپنی خودنوشت انگریزی میں لکھی اور اس کا نام ہی Plus Bhutto's Episode .... یعنی ''واقعہ ءبھٹوسمیت''

رکھا گویا ان کی زندگی کی روداد اس واقعہ کے مالہ' اور ماعلیہ کو بیان کئے بغیر مکمل نہ ہوتی ۔ اپنی سروس کے آغاز میں ایک بار مشق کے دوران ان کا ۱۸۰ پاؤنڈر خیمہ ہوا کے زور سے اکھڑنے لگا تو آپ نے اس کی مرکزی چوب کو مضبوطی سے پکڑ لیا بلکہ مدد پہنچنے تک اس چوب سے لٹکے رہے (واقعہ ءبھٹوسمیت صفحہ ٦٢) اس واقعہ سے جرنیل صاحب نے یہ سبق سیکھا کہ مرکزی چوب کو مضبوطی سے پکڑ کر رکھا جائے تو ہوا خیمہ کو اکھاڑ نہیں سکتی ۔ غالبًا آپ نے واقعہ ءبھٹو کی مرکزی چوب کو اسی لئے مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے کہ ان کی خودنوشت کا تانا بانا بکھر نہ جائے ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

یہ خودنوشت جنگ والوں نے ۱۹۹۳ میں لاہور سے شائع کی ۔ جنگ والوں نے اور بھی انگریزی کتابیں شائع کی ہیں مگر یہ کتاب شاید عجلت میں شائع کی گئی ہے کیونکہ اس میں بے شمار کتابت کی غلطیاں راہ پا گئی ہیں اور مدتوں بعد ہمیں کسی کتاب کے آخر میں اغلاط نامہ چسپاں نظر آیا ہے ۔ خدا معلوم یہ عجلت چھاپنے والوں کی تھی یا جرنیل صاحب کی ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی خواہش کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ۔

جنرل خواجہ راحت لطیف سیالکوٹ کے ایک معزز خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے ان کے دادا کی خواہش تھی کہ ان کے بڑے صاحبزادے عبداللطیف علی گڑھ سے ایم اے اکنامکس اور قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد سول سروس میں جائیں مگر شاعر مشرق اقبال نے سرکاری نوکری کے خلاف مشورہ دیا چنانچہ لطیف صاحب نے سیالکوٹ میں قانون کی پریکٹس شروع کی مگر کساد بازاری کی وجہ سے پریکٹس نہ چلی ۔ لطیف صاحب مرے کالج سیالکوٹ میں استاد ہو گئے اور تقسیم ہند کے بعد جب ایم اے اکنامکس کی کلاسیں شروع ہوئیں تو آپ صدر شعبہ بن گئے اور ان کی ساری زندگی تعلیم و تعلم میں بسر ہوئی ۔ راحت لطیف کے دوسرے بھائی وجاہت لطیف پولیس کے اعلیٰ عہدیدار تھے ۔ جنرل صاحب نے اپنے خاندان اور اپنے آبائی مکان فضل منزل کا اور اس کے مکینوں کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے بلکہ اس مکان کی تصویر بھی کتاب میں شامل کر دی ہے تا کہ ان کے قارئین کو ان کے ستاون کمروں والے مکان کی وسعت اور مکانیت کا اندازہ ہو جائے ۔

خواجہ راحت لطیف بہت کم عمری ہی میں فوج کے لئے کیڈٹ منتخب ہوئے اور کوئٹہ میں ٹریننگ کے بعد کاکول کے لئے چنے گئے ۔ پی ایم اے سے گریجوایشن کے کچھ عرصہ بعد اسی ادارہ

میں انسٹرکٹر اور بعد کو اسی ادارہ کے کمانڈنٹ رہے۔ کاکول ملٹری اکیڈمی کا ذکر آپ نے بڑے ناسٹالجک انداز میں کیا ہے۔

فوج کی سروس کے دوران انہیں ملک کے مختلف حصوں میں خدمت کا موقع ملا۔ دو جنگوں میں عملی طور پر بھرپور حصہ لیا۔ ترقی کرتے کرتے پہلے بریگیڈئیر کے رینک تک پہنچے پھر میجر جنرل بنے۔ مختلف محکموں سے وابستہ رہنے کی وجہ سے ان کا تجربہ فوج کے کام آتا رہا۔ چین اور کوریا کے دورے بھی کئے۔ این سی سی یعنی نیشنل کیڈٹ کور اور جانباز فورس کے کمانڈر رہے۔ اس طرح ان کا ملک کی نوجوان نسل سے رابطہ رہا۔

ان کے افسروں میں اکثر ان کے کام سے خوش رہے مگر ضیاء الحق کے مارشل لا والے جنرل چشتی سے ان کی ذہنی مفاہمت نہ ہوسکی۔ ان کا کہنا ہے کہ پہلے جنرل چشتی نے دھونس دھاندلی سے مجھے مرعوب کرنا اور نامناسب کام کروانا چاہے مگر دیکھا کہ دال نہیں گلتی تو نرمی پر اتر آئے۔ (صفحہ ۱۵۸) جنرل صاحب نے ان نامناسب کاموں کی تفصیل بھی بیان کر دی ہوتی تو ان کی بات قارئین کے لئے زیادہ قابل قبول ہوتی۔ کتاب میں آگے چل کر آپ نے اپنی باتوں کی تصدیق کے لئے انہی جنرل چشتی کی لکھی ہوئی کتاب Betrayal of another kind کے حوالے تو بڑی فراخدلی سے درج کئے ہیں۔

بریگیڈئیر صاحب میجر جنرل ہو گئے تب بھی انہیں دوسری جگہ مارشل لاء کی ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ اس سلسلہ میں وہ سرگودھا کے ڈی ایم ایل اے رہے۔ اس دوران ہمیں بھی ایک بار ان سے ملاقات کا شرف ملا۔ آپ کے انصاف کا بہت چرچا سننے کے بعد ہمیں ہمارے دوست نے جو سرگودھا ڈویژن کے ڈائریکٹر ایجوکیشن تھے یہ مشورہ دیا کہ ہم اپنے ساتھ ہونے والی محکمانہ ناانصافیوں کے سلسلہ میں جنرل صاحب سے ملیں۔ ہم نے وقت مانگا وقت مل گیا۔ ملاقات میں انہیں ہمدردی سے باتیں کرتے ہوئے پایا مگر ہمارا تاثر یہی رہا کہ جنرل صاحب ہمارے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا تدارک کرنے کی یا تو پوزیشن میں نہیں یا کسی بڑے افسر کے خوف سے ایسا کرنا نہیں چاہتے۔ اب اس کتاب سے اندازہ ہو گیا ہے کہ اس ڈی ایم ایل اے کے اوپر جو ایم ایل اے تھے وہ ان کے انصاف کی کوششوں کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے تھے۔ آپ نے ''ایک

دلچسپ کیس'' (صفحہ ۲۸۱) کے عنوان سے بیان کیا ہے کہ کس طرح آپ ایک مظلوم عورت کی داد رسی کرنا چاہتے تھے مگر ان کی کوششیں ناکام ہو گئیں۔ آپ نے جو مقدمہ ملٹری عدالت میں چلانے کا فیصلہ کیا وہ مقدمہ تو چلا مگر اس کا فیصلہ ہونے سے قبل ایم ایل اے درمیان میں کود پڑے کہ یہ کیس ملٹری کورٹ سے واپس لے لیا جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایم ایل اے سے یہ درخواست کی گئی کہ ہم ملٹری عدالت کا فیصلہ جاری نہیں کریں گے بلکہ آپ کو توثیق کے لئے بھیج دیں گے پھر آپ جو چاہیں کریں۔ اس سلسلہ میں انہیں چیف آف آرمی سٹاف تک جانا پڑا مگر ان کا فیصلہ بھی یہی تھا ایم ایل اے کی بات مانی جائے جب ایم ایل اے کو فیصلہ بھیجا گیا تو انہوں نے فیصلہ منسوخ کر دیا۔ اب ہمیں اندازہ ہو گیا ہے کہ جنرل راحت لطیف چاہتے ہوئے بھی شاید ہماری دادرسی نہ کر سکتے۔ مارشل لا کی دہشت تو بہت ہوتی ہے مگر انصاف وہاں سے بھی شاذ ہی ملتا ہے۔

ہمیں اس کتاب میں ایک اچھی بات یہ ملی کہ راحت لطیف صاحب نے جہاں جہاں جس جس کے ساتھ کام کیا ہے وہاں اپنے ماتحت کام کرنے والے افسروں کی تعریف اور حوصلہ افزائی ہی کی ہے کہیں ایک مرتبہ بھی جنرل صاحب اپنے کسی ماتحت افسر سے نالاں نظر نہیں آئے۔ یہ تو نہیں کہ یہ ماتحتوں پر برستے نہیں ہوں گے برستے ہوں گے مگر آپ نے پیٹھ پیچھے ان سب کی تعریف و توصیف ہی کی ہے اور یہ وصف صرف ان لوگوں میں ہوتا ہے جو وسیع القلب اور حوصلہ مند ہوں۔ ہم نے کئی فوجی کمان داروں کی سرگزشتیں پڑھی ہیں ہمیں ان جیسی وسعت حوصلہ بہت کم نظر آئی۔

ہم ملنے کو حاضر ہوئے تھے تو آپ نے بڑی گرمجوشی سے ہمیں خوش آمدید کہا تھا اور بتایا کہ ان کے والد صاحب بھی پروفیسر ہیں اس لئے ان کے دل میں اساتذہ کے لئے نرم گوشہ ہے۔ اگرچہ ہماری شکایت کا ازالہ ان سے نہ ہو سکا مگر ہم نے اتنا ضرور محسوس کیا کہ جنرل صاحب تعلیمی اداروں کی ترقی و استحکام میں اپنا سا حصہ لیتے رہتے ہیں۔ اسی خودنوشت میں سرگودھا ضلع کے ایک دوردراز کے ایک انٹر کالج میں آپ کے ورود و استقبال کی تصویر ہے۔ کمشنر اور ڈی آئی جی بھی ان کے جلو میں ہیں۔ سول کے اتنے بڑے افسر اس علاقہ میں کاہے کو جاتے۔ ڈی ایم ایل اے کے ساتھ انہیں بھی جانا پڑا اور عین ممکن ہے ان کا جانا علاقے کے غریب غربا کے لئے سودمند بھی ثابت ہوا ہو۔ ہم نے تو اپنے سن باون ترپن کے کلرکی کے زمانے کے رفیق پروفیسر سید احمد

سعید ہمدانی کی تصویر کوئی نصف صدی کے بعد دیکھی ہے جو اس کالج کے پرنسپل ہیں اور ماشاء اللہ کالے گاؤن میں بہت وجیہہ لگ رہے ہیں۔ ہمدانی صاحب کے افسانوں کے مجموعے کا دیباچہ لکھتے ہوئے الطاف مشہدی نے انہیں جیالا فنکار کہا تھا۔ کالج میں کسی ڈی ایم ایل اے کو بلا لینے کا خیال کسی جیالے کو ہی آ سکتا تھا۔

سرگودھا ڈویژن کے ڈی ایم ایل اے کے مسائل بیان کرتے ہوئے آپ نے لکھا ہے کہ ''سرگودھے کے قریب ہی احمدیوں کا مرکز ربوہ واقع ہے۔ میرے دو سال کے دوران کئی بار سخت کشیدگی کے لمحات بھی آتے رہے۔ جب بھی احمدیوں کا سالانہ جلسہ ہوتا ختم نبوت والے چنیوٹ میں عین انہی دنوں میں اپنی کانفرنس رکھ لیتے اور ان دو پر جوش جذباتی فرقوں کے درمیان صرف دریائے چناب ہی کی حد فاصل تھی'' (صفحہ ۲۷۷)۔ جرنیل صاحب نے یہ تو محسوس کیا ہوگا کہ احمدیوں کے سالانہ جلسہ میں کبھی فرقہ وارانہ جذبات کو ابھارنے والی تقریریں نہیں ہوتیں ادھر چنیوٹ والوں کے ہاں سوائے اشتعال انگیزی کے اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ ہمیں خیال آ رہا ہے کہ کہیں یہ جنرل راحت لطیف کے ذوقِ گرہ کشائی کا کرشمہ تو نہیں کہ اس کشیدگی کو ختم کرنے کے لئے حکومت نے احمدیوں کو سرے سے سالانہ جلسہ کرنے کی اجازت دینے سے ہی مستقلاً انکار کر رکھا ہے؟ اور اب ختم نبوت کی کانفرنس چنیوٹ میں نہیں ہوتی کھلے بندوں عین ربوہ میں اسی دریائے چناب کے کنارے پر ہوتی ہے اور اس میں سب وشتم کے دریا بہائے جاتے ہیں۔

جنرل صاحب نے بھٹو صاحب کے انجام کے بارہ میں غلط فہمیاں دور کرنے کے لئے دوسروں کے بیانات کا سہارا لیا ہے۔ اس سلسلہ میں کرنل رفیع الدین کی کتاب مستند ہے کیونکہ وہ موقعہ پر موجود تھے بریگیڈئیر صاحب تو صرف نگران تھے اور جیل میں شاید ہی بھٹو صاحب سے ملے ہوں یا ان کے قریب گئے ہوں۔ اسی لئے آپ نے اپنی بات کی تصدیق کے لئے ڈاکٹر اصغر کا بیان حلفی اپنی کتاب کا حصہ بنایا ہے اسی طرح جیل کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مجید احمد قریشی کا انٹر ویو کتاب میں شامل کر دیا ہے۔ یہ رویہ ان کی دیانت داری پر دال ہے کہ وہ بات جس کا علم انہیں ذاتی تجربہ سے حاصل نہیں ہوا اس کی روایت آپ نے دوسرے معتبر راویوں پر چھوڑ دی ہے۔

اور اب آخر میں نواب کالاباغ اور ایک دیانت دار پولیس افسر کا ذکر خیر۔ فرماتے ہیں جب

کالاباغ کے دورہ پر گیا تو کمشنر ڈی آئی جی ایس پی سب میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے سنایا کہ ایک ایس پی دورہ پر کالا باغ آیا اور اپنے ساتھ اپنا باورچی بھی لایا۔ نواب صاحب نے اس کے ورود پر پھلوں کی ایک ٹوکری بھیجی۔ اس نے یہ کہہ کر واپس کر دی کہ وہ سرکاری دورہ پر ہے اس لئے اسے اس ٹوکری کی حاجت نہیں۔ پھر نواب صاحب کا کارندہ آیا کہ نواب صاحب نے دریافت فرمایا ہے کہ آپ کھانے میں کیا کھانا پسند کریں گے؟ ایس پی نے جواب دیا کہ اس کا باورچی اس کے ساتھ ہے اس لئے وہ اپنا کھانا خود تیار کروائیں گے۔ کارندے نے انہیں بتایا کہ یہ ریاست کا دستور ہے کہ جو افسر بھی ریاست میں آتا ہے وہ نواب صاحب کا مہمان ہوتا ہے مگر ایس پی صاحب نے اس کو شکریہ کے ساتھ ٹال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایس پی صاحب کا باورچی بازار سے کھانے کے لئے سودا سلف لینے گیا۔ جس دکاندار سے مطلوبہ چیز مانگتا وہ اس چیز کی موجودگی کے باوجود دینے سے انکار کر دیتا۔ جب باورچی کو پکانے کو کچھ نہ ملا تو اس نے واپس آ کر ایس پی صاحب سے صورت حال کہی۔ سوائے اس کے کوئی صورت نہ تھی کہ بارچی کالا باغ کی حدود سے باہر جا کر چیزیں خرید کر لاتا۔ ایس پی صاحب اپنا دورہ مختصر کر کے وہاں سے رخصت ہو گئے۔ جنرل صاحب نے فقرہ چست کیا ہے'' اگلی بار ایس پی صاحب کھانے پکانے کی اشیا بھی ساتھ لے کر دورہ پر آئے ہوں گے (صفحہ ۲۸۸) مگر آپ نے یہ نہیں لکھا کہ ان کے سارے قافلے کی مہمانداری کس نے کی تھی؟ ہمیں تو جنرل صاحب کی اس عادت کی سمجھ نہیں آئی کہ جہاں دورہ پر جاتے ہیں وہاں کے کمشنر اور ڈی آئی جی کو ساتھ کیوں لے کر جاتے ہیں؟ کیا انہیں اپنی انتظامی صلاحیتوں پر اعتماد نہیں؟ حسِ خود پسندی کی تسکین کے سوا اس رویہ کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ جہانتک ہمیں علم ہے کمشنر اور میجر جنرل سینیارٹی میں برابر ہوتے ہیں اور ڈی ایم ایل اے ہونے والے کو کوئی سرخاب کے پر نہیں لگ جاتے۔ سول حکام مارشل لا حکام کے معین ہوتے ہیں ماتحت نہیں ہوتے۔

اس خود نوشت کی زبان دلکشی نہ رکھنے کے باوجود قارئین کے پڑھنے میں روک نہیں بنتی اور قاری دلچسپی کے ساتھ ان کی باتیں پڑھتا چلا جاتا ہے محض اس لئے کہ لکھنے والے کی دیانت داری اور صاف گوئی کا تاثر غالب تاثر ہے۔

غیر مرئی عورتوں کا ملک

ڈاکٹر قانتہ ۔اے۔احمد برطانوی شہری ہیں مگر امریکہ میں ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے کچھ عرصہ تک سعودی عرب میں بہ طور ڈاکٹر ''کنگ فہد نیشنل گارڈ ہسپتال'' میں کام کیا۔سعودی عرب دنیاوالوں کے لئے ایک عجیب پراسرار ملک ہے جہاں کے لوگ جہاں کا مذہب جہاں کی تہذیب اور جہاں کی بے پناہ دولت سارا کچھ ہی لوگوں کی متجسس نگاہوں کا مرکز بن جاتا ہے۔اقبال نے خوب بات کہی تھی کہ ''کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا۔خبر میں نظر میں اذانِ سحر میں'' اوراب اکیسویں صدی کے حالات اور دولت سیال کی دریافت دیافت کی وجہ سے اس مصرعہ کی معنویت کہیں زیادہ ہوگئی ہے۔

سعودی عرب کے بارہ میں کئی کتابیں نظر سے گذری تھیں دو تو سعودی شہزادیوں کی لکھی ہوئی تھیں ایک شہزادی سلطانہ اور دوسری شہزادی سلطانہ کی بیٹیاں ۔ان کا موضوع سعودی مردوں کی زیادتیاں اور عورت کی مجبوریوں کے مسائل تھے۔ایک کتاب ایک برطانوی نینی روزمیری بشو کی لکھی ہوئی تھی The Prince and I یعنی ''شہزادہ اور میں''۔روزمیری نے ماں کی سی محبت کے ساتھ ننھے شہزادہ ''سوسو'' کو پالا تھا۔اتنا وقت گذر جانے کے باوجود وہ کتاب اب بھی ذہن میں تازہ ہے انہی دنوں محبت کرنے کے جرم میں ایک شہزادی کا سر قلم کیا گیا تھا اور روزمیری اس واقعہ سے خوفزدہ ہو کر ملک سے بھاگ آئی تھیں مگر اس کتاب کی خوبصورتی اس بیان میں تھی جس میں شاہی حرم کے اندر رہنے والی عورتوں کے احوال کا بیان تھا۔اب تیسری کتاب آئی ہے تو وہ کسی شہزادی کی تو نہیں مگر ایک ڈاکٹر کی لکھی ہوئی ہے جس نے سعودی عرب کو ''غیر مرئی عورتوں کا

ملک'' کہا ہے .In the Land of invisible Women یعنی اس کتاب کا موضوع بھی کم وبیش وہی ہے جو دنیا بھر کے لوگوں کے لئے تجسس کا باعث ہے۔ڈاکٹر قانتہ کی تربیت ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے ہوئی ہے اس لئے انہیں مریض کی بیماری اور جزئیات سے دلچسپی ہونی چاہئے مگر معلوم دیتا ہے انہیں اپنے بیماروں اور ساتھیوں کے لباسوں ۔ان کے زیورات ان کے پہناووں اور ان کی فیشن سے متعلقہ چیزوں سے زیادہ دلچسپی ہے۔جس کا ذکر ہوا ہے اس کی پوشاک ضرور زیر بحث آئی ہے ۔خوشبو اور عطریات کا ضرور ذکر ہوا ہے بالوں کے فیشن حتیٰ کہ پاؤں کے جوتے تک ان کی نگاہ جزئیات بیں سے پوشیدہ نہیں رہے بلکہ حیرت تو اس بات پر ہے کہ پاس سے گذرتی ہوئی ایک گاڑی میں بیٹھے ہوئے لاپروالڑکے کے جوتوں کی قیمت تک انہیں معلوم ہے کہ اس نے ''gucci کے چھ سو ڈالر کے جوتے پہن رکھے تھے۔'' (غیر مرئی عورتوں کا ملک۔صفحہ ۲۱۴)۔ہمارے ہاں اردو میں قیصری بیگم کی سرگزشت ''میری زندگی'' ایسی ہی جزئیات کے لئے جانی جاتی ہے۔جس طرح قیصری بیگم کی سرگزشت سے برصغیر کے نسائی پہناووں زیوروں اور دیگر تفصیلات کی علیحدہ تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے قانتہ احمد کی کتاب مغرب اور شمالی امریکہ کے رائج الوقت نسائی فیشن کی مکمل دستاویز ہے۔

ڈاکٹر قانتہ احمد کے آباو اجداد جنوبی ایشیا کے رہنے والے تھے مگر ان کے امی ابا اور ان کے ساتھ ان کے احفاد ہجرت کر کے انگلستان میں آباد ہو گئے۔قانتہ بی بی کی تمام تر تعلیم انگلستان اور امریکہ میں ہوئی گویا وہ بچپن سے ہی اپنے آبائی معاشرتی اور دینی ماحول سے دور ایسے ماحول میں پرورش پاتی رہیں جو ماحول آزاد خیالی اور آزادہ روی اور (میرے منہ میں خاک بے راہ روی) کا ماحول تھا۔ماں باپ کی ہمہ تر توجہ اور محبت کے باوجود ان کے مزاج میں ایک باغیانہ عنصر پرورش پاتا رہا۔یہاں تک کہ اپنی سعودی رفقاء کار کو اپنے اسلامی ماحول سے سمجھوتا کرتے ہوئے دیکھتی ہیں تو انہیں دکھ ہوتا ہے۔ان کی سعودی فلسطینی امیر سہلی زبیدہ کا ذکر ہے جو خود ایک کاروبار کی مالک ہے اور اقتصادی لحاظ سے دوسروں پر انحصار نہیں رکھتی ''ذرا ذرا کر کے میں نے محسوس کیا کہ اس نے کبھی بغاوت کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔اس نے اپنی زندگی کے موجودہ رویہ کو

اور اپنے خاندان کے تقاضوں کو پوری طرح قبول کرلیا ہے وہ میری طرح ہرگز اپنے ثقافتی ماحول کے تقاضوں سے کسی اختلاف کا شکار نہیں بلکہ اس نے اپنے آپ کو ان کے اندر پوری طرح سمولیا ہے۔اسے کسی بغاوت کی ضرورت ہی محسوس ہوتی ہے نہ پابندیاں اسے ناواجب لگتی ہیں۔اور اپنی روایات کے اندر مطمئن ہے۔یہاں سے میری اور اس کی زندگی کا تضاد شروع ہوتا ہے۔میں اپنے خاندان کے لئے کلنک کا ٹیکا ہوں سماجی طور پر دھتکاری ہوئی'' (صفحہ ۳۳۳)

اس پس منظر میں جب وہ سعودی عرب گئی ہیں تو خود اپنی تشخیص کے مطابق ایک ''جنونی مملکت'' یعنی chizophrenic kingdom (صفحہ ۲۱۵) میں گئی ہیں۔جہاں ان کے خیال میں کسی صحیح بات کو وقوع میں آنا محالات میں سے ہے۔سعودی عرب جاتے وقت ان کے اس معاشرہ کے متعلق ذاتی تعصبات ان کے ذہن کا حصہ تھے۔از بسکہ قانتہ خود مسلمان ماں باپ کی مسلمان بیٹی ہیں انہیں ایک بند اسلامی معاشرہ میں وارد ہونا عجیب لگتا تھا اور وہ آخر تک ان بندشوں کو قبول نہیں کرسکیں جو ان کے قول کے مطابق قدم قدم پر ان کی راہ روکتی تھیں۔واپسی پر جہاز سے اتری ہیں تو بندشوں کی ظاہری علامت عبایہ کو جہاز ہی میں چھوڑ آئیں جہاز سے باہر آگئیں تو گویا اپنی آزادی میں سانس لینا شروع کردیا جہاز والے اعلان ہی کرتے رہ گئے کہ ''سیٹ نمبر ۱۲۳ اے پر بیٹھی ہوئی محترم خاتون اپنا عبایہ بھول گئی ہیں مہربانی کرکے وصول کرلیں ہم نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔مگر میں نے اپنی نیوی جیکٹ آستینوں کو سیدھا کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی مجھے پہچان تو نہیں پا رہا اور ذرا سے توقف کے بعد اپنا لمبی جرابوں اور اونچی ایڑی والے جوتے میں لپٹا ہوا پاؤں جہاز سے باہر رکھ دیا۔جہاز والوں کا اعلان جاری تھا۔میں نے خندہ کیا اور اب کی بار یہ خندہ خاصا بلند تھا۔آخر میں آزاد ہوگئی'' (صفحہ ۴۳۰) قانتہ بی بی اپنی آزادی کی خوشی میں یہ بتانا بھول گئیں کہ ان کے جوتے کس میک کے تھے؟ اور ان کی سٹاکنگ پر کس فیشن کی چھاپ تھی؟

ان کی طبیعت کو سمجھنے کے لئے ڈاکٹر ریم کا ذکر ضروری ہے۔ڈاکٹر ریم ان کی رفیقہ تھیں اور انہیں ٹورنٹو یونیورسٹی میں سرجری کی اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفہ ملا تھا۔ان کی سعودی روایتیں ان کی راہ میں حائل تھیں۔وہ اپنے باپ کی اجازت کے بغیر ملک سے باہر تعلیم حاصل کرنے کو نہیں جاسکتی

تھیں۔اس کا ایک ہی حل تھا کہ وہ شادی کرلیں اور ڈاکٹر ریم نے ماں باپ کی اور اپنے ملک کی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے یہ فیصلہ قبول کرلیا۔اس پر ڈاکٹر قانتہ کا ردعمل بڑا شدید ہے۔ ''میری آواز واضح غصہ سے بھری ہوئی تھی۔مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنی ذہین لڑکی اتنی احمق اور اتنی کمزور بھی ہوسکتی ہے۔آخر وہ اپنے خاندان کی بات کو رد کیوں نہیں کرسکتی؟ میں نے بھی تو یہی کچھ کیا تھا۔عورتیں اتنی کمزور اور ناتواں کیوں ہوتی ہیں؟'' (صفحہ ۳۴۶)۔جس عورت کے ساتھ اتنے مضبوط تعصبات سفر کر رہے ہوں اس کا اس معاشرہ کی ہر اچھی بری بات کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھنا سمجھ میں آتا ہے مگر بات وہی ہے ''ترسم کہ بہ کعبہ نہ رسی اے اعرابی۔کیں راہ کہ می روی بہ ترکستان است۔''

انہیں بتایا گیا تھا کہ سعودی عورتیں پردہ کی پابندیوں میں رہتی ہیں انکی تمامتر سرگرمیوں کا مرکز ان کا گھر ہے یا ان کی اولاد انہیں اپنے ماں باپ یا خاوند کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں علی ہذا القیاس۔یعنی وہ تمام یکطرفہ باتیں جو اس پراسرار ملک کے طبقہ اناث کے بارہ میں کہی جاتی تھیں ان کے ذہن میں مستحکم طور پر بیٹھی ہوئی تھیں۔پہلی بار جہاز سے اتری ہیں تو اس احساس سے اتری ہیں کہ اب وہ ایک عظیم الشان پنجرہ میں داخل ہو رہی ہیں۔ہسپتال میں پہنچی ہیں تو بھی انہیں یک گونہ گھٹن کا احساس ہوا ہے۔ان کے فرائض میں شامل تھا کہ وہ ایمرجنسی کے طور پر داخل ہونے والے مریضوں کی دیکھ بھال کریں اور ان مریضوں میں مرد بھی تھے عورتیں بھی تھیں۔پہلی خاتون مریض خالہ العتیبی بیہوش تھیں مگر ان کے مرد رشتہ داروں کو اس بات کی فکر تھی کہ اس بیہوشی کے عالم میں بھی ان کے جسم کے دوسرے حصے تو بے پردہ ہوجائیں مگر ان کے چہرے کی بے پردگی نہ ہوجائے۔ایسی باتیں تو سعودی عرب میں نہیں دوسرے اسلامی ممالک میں بھی عام تھیں اور اس کا سبب اسلام نہیں ان لوگوں کی جہالت تھی۔پھر انہیں اس بات پر حیرت ہوئی تھی کہ مرد ڈاکٹر خاتون ڈاکٹروں سے مشورہ تک نہیں کرتے تھے'' (صفحہ ۷۴) عرب امیر عورتیں حج کے موقع پر بھی اپنی خادمات سے اچھا اور برابری کا سلوک نہیں کرتیں (صفحہ ۷۳) عورتیں شادی بیاہ کی زنانہ تقریبات میں اپنے بدن کی عریانی اور نمائش کا وہ مظاہرہ کرتیں کہ انہیں امریکہ میں بھی

ویسا نظر نہیں آتا تھا (صفحہ ۳۲۷)۔ مرد وئے ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو خوب چومتے چاٹتے ہیں (صفحہ ۸۰) نوجوانوں کی بے راہ روی کا اپنا سا تجزیہ بھی کیا ہے جس میں سر فہرست یہ وجہ ہے کہ ان کے بڑے پے بہ پے شادیاں کر لیتے ہیں اور پھر بعد کو آنے والی چھوٹی بیویوں کی اولاد محرومیوں کا شکار ہوتی رہتی ہے۔ (صفحہ ۸۹) غرض ''ڈاکٹورہ قانتہ'' اس معاشرہ سے خاصی مایوس ہیں۔ خود ان کی دینی وابستگی کا یہ حال ہے کہ قرآن تک ان کے سامان میں موجود نہیں (صفحہ ۱۱۴) اللہ نے بلالیا تو حج کی توفیق بھی مل گئی آتے ہوئے عمرہ بھی کر آئیں مرا دلیست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار۔ بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم۔ (کہ میرا دل وہ کافر ہے کہ کعبہ میں بھی پھینک آئے مگر واپس آیا تو وہی برہمن کا برہمن دھرا رکھا تھا)

ان کی زبان نہایت اچھی اور با محاورہ زبان ہے اور بیان پر خوب قدرت رکھتی ہیں لیکن جب اپنے حج کے معلم کے بارہ میں یہ کہتی ہیں کہ he barked salamalaikum (صفحہ ۱۲۵) تو اس محاورہ سے پڑھنے والوں کو دکھ ہوتا ہے اے کاش انگریزی زبان میں بہ آواز جہر سلام کہنے کو کوئی اور مناسب محاورہ موجود ہوتا۔

کتاب میں ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کا نفاذ کرنے والی سعودی فورس ''مطوّعین'' کی دہشت کا بہت ذکر اذکار ہے۔ ایک آدھ بار ان کی تنفیذی سرگرمیوں کا نشانہ بھی بنی ہیں اور وہابی اسلام پر بہت برسی ہیں۔ یہ فورس بہت مضبوط بنیادوں پر قائم ہے اور ان کی گرفت سے رہائی کے لئے سعودی مملکت کے اوپر کے حلقوں تک رسائی بہت ضروری ہے۔ خود ان کی فوجی تنظیم نیشنل گارڈ کے اہتمام میں ہونے والے ایک مخلوط ڈنر میں مطوعین پہنچ جاتے ہیں اور انہیں بڑی مشکل اور تگ و دو سے نجات ملتی ہے اس باب کو آپ نے ''وہابی ظلم'' (باب چوبیس) کا نام دیا ہے۔ جب اس محفل میں سب کی جان اور آبرو پر بنی ہوئی تھی تو اس وقت ان کی ڈاکٹری کی حس خوب بیدار تھی اور یہ مطوّع کی تشخیص کر رہی تھیں کہ ''اس کے ناخن زرد تھے اس لئے وہ کمیء خون اور نا مناسب خوراک کے نتیجہ میں ہونے والی بیماریوں کا شکار تھا'' (صفحہ ۲۱۱)۔

ہمیں تو اس سارے ''شکایت نامہء قانتوی'' میں ایک اچھی بات ملی کہ ایک مظلوم اور

غریب سری لنکن ڈرائیور کی جانب سے جس نے گاڑی کے کسی حادثہ میں کسی کو کچل دیا تھا کسی نامعلوم سعودی شہری نے دیت کی رقم ادا کر کے اس غریب کو اور اس کے خاندان کو مشکلات سے بچا لیا۔ (صفحہ ۲۲۷) جس مملکت میں ایسے نیک لوگ موجود ہوں اس کے بچ رہنے کے بہت امکانات ہوتے ہیں کیونکہ خدا کو اپنے بندوں سے محبت کرنے والے لوگ بہت پیارے ہوتے ہیں خواہ وہ سعودی مرد ہی کیوں نہ ہوں۔

ان کی پہلی پہلی محبت کا ذکر بھی ہے عماد صاحب تو اسم با مسمیٰ ثابت ہوئے اور اپنی جگہ ستون کی طرح قائم رہے اور آخر اپنے وطن کی روایتوں کے مطابق سعودی عورت سے شادی شدہ ہیں اور دو بچوں کے باپ ہیں اور ڈاکٹورہ قانتہ ابھی تک تنہا ہیں۔ میڈیکل یونیورسٹی آف ساؤتھ کیرولینا میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں اور وہیں رہتی اور پریکٹس کرتی ہیں۔ اللہ ان کے ساتھ ہو۔

✓

آہنگِ بازگشت

پرانے اور آزمودہ کار صحافی مولوی محمد سعید کی خودنوشت ''آہنگِ بازگشت'' کے عنوان سے ۱۹۸۹ میں قومی ادارہ برائے تحقیقِ تاریخ وثقافت اسلام آباد نے ۱۹۸۹ میں شائع کی یہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ پہلی بار یہ کتاب کب چھپی اس کا کوئی ذکر اس ایڈیشن میں موجود نہیں۔ سر عنوان کے طور پر مصنف نے فارسی کا ایک شعر لکھا ہے کہ ''ایں مطرب از کجاست کہ سازِ عراق ساخت۔ وآہنگِ بازگشت زراہ حجاز کرد۔'' یعنی یہ مطرب کہاں کا ہے کہ اس نے ساز تو عراق کا بنایا مگر اس میں سے لے حجاز کی پیدا ہوئی۔ کتاب کا مزاج اسی حجازی لے کا آئینہ دار ہے۔ کتاب کے تتمہ میں لکھتے ہیں ''اوئل عمر میں ایک بزرگ نے نصیحت کی کہ کتاب نہ لکھنا۔ عمر بھر اس نصیحت پر کار بند رہا بڑھاپے میں آن کر توبہ ٹوٹ گئی۔ اس گمرہی کا سبب میرے چند احباب کا مجھے پیہم ورغلاتے رہنا تھا (اور ان احباب میں ہمارے صحافی دوست محمود احمد نجمی بھی شامل تھے)۔۔۔ کتاب اگر آپ کے لئے دلچسپی کا باعث بنی ہے تو انہیں دعا دیجئے اور اگر محض تضیعِ اوقات تھی تو مجھ سے درگذر کیجئے'' (آہنگِ بازگشت صفحہ ۵۰۲) مولوی سعید صاحب نے ابتدائی صحافتی زندگی کے سوا جو اردو صحافت میں بسر ہوئی عمر کا بیشتر حصہ انگریزی صحافت سے وابستگی میں گذارا مگر آپ نے اپنی خودنوشت اردو میں لکھی اور اتنی شستہ، رفتہ اور بامحاورہ اردو میں لکھی کہ پڑھنے والا ہر ہر جملہ پر رکتا اور اس کی شستگی کا مزا لیتا ہے۔ کہنہ مشق صحافی ہونے کے باوجود آپ نے اپنی زبان پر صحافتی روا روی کو حاوی نہیں ہونے دیا۔

یہ داستان ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ کو سقوطِ ڈھاکہ کے دن ختم ہو جاتی ہے۔ فہرست مضامین کے عنوان سے لکھا ہے پہلے چونتیس صفحے آغاز سفر کے ہیں۔ تحریکِ خلافت سے جنگ ستمبر تک کا

دور سوز وساز کا اور معاہدہ ءتاشقند سے سقوطِ ڈھاکہ کا دور درد وداغ کا دور ہے۔ اس سقوط کے بعد سکوت کا دور ہے۔

مولوی صاحب سیالکوٹ کے قصبہ کلاسوالہ میں پیدا ہوئے تعلیم اسلامیہ کالج لاہور، اسلامیہ کالج پشاور، مرے کالج سیالکوٹ میں اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پائی۔ ادھر ادھر کی متفرق ملازمتوں کے دوران فوج میں بھی کچھ عرصہ گذارا مگر ان کا سفینہ صحافت میں آ کنارے لگا۔ اگرچہ ایک اخبار میں ٹک کر نہیں بیٹھے مگر صحافت سے وابستگی انہیں راس آ گئی۔ دہلی میں ڈان سے وابستہ ہوئے تو کراچی تک اس سے منسلک رہے پھر ٹائمز آف کراچی، سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور اور پریس ٹرسٹ کے زیر اہتمام چھپنے والے پاکستان ٹائمز سے وابستہ رہے ۱۹۷۹ میں کچھ عرصہ اس کی ایڈیٹری کے فرائض بھی سرانجام دئے۔ جو شخص اتنے لمبے عرصہ تک صحافت سے وابستہ اور اربابِ اقتدار کے ظاہر وباہر سے آشنا رہا ہو اس کے ہاں ایک قسم کی خودنمائی اور خودستائی آ جاتی ہے مگر آہنگِ بازگشت کے مصنف کے ہاں خاکساری اور ہیچ مدانی کا احساس، احساسِ غالب ہے۔ اردو صحافت سے وابستگی کے دوران مصنف نے ظفر علی خاں کا طنطنہ، عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر کا صحافتی تدبر، مرتضٰی احمد خاں میکش کا دعوی ءہمہ دانی، حاجی لق لق کا ''لقلقہ'' سب کچھ قریب سے دیکھا ہے۔ برصغیر کی انگریزی صحافت کے بڑوں کے ساتھ کام کیا ہے مگر اپنے دامن کو کسی ناروا مخمصہ سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔ کتاب کے شروع میں قاری کے نام ایک خط خود ان کی اپنی دستخطی تحریر میں چھپا ہوا ہے'' ۔۔۔ یہ تحریر تاریخ نہیں اس لئے کہ ہمارے ہاں تاریخ جن ایوانوں میں بنتی رہی ہے میں ان میں کبھی بار نہ پا سکا۔ یہ محض افسانہ بھی نہیں اس لئے کہ یہ دن مجھ پر بیت چکے ہیں یہ دن میری وجہ سے اہم نہیں تھے میں ان کی اہمیت کا ایک ادنیٰ تماشائی تھا اکثر سوچتا ہوں کہ اگر یہ دن مجھ پر نہ گذرے ہوتے تو میں کتنا تہی دامن ہوتا''۔ بیتے دنوں کی یہ سرگزشت آہنگِ بازگشت بن کر ہمارے سامنے ہے۔

لڑکپن میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا اندازِ خطابت انہیں کشش کرتا تھا اس لئے احرار کے جلسوں میں ان کی حاضری خاصی باقاعدہ رہی اور یک گونہ پابندی سے ان کو سنتے اور ان سے متاثر ہوتے رہے۔ یہ داستان آپ نے بڑی رغبت سے بیان کی ہے مگر جوش عقیدت میں آپ نے

ایسے پھول بھی احرار کی جھولی میں ڈال دئے ہیں جن کے وہ کسی طور بھی سزاوار نہیں تھے۔ لکھتے ہیں ''وادیءِ کشمیر میں جو جنگ ڈوگروں کے خلاف جاری ہو چکی تھی اس کی بازگشت پہاڑوں کے دامن میں پھیلے ہوئے پنجاب کے ہر قریہ اور ہر شہر میں ہوئی۔ احرار کے ابتدائی ایام تھے احرار کی بے پناہ خطابت کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی موضوع مناسب نہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے پنجاب کے طول وعرض میں اپنی شعلہ بیانی سے آگ لگا دی۔۔۔ کشمیر ایجی ٹیشن کی قیادت احرار کے ہاتھ میں آ گئی۔ اور وہ اس کے لئے موزوں تھے مسئلہ مسلمانوں کی آزادی اور ان کے مذہبی تحفظ کا تھا انہیں دو اجزاء سے احرار کی حکمت عملی نے ترکیب پائی تھی۔ قید و بند سے وہ خائف نہیں تھے ان کی قیادت نے اگست ۱۹۳۱ میں تیس ہزار آدمیوں کو ڈوگروں کی جیلوں اور کیمپوں میں بھیج دیا''۔ (صفحہ ۹۴)

کشمیر کے مسلمانوں کی حالت زار کو دنیا پر واضح کرنے اور ڈوگرہ راج کے ظلم وستم کا پردہ چاک کرنے کا کام آل انڈیا کشمیر کمیٹی نے کیا۔ مجبور و بیکس کشمیری مسلمانوں پر جو ظلم ڈھائے جاتے تھے ان کو ہر قسم کی عملی امداد کشمیر کمیٹی نے دی ڈوگرہ راج کی طرف سے جھوٹے مقدمات میں پھنسائے گئے غریب کشمیریوں کو قانونی امداد کشمیر کمیٹی نے مفت بہم پہنچائی۔ اس کے وکیل اپنے خرچ پر کشمیر میں جاتے اور ان کے مقدمات لڑتے رہے۔ اس کے زیر اہتمام ڈاکٹر کشمیر کے طول وعرض میں مفت طبی امداد مہیا کرتے رہے۔ کشمیر کمیٹی نے انہیں سیاسی جدو جہد کے لئے مناسب وسائل بھی مہیا کئے۔ کشمیر کمیٹی نے ان کے ہاں سیاسی شعور پیدا کرنے کو مناسب رہنماؤں کی سیاسی تربیت کی۔

شیخ عبداللہ ہوں یا چوہدری غلام عباس سب اس بات کے معترف ہیں کہ کشمیر کمیٹی نے ان کو ہاتھ پاؤں اور زبان دی۔ ڈوگرہ حکمران جب کشمیر کمیٹی کے لائے ہوئے اس انقلاب سے عاجز آ گئے تو انہوں نے کانگریس سے استمداد کیا اور کانگریس نے اس سیلاب کو روکنے کے لئے اپنے پرانے اور آزمودہ پٹھو احرار کو میدان میں اتار دیا کیوں کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے صدر امام جماعت احمدیہ تھے اور اراکین میں ڈاکٹر اقبال نواب ذوالفقار علی خاں خواجہ حسن نظامی اور دوسرے اکابر تھے۔ یہ سب کچھ تاریخ کے صفحات میں لکھا ہؤا موجود ہے اور کشمیر کے کاز سے ذرا سی شد بد رکھنے والا بھی اس بات سے آگاہ ہے کہ مسلمانانِ کشمیر کی جدو جہد کو سبوتاژ کرنے کے لئے احرار میدان میں اترے تھے۔ چوہدری غلام عباس اپنی کتاب کشمکش میں لکھتے ہیں '' جماعت احرار کے

لیڈروں اور بزرگوں سے جموں اور کشمیر کے لوگوں کو شدید اختلافات تھے یہ تحریک انہوں نے ہمارے شدید اختلافات کے باوجود ایسے حالات میں شروع کی جو اسلامیان ریاست کی اس وقت کی فضا کے لئے سازگار نہ تھی۔۔۔ ہر معقول آدمی اس وقت کسی غیر آئینی کارروائی کو ملت کے مفاد کے خلاف ایک تخریبی حرکت شمار کرتا تھا'' (کشمکش صفحہ ۱۱۷)۔

اب شیخ محمد عبداللہ کی آتشِ چنار دیکھئے ''آل انڈیا مجلس احرار نے شہید گنج لاہور کے معاملہ کے متعلق جو روش اختیار کی تھی اس کی بنا پر اس کی شہرت کو دھکا لگا تھا اب مجلس کے اکابر تحریک کشمیر سے وابستگی ظاہر کر کے اس دھبے کو دور کرنا چاہتے تھے ان کا ایک وفد راجہ ہری کشن کول (وزیر اعظم)۔ کی دعوت پر کشمیر آیا اور سرینگر میں راجہ صاحب کی کوٹھی کے نزدیک لال منڈی میں سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے ایک سجے سجائے ہاؤس بوٹ میں قیام پذیر ہؤا۔ راجہ صاحب کے ساتھ ان کی کئی نجی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں میں کیا کھچڑی پکتی رہی ان کا علم نہیں ہو سکا۔ لیکن شہر میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں کہ راجہ صاحب کے ساتھ سودے بازی ہو رہی ہے کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ پنجاب میں کشمیر کے معاملہ پر حکومت کے خلاف آگ لگی ہوئی ہے مجلس احرار اس پر پانی ڈالنے کے لئے اپنی خدمات کسی خطیر رقم کے عوض پیش کرنے پر آمادہ تھی مجلس احرار کو مالی وسائل کی بڑی ضرورت تھی۔ ان کا مقابلہ بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ سے تھا۔ وہ روپے کا ایندھن ڈال کر اپنی جماعت کا انجن چالو کرنا چاہتے تھے اور تمام ہند میں پھیل جانا چاہتے تھے۔'' آگے چل کر لکھتے ہیں ''میری دوسری گرفتاری کے بعد اکتوبر نومبر اکتیس میں مجلس احرار کا یہ وفد پھر سرینگر آیا۔ بدقسمتی سے اس بار بھی وہ سرکاری مہمانوں کی حیثیت سے ہی آئے۔ وفد کے ارکان نے شکوہ کیا جہاں کشمیر کمیٹی کے نمائندوں کے پاس عام آدمیوں کا تانتا لگا رہتا ہے وہاں ہمیں کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ میں نے جواب دیا آپ کے ہوتے ہوئے سرکار نے یہاں کے مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی اور آپ بدستور ان کی بانہوں میں بانہیں حمائل کرتے رہے آپ کو تو شہیدوں کے گھر جا کر زبانی ہمدردی کا خیال نہ آیا حالانکہ سرکاری موٹریں آپ کے انتظار میں کھڑی رہتی تھیں آپ نے حالات کا چشم دید مشاہدہ کرنے کے لئے معمولی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ اب آپ پھر

سرکاری مہمان ہیں اور ہاؤس بوٹوں میں سرکاری دسترخوانوں کے چٹخارے لے رہے ہیں بھلا عوام آپ کے پاس آئیں تو کیوں؟ حکومت کی گولیوں سے ان کے بے گناہ سینے چھلنی ہو چکے ہیں سرکاری تازیانوں نے ان کے جسم کی کھالوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا ہے انہیں بھانت بھانت کے فرضی مقدمات میں ماخوذ کر کے پریشان کیا جارہا ہے انہیں علاج معالجے کے لئے پیسے کی ضرورت ہے ماہرانہ قانونی مشورے کی ضرورت ہے آپ ان کی ضروریات میں کہیں ان کی دستگیری نہیں کر رہے ہیں مگر کشمیر کمیٹی اپنے خرچ پر وکلاء بھیج کر امداد کر رہی ہے۔ مڈلٹین کمشن کے سامنے اگر کشمیری مسلمان اپنے کیس پیش کر سکے تو کشمیر کمیٹی کی امداد سے۔

اتنا ہی نہیں کشمیر کمیٹی کے نمائندے شہداء اور قیدیوں کے گھروں پر جا کر اپنی بساط کے مطابق نقد و جنس سے ان کا بوجھ ہلکا کر رہے ہیں اس لئے اگر وہ یعنی مسلمانانِ کشمیر آپ کے دیوان خانے کو بھول کر کشمیر کمیٹی کے نمائندوں کا دامن پکڑ لیں تو اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے؟ میرے ان دلائل کا احرار حضرات کے پاس جواب نہ تھا"۔۔۔۔"جب وہ لاہور پہنچے تو ان سے وہاں پوچھا گیا آپ کشمیر میں رہ کر کیا کر آئے ہیں اور آپ نے وہاں کے عوام کے لئے کیا کیا تو اس کا جواب بھلا وہ کیا دیتے۔ بغلیں جھانکنے لگے لیکن اپنی کوتاہیوں اور کوتاہ بینیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے انہوں نے یہ کہانی گھڑ لی کہ شیخ عبداللہ احمدی بن گیا ہے اور وہاں کا سنگین مسئلہ اسی کا ہے"۔ (آتشِ چنار۔ خودنوشت شیخ محمد عبداللہ۔ بحوالہ داستانِ کشمیر مصنفہ عبدالغفار ڈار، سابق ایڈیٹر "اصلاح" سرینگر صفحہ ۶۵۔۶۶)۔ اے کاش مولوی محمد سعید صاحب نے تاریخِ کشمیر کے اس باب سے اتنا اغماض نہ برتا ہوتا۔ اے کاش ایسی غیر حقیقت پسندانہ باتیں ان کے خامۂ عنبر بار سے نہ نکلتیں کہ "احرار کی جماعت نے کشمیر میں ڈوگرے کے ایوانِ اقتدار کو ہلا کر رکھ دیا تھا" (صفحہ ۱۰۰) یا یہ کہ "احرار جو ایک متمرد رجواڑے کو سرنگوں کر چکے تھے" (صفحہ ۹۶) آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کی سلامت طبعی سے دور کی نسبت بھی نہیں رکھتا۔

با ایں ہمہ آپ نے علی گڑھ کالج کے بارہ میں شاہ صاحب کی جو بات بیان کی ہے وہ بان تو لے پاؤ رتی کی ہے "شاہ صاحب نے یونین ہال میں تقریر شروع کرنے سے قبل کہا کہ جب

لاہور سے چلا تو احباب نے کہا اگر علیگڑھ کے مسلمانوں سے خطاب کرنا ہے تو شہر کی جامع مسجد میں تقریر کرنا اور اگر پورے ہندوستان کے مسلمانوں سے کچھ کہنا ہے تو یونیورسٹی میں تقریر کرنا" (صفحہ ۱۱۴)۔ اس بات پر تو ہم بھی احسنت کہنے کو تیار ہیں۔

پنجاب کی اردو صحافت کے دو بڑے اخباروں کی چپقلش کا قصہ بڑے مزے کا ہے۔ مہرو سالک نے زمیندار چھوڑ کر اپنا نیا اخبار انقلاب شروع کیا تو زمیندار اور انقلاب میں ٹھن گئی۔ "مولانا ظفر علی خاں چونکہ ہنوز کانگریس سے وابستہ تھے اس لئے ہر قسم کی پھبتی کا ہدف بنے۔ انقلاب کی پشت پر نوجوان شعرا کا ایک گروہ تھا حفیظ، تاثیر، بخاری، ہری چند اختر، میکش۔ ادھر مولانا چومکھی لڑ رہے تھے انہوں نے ایک روز ایک ایسا مصرعہ لکھ دیا جس نے بڑے رکھ رکھاؤ سے اس طائفہ کے ایک مقتدر رکن کی داستانِ عشق کو بے نقاب کر دیا اس کاری ضرب کا لگنا تھا کہ یہ قلمی جنگ فوراً رک گئی" (صفحہ ۳۹)۔ مولانا سالک نے بھی اپنی سرگزشت میں اس قضیۂ نامرضیہ کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں "زمیندار نے کہیں لکھ دیا کہ یہ سالک و مہر اتنے بڑے انشا پرداز اور اخبار نویس بن گئے تو یہ مولانا ظفر علی خاں ہی کی صحبت اور شاگردی کا فیض ہے۔ میں نے "افکار" میں لکھا کہ اگر مولانا کا فیضِ صحبت ایسے کرشمے دکھا سکتا ہے تو اس کا اثر اختر علی خاں پر کیوں نہ ہوا؟ آیا زمین شور تھی یا تخم ناقص تھا۔ بس پھر کیا تھا اللہ دے اور بندہ لے۔ زمیندار بھر گیا۔۔۔۔ ہماری صفوں میں حفیظ جالندھری تاثیر مرحوم ہری چند اختر اور دوسرے احباب بھی تھے اور ادھر میدان صحافت کا پرانا پھکیت تنِ تنہا چومکھی لڑ رہا تھا۔۔۔ دو ماہ بعد ہمارا محاصرہ اتنا سخت ہو گیا کہ مولانا نے از راہِ کرم ہمیں معاف کر دیا" (سرگزشت صفحہ ۲۲۳)۔ اگر آہنگِ بازگشت کے راوی شیوہ بیان نے وہ پر اسرار مصرعہ بھی لکھ دیا ہوتا جس نے انقلاب والوں کا ناطقہ بند کر دیا تھا تو دونوں کے موازنہ سے قارئین محظوظ ہوتے۔

اس خودنوشت میں جستہ جستہ ایسی باتیں بھی معرضِ بیان میں آ گئی ہیں جو آج کے قاری کو بڑی کشش کرتی ہیں۔ کانگریس پر ایک انگریز مبصر کی پھبتی کہ "کانگریس تو موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور گاندھی کا نام ہے۔ باپ بیٹا اور روح القدس!" (صفحہ ۴۲) جاپانیوں نے ایک روز

دعویٰ کیا کہ انہوں نے اتحادیوں کے بے شمار جہاز ایک ہی ہلے میں غرق کر دئے ہیں۔ ڈان نے سرخی لگائی wishful sinking (صفحہ ۲۳۵) اسی اخبار کے سابق ایڈیٹر پوتھان جوزف پھبتی کہنے میں لاجواب تھے۔ ایک روز کہنے لگے "پاکستان ریاضی میں صفر کی طرح ہے۔ قیمت کچھ نہیں مگر ریاضی کا عظیم الشان علم اس کے بغیر ہیچ ہے" (صفحہ ۲۳۳) پروفیسر بخاری اور تاثیر کی عالمانہ چشمک کی ایک جھلک۔ گورنمنٹ کالج کے سٹاف روم میں محمد حسن عسکری کا مقالہ تھا "ادب میں منصوبہ بندی" بخاری صاحب اور صوفی تبسم بھی موجود تھے۔ مقالہ ختم ہوا تو "بحث کا آغاز کرنے کے لئے ڈاکٹر تاثیر نے دعوت کچھ یوں دی کہ "بخاری صاحب اور لوگ تو سوچ کر کچھ کہیں گے آپ ہی ابتدا فرمایئے" (صفحہ ۲۹۹)۔

اور اب ایک قصہء پارینہ۔ "اخباری دنیا کا آسمان اگرچہ ہر آفتابِ تازہ کے جلووں سے روشن ہوتا تاہم اس کے افق پر کوئی ٹوٹا ہوا تارا بھی لمحہ دو لمحہ کے لئے چمک جاتا ہے۔ ایک صبح غلام حسین تھادر کی طرف سے پیغام آیا کہ کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں میرے یہاں آ جایئے۔ میں ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ تو دیکھا ایک خاتون بیٹھی ہیں سر پر رومال چہرہ جھریوں کی وجہ سے شکن در شکن۔ کندھے جھکے ہوئے۔ اس نے یکلخت دو ایسی آنکھیں جو کبھی آفت کا پرکالہ رہ چکی ہونگی مجھ پر جما دیں اور پکاریں "اف خوفناک داڑھی" میں نے عرض کیا "محترمہ! یہ پہلی داڑھی تو نہیں جس سے آپ کو واسطہ پڑا ہو"۔ یہ جملہ سنتے ہی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا یہاں تک کہ کانوں کی مرجھائی ہوئی لویں تک تمتما اٹھیں۔ ہر جھری رگِ جاں بن گئی۔ تھادر نے یہ کیفیت دیکھی تو مجھ سے پوچھنے لگے آپ انہیں جانتے ہیں؟ میں نے کہا کہ انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ میں انہیں جانتا ہوں۔ دورانِ خون درست ہوا تو عطیہ فیضی نے اپنے ایوان فنونِ ثلاثہ کے مقاصد پر بڑی شوخ سی تقریر کر ڈالی اور اخبار میں چھپنے کے لئے ایک بیان دے گئیں۔۔۔ خبریں چھپتی رہیں۔ ایک روز آئیں تو کمرے کے باہر ہی مجھے بلا لیا کہنے لگیں ہمارے ایوان میں تشریف لایئے اور پھر ذرا آنکھ جھپک کے کہا ایک سے بڑھ کر ایک نادرہء روزگار سے ملاقات کراؤں گی۔ ان کے ہاتھ میں کسی کم رو صاحبزادی کی تصویر تھی میں نے پوچھا "یہ آپ کے ایوان کی رکن ہیں؟

"ماتھے پر ہاتھ مار کر کہنے لگیں "ہائے مولوی کے مذاق کو کیا ہو گیا ہے؟" میں نے کہا "مولوی کے مذاق کو کچھ نہ کہیئے" اتنا سن کر ٹھٹکیں میں نے فوراً جملہ مکمل کر دیا "حوروں سے کم پر نہیں مانتا"۔ میرا اتنا کہنا تھا کہ کھلکھلا کے ہنسیں ۔۔۔ بہرکیف کچھ مدت کے بعد وہ معروف منظر کراچی کی گذرگاہوں پر پھر نہ دیکھا گیا جس میں آگے آگے عطیہ ہوتیں اور ان کے پیچھے چھتری سنبھالے فیضی رحمین"۔ (صفحہ ۶۱۳) اور میں سوچ رہا ہوں کہ صاحب آہنگِ بازگشت کے قارئین میں کتنے ہونگے جنہیں یہ باتیں پڑھ کر شبلی اور شبلی کا یہ شعر یاد آیا ہوگا کہ من فدائے بتِ شوخے کہ بہنگامِ وصال۔ بمن آموخت خود آئینِ ہم آغوشی را؟ غرض یہ کتاب ایسی خوشگوار باتوں سے بہت دلچسپ بن گئی ہے اور اہل ذوق کے پڑھنے کے قابل۔

ایک آدھ واقعاتی غلطی تو ہر انسان سے ہو جاتی ہے صحافی بھی اس سے مبرا نہیں ہوتے۔ ۱۹۵۳ کے ہنگاموں کا ذکر ہے "حالات تیزی سے بے قابو ہونے لگے تو خواجہ ناظم الدین لاہور پہنچے اور انہوں نے آتے ہی دولتانہ کو برخواست کر کے شہر کو فوج کے سپرد کر دیا" (صفحہ ۳۳۸) یہ جملہ اس لئے درست نہیں کہ شہر تو خواجہ صاحب کے لاہور آنے سے پہلے فوج کے سپرد ہو چکا تھا۔ دولتانہ کی برطرفی اس کے بعد وقوع میں آئی۔ خیر تقدیم و تاخیر کو نظرانداز کیا جا سکتا ہے مگر اس سلسلہ میں ہمیں مولانا سالک کا ایک فکاہیہ یاد آ رہا ہے۔ دولتانہ برطرف ہوئے تو خبر آئی کہ آپ بحالیء صحت کے لئے لندن جا رہے ہیں۔ ان کی جگہ نون صاحب وزیر اعلیٰ بنائے گئے۔ دوسرے روز دولتانہ صاحب کا بیان آیا کہ وہ لنڈن نہیں جا رہے اپنے گاؤں لڈن جا رہے ہیں۔ سالک صاحب نے اپنے افکار و حوادث میں لکھا "دولتانہ صاحب جہاں چاہیں جائیں آخر لنڈن اور لڈن میں "نون" کا ہی تو فرق ہے"۔ اب ایسی باتوں سے اپنے مطائبات میں نکتہ آفرینیاں کرنے والے کتنے رہ گئے ہیں؟

✓

ہنگاموں میں زندگی

خالد حسن نے میری کتاب ''پس نوشت اور پسِ پس نوشت'' پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے کالم میں لکھا تھا کہ میں نے لاہور یا کراچی میں اپنے جاسوس مقرر کر رکھے ہیں جو مجھے نہ صرف خودنوشتوں کی موجودگی سے آگاہ کرتے ہیں بلکہ مہیا بھی کرتے ہیں اور نیرنگیء قدرت دیکھئے کہ واشنگٹن سے خالد حسن نے ہی ایک بھولی بسری خودنوشت کا مجھے نہ صرف پتہ دیا ہے بلکہ مجھے اس کی فوٹو کاپی کروا کے دی ہے اور آج کی ڈاک میں وہ خودنوشت مجھے مل بھی گئی ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کی بھانجی کے بیٹے اور عشرت حسین خلف الرشید اکبر الٰہ آبادی کے داماد جناب مشتاق احمد خان وجدی سابق کمپٹرولر اینڈ آڈیٹر جنرل آف پاکستان کی سرگزشت ''ہنگاموں میں زندگی'' ۔ میں خالد حسن کا دو وجہ سے احسان مند ہوں ایک یہ انہوں نے اس وثوق سے اپنے کالم میں میرے مبینہ جاسوسوں کا ذکر کیا کہ بی بی سی کے عارف وقار نے مجھ سے باقاعدہ وضاحت طلب کر لی کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ اور دوسرے یوں کہ رطب ویابس سے بھرپور خودنوشتوں کو کھنگالتے کھنگالتے جی اوبھ گیا تھا مدتوں کے بعد ایک اچھی خودنوشت مطالعہ میں آئی ہے۔ دولتے ہست کہ یابی سر راہے گاہے۔

یہ خودنوشت پہلی بار لاہور سے ۱۹۷۴ میں شائع ہوئی اور دوسری بار ۱۹۸۰ میں۔ دو سو بیس صفحے کی اس کتاب پر قیمت بارہ روپے لکھی ہوئی ہے۔ آج کے زمانہ میں جو بھی اس قیمت کا ذکر سنے گا وہ حیران ہوگا کہ افراط زر کے ہاتھوں ہماری اقتصادیات کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا۔ جی تو چاہتا ہے کہ افراط زر سے نبٹنے کا جو نسخہ مشتاق صاحب نے بیان

کیا ہے وہ لکھ دوں مگر یہ بھی سوچتا ہوں کہ کہیں ہماری شریعت پسند قوم اس پر عمل درآمد کرنے پر نہ تل جائے۔ آپ مشرقی پاکستان میں جوٹ بورڈ کے مالی مشیر تھے۔ آگے خود ان کی زبانی سنئے ''پٹ سن کے دام اتنے بڑھ گئے کہ مجھے افراط زر کا خیال ہوا۔ چیف منسٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ ٹیکس لگا کر اس کا سد باب کرنا چاہئے۔ انہوں نے فرمایا اس کی یہاں ضرورت نہیں افراط زر ہو ہی نہیں سکتا۔ جوٹ کے دام بڑھتے ہیں تو جس کی ایک بیوی ہوتی ہے دوسری شادی کر لیتا ہے اس طرح زیادہ تر آمدنی کھانے پینے پر خرچ ہو جاتی ہے اور حساب برابر ہو جاتا ہے۔ میں نے پوچھا دام گرتے ہیں تو کیا ہوتا ہے؟ فرمایا کہ طلاق دے کر بیوی کو باپ کے گھر واپس کر دیا جاتا ہے۔ میں خاموش واپس ہوا خیال آیا دنیا بھر کے ماہرین معاشیات کو افراط زر اور قلت زر کی بڑی فکر رہتی ہے کیوں نہ ان کو دعوت دی جائے کہ یہاں آ کر اس کا آسان علاج سیکھ جائیں'' (ہنگاموں مین زندگی صفحہ ۱۶۷)۔ مگر یہ خودنوشت اس قسم کے مفید نسخوں سے ہی بھری ہوئی نہیں ہے۔ دعوت فکر دینے والی خودنوشت ہے۔

اس خودنوشت میں اکبر کے بارہ میں دو باتیں پڑھیں جو ہمارے لئے نئی تھیں ایک تو یہ کہ اکبر اوائلِ حیات میں ''جمنا برج پر آٹھ روپے ماہوار پر ملازم رہے'' (صفحہ ۸) دوسرے یہ کہ حضرت اکبر نے ''تین شادیاں کیں۔ تیسری بیوی بوٹا نامی ایک طوائف تھی۔ سنتے ہیں مرتے وقت بوٹا نے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں توبہ اور نکاح کر کے مرنا چاہتی ہوں حضرت اکبر نے اس خواہش کا احترام کیا بوٹا کی قبر خاندانی قبرستان میں حضرت اکبر کے مزار کے قریب ہی ہے اس قبر کی لوح پر حضرت اکبر کے کچھ اشعار بھی کندہ ہیں لیکن خاندان والوں کو اس تذکرے سے شرم آتی ہے'' (صفحہ ۷۴) حضرت اکبر طوائفوں پر خاص مہربانی کرتے تھے۔ گوہر جان کو بھی تو ایک شعر لکھ کر ادب میں زندہ کر دیا تھا ''کون خوش قسمت ہے اس دنیا میں گوہر کے سوا۔ سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا''۔ ہمارے جوش صاحب نے بھی تو انور بائی سے محض پان کھانے کی خاطر اسے ایک رباعی لکھ کر دے دی تھی۔ ''جوش صاحب نے آگرہ والی انور بائی کو سنا تو کہا صاحب ان کے ہاتھ سے پان کھلوایئے۔۔۔انور بائی نے کہا میں مفت میں پان کسی کو نہیں کھلاتی۔ جوش صاحب نے کہا ہم

قیمت ادا کرتے ہیں اور فی البدیہہ رباعی کہی۔ اس سانولی مطربہ کی اللہ رے شان۔ گھل جاتی ہے چہرے کے نمک میں ہرتان۔ یوں نغمہ دمک اٹھتا ہے اس کے رخ پر۔ جس طرح کہ سونے کا کسوٹی پہ نشان۔ انور بائی نے یہ رباعی اپنے لئے جب سنی تو کہا جوش صاحب اب تو میری جان حاضر ہے آپ پان کو کہتے ہیں'' (اخلاق احمد دہلوی میرا بیان صفحہ ۱۷۰)

مشتاق احمد وجدی صاحب الہٰ آباد میں پیدا ہوئے۔ سندھ میں سفر کر رہے تھے کہ ایک مقام پر کسی نے کہا الہٰ آباد آ گیا۔ بس وہیں سے ان کی یادوں کا کارواں رواں ہو گیا۔ انہیں اپنا چھوڑا ہوا وطن یاد آنے لگا الہٰ آباد جس کے بارہ میں اکبر نے فرمایا تھا ''اب الہٰ آباد میں ساماں نہیں بہبود کے۔ یاں دھرا کیا ہے سوا اکبر کے اور امرود کے'' مگر ''اس وقت بھی وہاں پنڈت موتی لال نہرو تھے۔۔ مدن موہن مالویہ تھے سر تیج بہادر سپرو تھے جن کی فارسی اور عربی کی قابلیت کا لوہا بڑے سے بڑے مولوی مانتے تھے۔ سر محمد سلیمان تھے جنہوں نے نظریہء اضافیت پر اس وقت مقالہ لکھا تھا جب دنیا میں اس کے سمجھنے والے دس گیارہ سے زیادہ نہ تھے'' (صفحہ ۸) مگر انہیں الہٰ آباد کے نہرو خاندان کی عورتیں بھی یاد ہیں ''جو حسن و جمال نفاست اور نزاکت کی پیکر سپید کھدر میں ملبوس وہ عجیب و غریب نظارہ پیش کرتیں کہ اس کو دیکھنے کے لئے دور دور سے لوگ آتے'' (صفحہ ۳۴) تھے۔ مدتوں بعد آکاش وانی سے وجے لکشمی کی آواز سنتے ہیں تو ان کا دل مچلنے لگتا ہے'' وہ زمانہ یاد آیا جب ہم ان کا ''تماشائے بیک کف بردن صد دل'' دیکھنے کانگریس کے جلسوں میں جایا کرتے اور دل کو سمجھاتے من کیستم کہ خواہم در پہلوش نشستم'' (صفحہ ۶۵)

اس باب کے سر عنوان کے طور پر آپ نے کیا مزے کا اردو شعر لکھا ہے حالانکہ آپ نے التزام کے ساتھ پرانے بزرگوں کی روایت قائم رکھتے ہوئے جہاں بھی شعر کا حوالہ دیا ہے فارسی شعروں کا سہارا لیا ہے اور شعر نگینہ کی طرح جڑ دئے ہیں ''یاد بھولی ہوئی پھر ایک کہانی آئی۔ دل ہؤا خون طبیعت میں روانی آئی''۔ اور ہمیں بھی ایک بھولی ہوئی بات یاد آئی کہ مسز پنڈت جس زمانہ میں یو این میں ہندوستان کی سفیر تھیں ''سید حسین (ان کے سابق مسلمان شوہر) بھی وہیں مقیم تھے اس زمانے کے متعلق سنا ہے کہ سفیر صاحبہ اپنے ہاتھوں سے سید حسین صاحب کو کھانا پکا کر کھلاتیں

اور ان کی لڑکیاں ان کے کمرے کو پھولوں سے آراستہ رکھتیں'' (صفحہ ۶۷) اس زمانہ میں سر ظفر اللہ خان پاکستان کے مستقل مندوب اور سفیر کبیر تھے۔ کسی پریس کانفرنس کے بعد دونوں یعنی مسز پنڈت اور ظفر اللہ اتفاق سے ایک صوفے پر بیٹھے بے تکلفی کے ماحول میں باتیں کر رہے تھے کہ کسی نے تصویر کھینچ لی اور اس بے تکلفانہ انداز کی یہ تصویر صدر ایوب کو بھیج دی۔ صدر ایوب نے وزیر خواجہ منظور قادر کو بھیجی اور وزیر خارجہ نے سکرٹری خارجہ کو تبصرہ کے لئے ارسال کر دی۔ سکرٹری خارجہ نے تصویر پر لکھا کہ when a gentleman becomes a diplomat he does not seize to be a gentleman. اور اس تبصرہ کے بعد وہ تصویر فائل کر دی گئی۔ اور شکایت کرنے والے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

ہم نے حسین حقانی صاحب کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے خاص طور سے یہ بات لکھی تھی کہ ہمارے سماجیات کے ماہر تقسیم ہند کا ذکر کرتے ہیں تو وہ ان سماجی حالات کو نظر انداز کر جاتے ہیں جو مسلمانوں اور ہندوؤں مین تفریق کا باعث تھے۔ وجدی صاحب نے بڑی تفصیل سے اس سماجی تفاوت کا جائزہ لیا ہے اور اپنے ذاتی تجربہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہندو اور مسلمان دو ایسی قومیں تھیں جو ایک ملک میں تو رہ رہی تھیں لیکن آپس میں سماجی اختلاط کی روادار نہ تھیں'' با من آویزش او الفت موج است و کنار۔ دم بدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من'' (کہ میرا اور اس کا موج اور ساحل کا معاملہ ہے دم بدم ساتھ بھی ہے اور ہر لمحہ گریزاں بھی) ہندوؤں کے ساتھ رہنا ساتھ پڑھنا ساتھ کھیلنا محبت اور دوستی اور پھر ان کا حقارت آمیز رویہ اور ایسا برتاؤ جو صرف ناپاک جانوروں کے ساتھ جائز ہے زندگی میں ایک عجیب تضاد پیدا کرتا اور محبت و نفرت یگانگت اور دشمنی کے جذبات ساتھ ساتھ برانگیختہ کرتا رہتا ہندو سے ملاقات ہو تو وہ ہاتھ نہ ملاتا گلے نہ لگاتا دور سے ہاتھ جوڑ کر سلام کر لیتا ہندو حلوائی کی دکان سے کچھ خریدو تو پتوں کے دونے میں دور سے ہاتھ میں ٹپکا دیتا کہ کہیں مسلمان کا ہاتھ نہ لگ جائے جہاں ہندو کھانا کھاتا ہو وہاں مسلمان کا سایہ پڑ جائے تو قیامت آ جائے'' (صفحہ ۲۷) یہ عام کی باتیں تھیں مگر ہمارے تقسیم ملک کے بعد کے سوشل ریسرچر ان باتوں سے کلیتہً نابلد ہیں۔

مشتاق صاحب حسن نظامی کے معتقدین میں سے تھے۔ جہاں ان کے حواریوں کے
پاکستان میں چلے آنے اور ناگفتہ بہ حالات سے دوچار ہونے کا تذکرہ ہے وہاں خواجہ صاحب کی
ایک ایسی بات بھی معرض تحریر میں آگئی ہے جو وہ شاید اپنی زندگی میں ظاہر کرنا پسند نہ کرتے۔ حسن
نظامی صاحب کے دوستوں میں سے بھیا احسان الحق اور ملا واحدی دلی کے خاصے خوش حال لوگوں
میں تھے پاکستان آکر ''دلی میں ان کی شان وشوکت دیکھنے کے بعد دونوں سے پاکستان میں ملتا رہا
جتنی مرتبہ ملا گردش آسمان کے کرشموں سے انگشت بدنداں رہا۔ دونوں کو یا تو محلوں میں دیکھا تھا یا
اب جھونپڑوں میں عسرت کی زندگی بسر کرتے دیکھا آخری مرتبہ ملاقات ہوئی تو بھیا دمہ سے
معذور، گرمی میں ٹین کی چھت کے نیچے لیٹے تھے کچھ دنوں کے بعد وصال کی خبر ملی واحدی صاحب
لڑکے کے کوارٹر کے باہر میز لگائے لکھنے میں مصروف تھے بہر صورت دونوں انقلاب زمانہ کا مرقع
تھے'' (صفحہ ۵۴) اور حسن نظامی صاحب ''پہلی مرتبہ کراچی تشریف لائے تو فرمایا کہ مجھے امریکن
سفیر سے ملنا ہے اور مترجم کی ضرورت ہے تم ساتھ چلو۔ میں دفتر سے رخصت لے کر حاضر ہوا اس
دن کی گفتگو سے مجھے تعجب بھی ہوا اور بہت سے خیالات بھی بدل گئے۔ مختصراً انہوں نے کہا کہ میں
انگریزی سرکار کے لئے ہمیشہ ہندوستان میں پروپیگنڈا کرتا رہا اور سرکار برطانیہ کے لئے بہت اہم
کام کئے ہیں آپ چاہیں تو میں امریکن گورنمنٹ کے لئے پاکستان یا ہندوستان میں پروپیگنڈہ
کے لئے موجود ہوں سفیر صاحب سنتے رہے اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس قسم کا کام میرے سپرد نہیں
ہے'' (صفحہ ۵۷)۔

حفیظ جالندھری کے ساتھ الہ آباد کے مسلم بورڈنگ ہاؤس کے مشاعرہ میں یہ ہوا کہ
''حفیظ صاحب کھڑے ہو کر کلام ترنم سے سناتے ہیں بورڈنگ ہاؤس کے لڑکے ایک ڈھولک لے
آئے۔ حفیظ صاحب کی طبع نازک اس بات کو کیسے برداشت کرتی'' (صفحہ ۱۱۶) لاہور والوں نے
ایک لکھنوی نازک بدن شاعر کو بلا کر اس سے حفیظ صاحب کی تذلیل کا بدلہ لیا اور وہ شور مچایا کہ وہ
صاحب اپنا کلام عطا نہ کر سکے۔

تلک الایام نداولہا بین الناس کے زمرہ کا ایک یادگار واقعہ یوں ہے کہ حسن نظامی

صاحب نے بہادر شاہ کے ایک پڑپوتے کو ان کے پاس بھیجا کہ اس نے بجلی کا کام سیکھا ہے اسے
ملازمت دلوا دیں بیچارا بھوکوں مر رہا ہے'' وہ شہزادہ صبح میرے دفتر آیا اتفاق سے جس وقت وہ دفتر
آیا اس وقت انگریز مکینیکل انجینئر میرے کمرے میں موجود تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ
بہادر شاہ کے پڑپوتے سے ملو گے؟ صاحب بہادر نے کہا میری قسمت کہاں کہ یہ عزت حاصل ہو
میں نے کہا اس وقت وہ میرے چپڑاسی کے پاس بیٹھے ہیں اور اس انتظار میں ہیں کہ مجھے فرصت
ہو تو دو منٹ کو ان سے مل لوں اور ہو سکے تو ملازمت حاصل کرنے میں ان کی مدد کروں یہ میرے
اختیار سے باہر ہے تم مدد کر سکتے ہو۔ صاحب میری منت کرنے لگے کہ فوراً ان سے ملاقات
کرائی جائے میں نے بلایا صاحب بہادر کرسی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور انتہائی تعظیم سے ملے اس
وقت تک خود نہ بیٹھے جب تک ان کو کرسی پر بٹھا نہ لیا کچھ دیر کی گفتگو کے بعد ساتھ لے گئے اور فوراً
ایک اچھی جگہ پر ان کو ملازم کرا دیا'' (صفحہ ۵۶)

ملک غلام محمد صاحب کے بارہ میں لوگوں سے ان کی برائیاں تو بہت سنی ہیں اچھائی
مشتاق صاحب کے ہاں بیان ہوئی ہے ''وزارت خزانہ میں کام کرنے کا ایک ایسا اصول بنایا تھا جو
زریں حروف میں لکھ کر محفوظ کیا جانا چاہئے۔ گورنمنٹ کا ڈھانچہ غیر مکمل تھا روز نئے اخراجات کی
تجویزیں آتی تھیں۔ حکم تھا کہ جو تجویز آئے نامنظور کر کے واپس بھیج دو۔ اگر واقعی ضرورت ہو گی تو
وزارت متعلقہ دوبارہ بھیجے گی۔ اب اس پر غور کرو لیکن ضروری نہیں کہ منظور کرلو تیسری مرتبہ آئے تو
سمجھو بغیر اس کے کام نہیں چلے گا اب واقعی ضروری سمجھو تو منظور کرو۔ سرکاری اخراجات کم سے کم
رکھنے کی اس وقت ضرورت بھی تھی۔۔۔۔ صرف غلام محمد صاحب کی سختی اور حسن تدبیر تھی جس نے
قوم کو مالی بحران سے نکالا اور ترقی کے راستے پر ڈالا'' (صفحہ ۱۶۵)

اب آخر میں لاہور میں ان کی پہلی عید کا تذکرہ بھی ہو جائے ''عید آئی یہ پہلی عید تھی کہ گھر
نہ جا سکتا تھا عید گاہ ماغریباں کوئے تو۔ انبساط عید دیدن روئے تو۔ اداس بیٹھا تھا کپڑے بھی نہ
بدلے تھے ایک دوست آواز دیتے ہوئے پہنچے کہ ابھی تک تیار نہیں ہوئے چلو نماز پڑھنے۔ میں
نے جلدی سے کپڑے بدلے وضو کیا اور ان کی موٹر پر شاہی مسجد روانہ ہوا۔ مسجد کے پاس پہنچ کر

انہوں نے کہا تم مسجد میں جاؤ میری جماعت کی نماز علیحدہ ہوتی ہے۔۔۔ میں نے کہا کچھ بھی ہو مسلمانوں کی نماز ہے جہاں تم وہاں میں۔ چنانچہ قادیانیوں کی جماعت میں نماز پڑھی میرے دوست ہی نے امامت فرمائی۔ بڑی مسجد جاتا تو نماز کے بعد جوتے بغل میں دبا کر دھکے کھاتا چلا آتا۔ کوئی الٹ کر بات بھی نہ پوچھتا۔ یہاں سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ باری باری ہر ایک گلے ملا اور ہر شخص سے تعارف ہوا اکثر ممتاز اصحاب موجود تھے۔ مجھے اس توجہ پر تعجب ہوا۔ تین چار دن بعد میرے دوست نے کہا مرزا بشیر (الدین محمود) احمد نے قادیان آنے کی دعوت دی ہے اس عرصہ میں جماعت کے بارہ میں کچھ معلومات حاصل کر چکا تھا شوق ہوا کہ خلیفۂ وقت کی بھی زیارت ہو جائے۔ قادیان گیا اور تین دن مہمان خانے میں رہا وہاں کے مبلغین سے کافی گفتگو رہی مرزا صاحب سے بھی کئی ملاقاتیں رہیں میرے دوست بھی سمجھانے میں مصروف رہے لیکن مجھ پر اثر نہ ہوا۔ مرادلیست بہ کفر آشنا کہ چندیں بار۔ بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم“ (صفحہ ۱۱۷)۔

غرض یہ خودنوشت ایک مخلص اور صاف گو سرکاری افسر کی دردمندانہ سرگزشت ہے جس نے پاکستان کی خدمت کو اپنایا اور آخر دم تک خلوص نیت سے خدمت میں مصروف رہا۔ اور مرنے کے بعد یہیں پیوند خاک ہوا۔ ایسے نیک دل اور نیک سرشت لوگوں کی ہمارے ہاں بہت کمی ہے۔ اور فارسی کا ذوق؟ اسے تو جیسے کسی نے لوکا لگا دیا ہے۔ ہم نے اپنے اس تہذیبی ورثہ کو اپنے ہاتھوں ضائع کر کے اپنے ادبی ذوق پر پانی پھیر دیا ہے۔

وجدی صاحب نے اپنی سرگزشت کو فارسی کے جس شعر سے شروع کیا تھا میں اسی شعر کو خود بیتی سمجھ کر اپنے تبصرہ کو ختم کرتا ہوں۔ شبہائے ہجر را گذراندیم و زندہ ایم۔ ما را ز سخت جانیٔ خود ایں گماں نہ بود۔

✓

جیون دھارا

ہمارے ہاں سی ایس پی کاڈر کے کچھ لوگوں نے جو خودنوشت سوانح عمریاں لکھی ہیں وہ اس بات کا اعلان نامہ ہیں کہ وہ لوگ حاکم ہیں اور دوسرے محکوم۔ ان کی چال ڈھال ان کی وضع قطع ان کے طور اطوار ان کا رہن سہن دوسروں سے الگ ہے۔ ان کے انداز بیان سے بھی وہی تبختر ٹپکتا ہے جو ان کی سروس کا طرہ امتیاز ہے۔ ہاشم رضا کی اردو عنوان والی انگریزی خودنوشت ”ہماری منزل“۔ قدرت اللہ شہاب کی ”شہاب نامہ“ الطاف گوہر کی ”گوہر گزشت“۔ تینوں خود نوشتیں لکھنے والوں نے ہمالہ کی بلندی پر کھڑے ہو کر لکھی ہیں اور دوسروں کو نہ صرف حقیر جانا ہے بلکہ انہیں قدم قدم پر یہ احساس بھی دلایا ہے کہ ساری مخلوق اس بات کی پابند ہے کہ ان کی جھوٹی سچی باتوں کو غور سے سنے اور ان پر ایمان لے آئے۔ مگر ان خودنوشتوں پر لوگوں کا ردعمل سامنے آیا اور انہوں نے انہیں خودستائی، خودنمائی اور کذب بیانی کا پلندہ سمجھ کر رد کرنا شروع کیا تو ہمارے ذہین سی ایس پی افسروں کو بھی اس بات کا احساس ہو گیا کہ اعلیٰ ملازمت پر فائز ہو جانا دوسروں کو حقیر جاننے کا جواز نہیں بن سکتا۔ مقام شکر ہے کہ ان جیسے افسروں کی ایسی خودنوشتیں منظر عام پر آنے لگی ہیں جو زمین پر اتر کر لکھی گئی ہیں اور انگریزی محاورہ کے مطابق down to earth حد تک منکسرانہ ہیں۔ مسعود کھدر پوش کی ”خودنوشت“۔ جناب محمد منصور کاظم کی ”میری داستان“، جسٹس صمدانی کی ”جائزہ“۔ روئیداد خاں کی خودنوشت ”پاکستان ایک خواب پریشاں“ اور اب ۲۰۰۲ء میں جیون خاں کی ”جیون دھارا“۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے شہاب نامہ پر ذرا تلخ سی تنقید لکھی اور اسے اپنی کتاب پس نوشت میں شامل کرنا چاہا تو میرے ایک مرحوم دوست نے یہ کہہ کر اس کتاب کا

دیباچہ لکھنے سے انکار کردیا کہ آپ نے شہاب صاحب پر جو کچھ لکھا ہے اس کے ہوتے ہوئے میں دیباچہ لکھنے اور دنیا بھر کی ملامت کا شکار ہونے کو تیار نہیں۔ یعنی ان افسروں کا رعب داب ایسا تھا کہ لوگ ان پر تنقید لکھنے کی جرات نہیں کرتے تھے۔ مگر وقت بدلا لوگوں نے تلخ تر حقائق کو قبول کرنا شروع کر دیا تو انہی لوگوں کی کذب بیانیوں پر کتابوں کی کتابیں آنے لگیں۔ ان کی افسانہ طرازیوں دروغ بافیوں۔ کے تانے بانے منتشر ہونے لگے اور لوگوں نے جان لیا کہ قرآن پاک کے محاورہ میں ''ان اوہن البیوت لبیت العنکبوت'' کہ مکڑی کا جالا نازک ترین گھر ہوتا ہے۔

جیون خاں متوسط درجہ کے ایک کاشتکار گھرانے میں پیدا ہوئے اپنی محنت سے پڑھ لکھ کر اور خدا ترس ماں کی دعاؤں کے طفیل پاکستان کی مقتدر ترین ملازمت میں شامل ہوئے اور حال ہی میں نیک نامی کے ساتھ وظیفہ یاب ہوئے ہیں۔ اپنی خودنوشت کی پیشانی پر لکھا ہے ''کیکر کی چھاؤں سے کمشنر ہاؤس تک'' حالانکہ کمشنر سے بہت بڑھ کر عہدے انہیں ملے۔ ان کی طبیعت کی سادگی اور مزاج کا انکسار پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ انہوں نے اپنے قبلہ والد گرامی کو ''دہقانِ قدیم'' کہا ہے میں انہیں ''دہقانِ جدید'' کہہ دوں تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کی کاشتکارانہ جبلت نے ان کی افسرانہ شان وشوکت کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا۔ ایم اے کر چکے تھے کہ گاؤں میں اپنے ڈیرہ کی تعمیر میں سر پر گارے کی تغاریاں ڈھو کر حصہ لے رہے تھے کہ ماں نے مالک کل سے فریاد کی بار الہا ''اسے اسی حالت میں رکھنا تھا تو لائق کیوں بنایا تھا''۔ جہانوں کے رب نے ماں کی کوک سن لی اور بیٹا سی ایس پی ہوگیا۔ سی ایس پی ہو جانا ایک ہی جست میں اعلیٰ ترین معاشرتی سطح پر پہنچ جانے کے مترادف تھا'' (جیون دھارا۔ صفحہ ۹۴)۔ اعلیٰ ترین معاشرتی سطح پر پہنچ جانے کے باوجود اس دہقان زادہ نے اپنا آپ بھلا نہیں دیا۔ جہاں رہے جس عہدہ پر رہے آدمی رہے اگرچہ ملازمت کے دوران محکمہ مال کے بددیانت ملازموں پر سخت گرفت کرنے اور ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی وجہ سے لوگوں کی ایسی ''دعائیں'' بھی سننا پڑیں کہ ''جیون اپنا واپس لے لے جیون دینے والے''۔ (صفحہ ۲۳۹) اور ان کا تبادلہ ہوتا تو یہ لوگ سکھ کا سانس لیتے۔

جیون خاں سرگودھا کے کمشنر رہے اور سرگودھے کے اہلِ علم سے رابطہ رکھا۔ پروفیسر غلام

جیلانی اصغر، صاحبزادہ عبدالرسول، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر وزیر آغا سب سے ان کی شناسائی رہی۔ کسی زمانہ میں ربوہ سرگودھے کی کمشنری میں تھا اس لئے ہم بہت کمشنروں سے شناسا رہے۔ حماد رضا، قاسم رضوی، شیخ محمد حسین، محبوب احمد اور پھر اپنے تعلیم الاسلام کالج کے اولڈ بوائے رضا علی۔ سب لوگ ہی ہماری دعوت پر ربوہ آتے رہے۔ کمشنر کے مرتبہ تک پہنچ جانے والے متعصب نہیں ہوتے۔ اگر ربوہ سرگودھے کی کمشنری میں رہتا تو عین ممکن ہے جیون خاں بھی تشریف لاتے۔ ہمیں تو ان کی خودنوشت پڑھ کر اپنے سرگودھا کے دوست یاد آتے رہے مگر جملہ معترضہ کے طور ایک قصہ بھی کہہ دیں کہ اس کا تعلق محکمہ مال سے ہے۔ ایک روز صحر دوپہر کو ہم وزیر آغا کی کوٹھی نمبر ایک ریلوے روڈ پہنچے۔ نوکر نے بتایا کہ آغا صاحب آرام کر رہے ہیں۔ ہم نے کہا انہیں اطلاع تو کر دو کہ پروازی صاحب آئے ہیں۔ ذرا سی دیر کے بعد دیکھا کہ آغا صاحب بجائے ہمیں اندر طلب کرنے کے ننگے سر سلیپر پہنے تیز تیز ہماری طرف چلے آ رہے ہیں۔ ہمیں دیکھا تو سکھ کا سانس لیا۔ جب اوسان بحال ہوئے تو فرمانے لگے کہ نوکر نے آ کر کہا کہ آغا جی پٹواری صاحب آئے ہیں تو میری تو سٹی گم ہوگئی۔ اب آپ کو دیکھا ہے تو جان میں جان آئی ہے۔ ہم نے آغا صاحب کی باتوں کو مذاق میں اڑا دیا مگر اب جیون دھارا پڑھی ہے تو معلوم ہوا ہے کہ پٹواری کاشتکاروں کے لئے کیا حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ ان کا ایک بیٹا پٹواری بنے۔ غالباً اسی تمنا کی آبیاری میں ''یکے بعد دیگرے چار بیٹے پڑھنے کے لئے بھجوائے اتفاق ہے کہ یہ چاروں پڑھائی میں ہوشیار نکلے پٹواری کوئی نہ بن پایا۔ ایک سی ایس پی افسر ہوا۔ دوسرے جج تیسرے سرجن اور چوتھے بینکار۔ ان میں سے کوئی ایک بھی پٹواری ہوتا تو وہ شاید زیادہ خوش ہوتے۔ کاشتکاروں کی دنیا میں اوپر ذات باری اور نیچے پٹواری یونہی نہیں کہا گیا'' (صفحہ ۲۳)۔ بیٹے عید بقر عید پر اکٹھے ہوتے اور کوئی کہہ دیتا کہ بابا پٹواری تو کوئی نہ بن پایا تو اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے فرماتے پٹواری پٹواری ہوتا ہے اصل حاکم۔ باقی سب ہوا کے گھوڑے ہیں'' ۔۔۔۔۔ (صفحہ ۲۶)۔ ان کی خودنوشت گواہی دیتی ہے کہ جیون خاں ہوا کے گھوڑے پر سوار نہیں رہے۔

اس خودنوشت کا محرک بھی یہی آرزو ہوئی کہ ''زمانہ کا دیا ہوا جو کچھ اپنی زنبیل میں ہے

اسے بانٹ دوں" (صفحہ ۱۲) وہی ساحر والی بات کہ دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں۔ جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں۔ مگر آپ نے اپنی سروس کو خسروانہ جادونگری ہی کہا ہے اور انہیں یقین ہے کہ لوگ باگ اس خسروانہ جادونگری کی باتیں جاننے سننے کو بیتاب رہتے ہیں۔ مگر جیون دھارا کی حد تک اس میں نہ کوئی بات خسروانہ ہے نہ ہی ماحول کسی جادونگری کا ہے۔ یکدم کاشتکارانہ ماحول سے نکل کر اس جادونگری میں داخل ہونے والے کے بگڑ جانے کے امکانات بہت تھے مگر جیون خاں ثابت قدم رہے اس لئے اپنے آپ کو "غریب لاوارث" (صفحہ ۱۶۷) اور "بے آسرا" (صفحہ ۱۷۶) سول سرونٹ سمجھتے رہے۔ "ریٹائرمنٹ تک موٹر کار خریدنے کے لئے پیسے اکٹھے نہ کر سکے" (صفحہ ۱۶۷) چونکہ اپنی لغت سے "ناممکن" کا لفظ کاٹ چکے تھے (صفحہ ۴۸) اس لئے اپنی دیانت داری اور جفاکشی کے سبب ترقی کے راستوں پر اولوالعزمی کے ساتھ قدم مارتے رہے اور ان کے لئے راہیں کھلتی چلی گئیں۔ انہیں افسر بھی ایسے ملے جو فرض شناسی میں مثال سمجھے جاتے تھے۔ امتیازی صاحب دورہ پر جا رہے تھے کہ گاڑی رستے میں خراب ہوگئی۔ مگر آپ نے اسی طرف جاتے ہوئے ایک ٹرک والے کو روکا اور "ٹرک پر بیٹھ کر منزلِ مقصود پر پہنچ گئے" (صفحہ ۱۷۸) حالانکہ ان کے ساتھی اے۔جی رضا صاحب پروٹوکول کے بہت رسیا تھے۔ جیون خاں نے امتیازی صاحب کی امتیازی خصوصیت کو اپنا رہنما بنایا ہے اے۔جی رضا صاحب کی رضا پر "راضی برضا" نہیں ہوئے۔

ہمارے اپنے یونیورسٹی کے زمانہ کے ڈبیٹر ساتھیوں کا ذکر ہے اور الحمدللہ کہ ذکرِ خیر ہے جاوید قیوم کا جو ہماری یونیورسٹی یونین کے صدر رہے اور پرویز مسعود کا جو گورنمنٹ کالج کے نمایاں مقرر تھے۔ حالانکہ ہم نے جن جگادھری سول سرونٹس کا ذکر آغاز میں کیا ہے وہ تو اپنے سوا کسی اور کو قابلِ اعتنا ہی نہیں سمجھتے تھے اور جس جس کو معرضِ بیان میں لاتے اسے طنز و تضحیک کا نشانہ ہی بناتے۔ اسی طرح ان کے ہاں دو مرحوم دوستوں کا ذکر بھی اچھا لگا قاسم رضوی کا اور مظفر قادر کا۔ قاسم رضوی سول سروس اکیڈمی کے ڈائریکٹر تھے کہ ان کی والدہ محترمہ کا انتقال ہوگیا۔ میں اتفاق سے لاہور میں تھا تعزیت کے لئے حاضر ہوا تو تنہا بیٹھے تھے میرے گلے لگ کر پھوٹ

پھوٹ کر روئے کہنے لگے تم پہلے شخص ہو جس نے جھانک کے دیا ہے خدا معلوم امی کے جنازہ میں بھی کوئی آئے گا کہ نہیں؟ ان کی برطرفی کی خبر عام ہو چکی تھی۔ اس لئے وہ اس المناک تنہائی کا شکار تھے۔ لوگ تو ہوا کا رخ دیکھتے ہیں۔ مظفر قادر ہماری بیوی کے استاد اور بزرگ پروفیسر عبدالقادر صاحب کے صاحبزادے تھے اور ایسے رعب داب کے ڈپٹی کمشنر تھے کہ کیا کوئی انگریز ہوگا۔ وہ بھی بھٹو صاحب کی کینہ توزی کا شکار ہوئے اور باغ جناح میں ورزش کرتے ہوئے ایسے گرے کہ پھر نہ اٹھے۔ ہم نے اس جواں مرگ کی موت پر پروفیسر عبدالقادر کو دیکھا تو بہت رحم آیا۔ لوگ انہیں ہمیشہ قادر صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ اس روز میری بیوی سے کہنے لگے بیٹی مجھے قادر نہ کہو عبدالقادر کہو ہم کہاں کے قادر ہیں؟

بھٹو صاحب کے زمانہ میں "سول سرونٹس کو مکھی مچھر کی طرح تلف کیا جا سکتا تھا" (صفحہ ۲۱۱) اس لئے ان کے سامنے بڑے بڑے سورماؤں کا پتہ پانی ہوتا تھا۔ جیون خاں نے ایک منجھے ہوئے بیوروکریٹ کی طرح اپنی رائے محفوظ رکھی ہے حالانکہ بھٹو صاحب کی سخت گیر اور عاقبت نااندیشانہ پالیسیاں پاکستان کو آگے لے جانے کی بجائے صدیوں پیچھے لے گئیں۔ صنعتی اداروں اور تعلیمی اداروں کو قومیانے کا نتیجہ آج تک قوم بھگت رہی ہے۔ بھٹو صاحب کی اسی علت کا شاخسانہ تھا کہ ہمیں بھی ایک بار جیون خاں صاحب کے سامنے پیش ہونے کا موقع ملا۔ جیون خاں اس وقت پنجاب کے محکمہ تعلیم کے سکرٹری تھے۔ کالجوں کے قومیائے جانے کے بعد ۱۹۷۵ میں ہمیں اوساکا یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز جاپان کی طرف سے اردو کے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بلایا گیا۔ ہم نے تمام سرکاری ضوابط کے مطابق ڈیپوٹیشن کی درخواست دی جو بعد از خرابیء بسیار منظور ہوئی اور ہم وزیٹنگ پروفیسر بن کر جاپان چلے گئے۔ چار سال دنیا کی اس تیسری بڑی درسگاہ لسانیات میں گذارنے اور پوسٹ گریجوایٹ لیول پر تدریس کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد ہم پاکستان واپس پہنچے تو متعصب ڈی پی آئی نے ہمیں انٹرمیڈیئٹ کالجوں میں دھکے دینا شروع کیا۔ ظلم کی انتہا وہاں ہوئی جہاں ہمیں ایک دیہی انٹرمیڈیٹ کالج میں تعینات کیا گیا جہاں کا پرنسپل محض لیکچرار تھا اور اردو پڑھنے والوں کی تعداد بمشکل ایک استاد کی متقاضی تھی اور وہ استاد پہلے

سے موجود تھا۔ ہم نے بہت واویلا کیا درخواستیں دیں مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ ہم نے بطور احتجاج سروس پر جانا چھوڑ دیا اور محکمہ کو اطلاع دے دی۔ بارے الیکشن ہوئے تو ہمارے ایک شاگرد عزیزم غلام عباس ایم پی اے بنے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں سکرٹری تعلیم کے پاس آپ کو لئے چلتا ہوں امید ہے یہ ہمدرد سکرٹری آپ کی شنوائی کرے گا۔ چنانچہ ہم حاضر ہوئے۔ جیون خاں صاحب نے ان کی باتیں تو یک گونہ توجہ سے سنیں مگر انہیں اس بات کی سمجھ نہیں آتی تھی کہ آخر ایک سینئر پروفیسر کو ایسے اداروں میں دھکے دینے کی کیا تک ہے؟ بہرحال آپ نے ہمارا کیس نکلوا کر پڑھا ہوگا۔ اگلی بار ہم حاضر ہوئے تو دو ایک سوال پوچھنے کے بعد آپ نے ہمیں تنبیہہ کے بعد بحال کر دیا۔ ہم نے عرض کیا کہ کم از کم ہمیں کسی ایسے ادارے میں تو بھیجیں جہاں ہم طلبا کے لئے کچھ مفید کام کر سکیں۔ آپ نے ہماری بات سن لی مگر کچھ کہہ کے نہیں دیا۔ دو چار ہفتوں کے بعد ان کا حکم ملا کہ ہمیں گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں تعینات کیا جاتا ہے۔ اس کالج میں اردو کی پوسٹ گریجوایٹ کلاسیں تھیں اس لئے ہم فوراً سروس پر حاضر ہو گئے۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ سکرٹری تعلیم تعلیم و تعلم سے دلچسپی رکھتا ہے۔ ان جیسے دو چار اور سکرٹری تعلیم ملک کو مل گئے ہوتے تو تعلیم کا بیڑا پار ہو جاتا۔

ہمارے ہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ ایس ڈی ایم قصور تھے کہ ڈی سی کی جانب سے انہیں شکایت ملی کہ عدالتوں کے فیصلے عدالتوں میں نہیں کسی وکیل کے چیمبر میں لکھے جاتے ہیں۔ خود جا کر تحقیقات کریں۔ یہ وہاں پہنچے وکیل کا چیمبر کھلوایا تو کئی فیصلہ طلب فائیلیں موجود پائیں۔ رپورٹ اوپر بھیج دی مگر کسی بڑے کی سفارش پر معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اب ہماری بھی سن لیں۔ کچھ عرصہ پہلے ہمارے ایک دوست جو سپریم کورٹ بار کے صدر ہیں مجری ادب سے متعلق سیمینار کے تعلق میں سویڈن تشریف لائے۔ ایک دو دن تاخیر سے پہنچے تو ہم نے تاخیر کی وجہ پوچھی۔ فرمانے لگے ایک جج ہیں جنہیں فیصلے لکھنے نہیں آتے ان کے دو تین فیصلے جاری ہونے والے تھے ان کو لکھنے میں مصروف رہا اس لئے دیر ہو گئی۔ ہم ان صاحب کی طبیعت سے اپنے یونیورسٹی کے زمانہ سے واقف تھے کہ ہمیشہ دون کی لیتے ہیں اور تعلّی بگھارنا ان کا معمول ہے اس لئے ہم نے ان کے اس ارشاد کو اسی زمرہ میں شمار کر کے نظر انداز کر دیا۔ اب جیون دھارا پڑھی ہے

تو "باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا"۔ چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی۔ (یہ مصرعہ سن کر ہمارے ایک دوست کہا کرتے ہیں مسلمانی میں اتنی سکت ہی کہاں رہ گئی ہے کہ کہیں جائے گی؟ کہیں نہیں جائیگی یہیں بیٹھی ایڑیاں رگڑتی رہے گی)۔

یہ خودنوشت ہمارے ایک ہم عصر کی خودنوشت ہے اس لئے ان کی باتیں جہاں تہاں ہماری یادوں کو مہمیز کر جاتی ہیں۔ وقار صاحب اسٹیبلشمنٹ کے سکرٹری تھے۔ جیون خاں نے درست کہا کہ "وہ سی ایس پی والوں کے خلاف ادھار کھائے بیٹھے تھے" (صفحہ ۲۰۰)۔ ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر محمد عارف سی ایس پی کو امریکہ سے پی ایچ ڈی کرنے کا وظیفہ مل گیا تھا مگر وقار صاحب نے انہیں امریکہ بھیجنا اپنے وقار کے منافی جانا۔ اگلی بار بھی ایسی ہی صورت حال کا خدشہ ہوا تو محمد عارف نے ہمیں کہا کہ کیا کوئی صورت ایم ایم احمد صاحب سے سفارش کی ہو سکتی ہے؟ ہم نے اسے بتایا کہ ہم ایم ایم احمد کے والد محترم کے ساتھ خدمت کر چکے ہیں اور ایم ایم احمد اس بات کو جانتے ہیں امید ہے وہ ہماری بات پر کان دھریں گے۔ ہم عارف کو لے کر ایم ایم احمد صاحب سے جا ملے۔ احمد صاحب نے ہماری بات سنی عارف کا شاندار تعلیمی ریکارڈ دیکھا وقار صاحب سے فون ملایا اور صرف یہ کہا کہ مجھے پلاننگ کے میدان میں ذہین اور اچھے ماہرین اقتصادیات کی ضرورت رہتی ہے ایسا ہی ایک قابل لڑکا میرے سامنے بیٹھا ہے اور پی ایچ ڈی کے لئے امریکہ جانا چاہتا ہے۔ اس بات نے اثر کیا اور محمد عارف وظیفہ پر امریکہ چلا گیا۔ پی ایچ ڈی کر کے واپس آیا اور پنجاب کا چیف اکانومسٹ بنا پھر پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ بورڈ کا صدر نشیں بنا۔ مگر اجل ہر ایک کی گھات میں لگی ہے عارف کو جلد ہی اس نے اچک لیا۔ یہ قابل اور ہونہار افسر رہگزائے قضا ہو گیا۔ لوگ اب بھی اسے یاد کرتے ہیں۔ تمہاری خوبیاں زندہ تمہاری نیکیاں باقی۔

مجاہد اسلام ضیاء الحق کے ریفرینڈم کا ذکر ہے کہ لوگ آئے نہ آئے پرچیاں پڑ گئیں "ایک ضلع تو اتنا مستعد نکلا کہ سو فیصد سے زیادہ پرچیاں بھگتا دیں" (صفحہ ۳۱۸)۔

جیون خاں نے اپنے ابا کے اسوہ پر چلتے ہوئے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی کا نام "کنیز تھا" (صفحہ ۲۷) دوسری کو آپ نے "راجکماری" (صفحہ ۱۶۸) کا لقب عطا فرمایا ہے۔ کنیز تو

بچاری رہگزائے قضا ہوئیں۔ اب راجکماری ان کی ہمدم و دمساز ہیں اور تصویر میں ایک باریش جیون خاں کے پہلو میں تشریف فرما ہیں۔

غرض یہ خودنوشت ایک مقتدر بیوروکریٹ کی داستان حیات ہونے کے باوجود خدا ترسی اور اصول پرستی کا مجموعی تاثر پیدا کرتی ہے۔ لکھنے والے کی زبان شستہ و رفتہ ہے اور ان کی شخصیت کا کوئی پہلو قارئین سے چھپا نہیں رہا۔ لکھنے والے نے جان بوجھ کر اپنے اردگرد احترام کا کوئی حالہ بھی نہیں بنایا اور فی زمانہ یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔ امید ہے پڑھنے والے اس کو دلچسپی اور قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

✓

جو بچے ہیں سنگ۔۔۔

''جو بچے ہیں سنگ۔۔۔'' راجہ تجمل حسین کی خودنوشت ہے جس کا کچھ حصہ (صفحہ ۱۶۶ سے ۱۹۹) ان کے برادر بزرگ جناب الطاف گوہر کی صفائیوں پر مبنی ہے۔ دونوں بھائی ملازمت سے معطل کئے گئے تو نوائے وقت والوں نے ان کے خلاف لایعنی الزامات کا طومار باندھ دیا۔ الطاف گوہر اپنی رودِ حیات مستعار میں اس کا جواب نہ شامل کر سکے تو ان کے بعد تجمل حسین نے اپنے برادر بزرگ کی صفائی پیش کرنا اپنا فرض جانا اس لئے ان کی خودنوشت میں دوسرے کی روداد حیات کا پیوند کھلتا نہیں اچھا لگتا ہے۔ دونوں بھائیوں میں پیار بھی بہت تھا۔ راجہ صاحب نے اس پیار کی مداومت کا ثبوت دیا ہے اور یہ بڑی مستحسن بات ہے۔

راجہ تجمل حسین انکم ٹیکس کے آدمی تھے مگر حکومت کے اعلیٰ اقتصادی عہدوں کے انتخاب میں چنے گئے اور ملازمت کے عرصہ میں انہی اقتصادی عہدوں پر کام کرتے رہے۔ ذمہ دار اقتصادی عہدوں پر فائز رہے اگر ملازمت پر فائز رہتے تو عین ممکن ہے فنانس سکرٹری یا پلاننگ کے عہدوں تک پہنچتے۔ پینسٹھ کی جنگ میں لاہور میں تھے اور سارے مغربی پاکستان کے انکم ٹیکس کمشنر تھے۔ ریڈیو کے ذریعہ قوم کا مورال بلند کرنے کی سعیء مشکور میں مصروف رہے۔ کشور ناہید نے جس بلند بانگ لہجہ میں ریڈیو کے اوقات کے بعد کارکنوں کے تجمل حسین کے ہاں جمع ہونے کا ذکر کیا ہے اور اسے ''قعرِ مذلت'' (شناسائیاں رسوائیاں صفحہ ۴۵) کا نام دیا ہے اس کا ذکر بھی موجود ہے (صفحہ ۱۴۴) مگر شامل ہونے والوں میں تجمل حسین نے کشور ناہید کا ذکر تک نہیں کیا گویا کشور ناہید اس ''قعر مذلت'' کی ''شاملات'' میں نہیں تھیں یا ہوسکتا ہے تجمل حسین نے انہیں قابل ذکر نہ سمجھا ہو۔

گوہر گزشت کے برعکس اس خودنوشت کا مزاج سادہ گوئی اور صاف گوئی کا مزاج ہے اور

پڑھتے ہوئے بھی کسی بناوٹ یا غرابت کا احساس نہیں ہوتا۔ ۱۸۵۷ کے بعد کے نام نہاد اسلامی علماء کو مسلمانوں کی معاشی بدحالی کا ذمہ دار سمجھتے ہیں (صفحہ ۲۸) اور برملا کہتے ہیں کہ قائداعظم کی رہنمائی میں تحریک پاکستان میں جدوجہد کے وقت ''مسلمانوں میں ہماری مخالفت کے لئے جو گروہ سرگرم تھے وہ انگریزوں کے غلام اور ان کے گماشتے سرحد میں سرحدی گاندھی عبدالغفار خاں اور ان کے سرگرم کارکن اور تمام مذہبی جماعتوں کے پیشہ ور مقرر پنجاب اور سندھ میں مولانا حبیب الرحمٰن صدر مجلس احرار مولانا مظہر علی اظہر جماعت اسلامی کے مولانا مودودی اور ان کا منظم گروہ پھر مولانا ابوالکلام آزاد کے وظیفہ خوار جو سب کے سب پیشہ ور مقرر تھے مسلمانوں کو ورغلا رہے تھے کہ اگر پتلون کوٹ پہننے والے مسلمانوں نے ایک الگ ملک بنالیا تو اسلام جڑ سے اکھڑ جائے گا اور ہمیں یہ جگہ جگہ ثابت کرنا پڑ رہا تھا کہ یہی ہندوؤں کے وظیفہ خوار اسلام کو دقیانوسی رسوم کا غلام بنا رہے ہیں اور ان کا دین تو دین ملا فی سبیل اللہ فساد ہے یہ مقرر تو سب بہت اچھے تھے مگر بیشتر کا کردار مالی وسائل سے وابستہ تھا اور سیاسی تبدیلی کو ایمان کا حصہ سمجھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے انہی تبدیلیوں کی وجہ سے ہزاروں کے مجمع سے زندہ باد کے نعرے لگوانے والے مولانا مظہر علی اظہر کو عوام الناس نے ''مولانا اِدھر علی اُدھر'' کہنا شروع کر دیا اور ان کے کردار کی نشان دہی ہماری تقریروں کا حصہ بنتی تھی۔'' (صفحہ ۴۹۔۵۰)۔

علماء کا یہ حال تھا مگر مسلمان طلباء جس محبت اور خلوص سے قائداعظم کے گرد جمع ہو کر تحریک پاکستان کا کام کر رہے تھے اس کا ذکر پڑھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ قائداعظم لاہور تشریف لائے ہوئے تھے اور ممدوٹ ولا میں قیام پذیر تھے۔ ''تھوڑی دیر کے بعد وہ کمرے سے باہر نکلے اور ادھر ادھر دیکھ کر حمید اللہ کو آواز دی اور ایک نوجوان بھاگتا ہوا ان کے پاس پہنچا وہ کچھ دیر کھڑے اس سے باتیں کرتے رہے ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہمیں پتہ چلا یہ حمید اللہ نامی شخص نواب آف بھوپال تھا'' (صفحہ ۴۹)

تجمل صاحب ائیرفورس کے کنٹرولر اکاؤنٹس تھے تجویز ہوئی کہ پائیلٹوں کے خون میں دن کے ایک خاص وقت میں شکر کی بہت کمی ہو جاتی ہے اس کے تدارک کے لئے ان کے لئے غیر ملکی چاکلیٹ کا اہتمام کیا جائے آپ نے تجویز مسترد کر دی اور فیصلہ کیا کہ اگر شکر کی کمی کو ہی دور کرنا

مقصود ہے تو بجائے درآمد شدہ چاکلیٹ کھلانے کے ہر پائیلٹ کو اپنا ملکی چاکلیٹ یعنی آدھ آدھ پاؤ ریوڑیاں دی جائیں اس طرح زرمبادلہ بچ جائے گا اور تکلیف کا بھی ازالہ ہو جائے گا (صفحہ ۱۰۹) اس ایک فیصلہ سے ان کی ذہنی اپج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تجمل صاحب کلب جانے کے رسیا تھے اور اپنی شامیں کلب ہی میں گذارتے تھے اسطرح انہیں بڑے بڑے میخواروں کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملتا تھا۔ ہم تو جنرل یحیٰی خان کے بارہ میں یہ پڑھ کر حیران رہ گئے کہ ایک بار کلب نے انہیں پانچ ہزار روپے کا بل بھیج دیا آگے تجمل صاحب کی زبانی ''ایک دن صبح دفتر میں فون آیا کہ کہ ایک ضروری کام ہے میں کس وقت آپ کے دفتر آؤں؟ میں نے کہا میں آجاتا ہوں آپ کیوں تکلیف فرمائیں۔ کہنے لگے آپ کے دفتر سے کام ہے لہذا میں ہی آؤں گا۔ اور آ گئے۔ اور کہنے لگے آرمی ایکٹ کے مطابق کوئی افسر میس یا کلب کا بل وقت پر نہ دے تو یہ قابل گرفت جرم ہے اور اسے کورٹ مارشل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مجھے پنڈی کلب سے پانچ ہزار روپے کا بل آیا ہے اور میرے پاس پانچ ہزار روپے نہیں ہیں لہذا یہ رقم اگر ہو سکے تو مجھے میری تنخواہ سے ایڈوانس کے طور پر دے دیں اور چار پانچ قسطوں میں کاٹ لیں'' (صفحہ ۹۷) آگے چل کر لکھتے ہیں ''آج کل کے چھوٹے چھوٹے افسروں کی مالی وسعت کی باتیں سنتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ ہمارا ملک کس بلندی سے کس اتھاہ گہرائی کی طرف پھینکا جا رہا ہے'' (صفحہ ۹۸)۔

بھٹو کی ذاتی زندگی کے بارہ میں اس کتاب میں بیشمار سخن ہائے گفتنی و ناگفتنی موجود ہیں اور ان کے اپنے تجربہ میں آئی ہوئی باتیں ہیں محض شنید نہیں۔ حسنہ بی بی کے پاس بھٹو صاحب کے ساتھ نکاح کا نکاح نامہ تھا اس لئے یہ افواہ نہیں بلکہ حقیقت تھی کہ حسنہ ان کے نکاح میں تھی۔ (صفحہ ۲۱۰) مگر دلچسپ واقعہ یوں ہے کہ یہ بھٹو صاحب کے ساتھ ایران کے سرکاری دورہ پر گئے ہوئے تھے ''ایک دن بھٹو صاحب نے مجھے کہا کہ آج نصرت کے والدین نے ہم دونوں کو کھانے پر بلایا ہے اور ہم چلے گئے۔ بہت بڑا گھر تھا خوبصورت لان سوئمنگ پول نہایت کشادہ اور قیمتی ڈرائنگ روم اور پر تکلف کھانا اور پانچ چار خوبصورت خواتین۔ واپسی پر میں نے بیگم صاحبہ سے ان کے گھر اور والدین کی دعوت کا ذکر کیا اور ڈھیر ساری تعریف کی تو ان کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اور کہنے

لگیں کہ وہ تو تہران میں نہیں ہیں اور نہ ایسا ہمارا گھر ہے نہ جانے یہ تمہیں کہاں لے گیا تھا۔ میاں بیوی میں یہ لڑائی کئی دن چلتی رہی'' (صفحہ ۱۱۶) ان کے برادر بزرگ تو بیگم بھٹو سے بھٹو صاحب کی زائد از نصاب عائلی سرگرمیوں کا اخفاء روا رکھتے تھے (گوہر گزشت صفحہ ۳۲۷)۔ مگر تجمل صاحب نے لگی لپٹی روا رکھے بغیر بات کہہ دی۔

پینسٹھ کی جنگ کے واقعات میں یہ بھی مرقوم ہے کہ ان کا سیالکوٹ کا انکم ٹیکس افسر اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگ گیا تو یہ فوراً وہاں پہنچے۔ ''جنرل صاحب کہنے لگے تم بچارے آئی ٹی او کو ڈھونڈھ رہے ہو یہاں کا ڈپٹی کمشنر بھی بھاگ گیا ہے جو پاکستان کے نامور ڈاکٹر کا بیٹا بتایا جاتا ہے۔ اور ہمیں معلوم نہیں وہ کہاں ہے تمہارا آئی ٹی او عملے سمیت سمبڑیال میں ہے اور میں ابھی پیش کرواتا ہوں۔ وہ ایک آدھ گھنٹے بعد سیالکوٹ لائے گئے دفتر کو پھر سے آباد کیا گیا اور آئی ٹی او کو جنرل صاحب نے پوری حفاظت کا یقین دلایا ڈپٹی کمشنر صاحب چونکہ سی ایس پی تھے اپنی باری پر ترقی پاتے ہوئے بڑے بڑے عہدوں سے سرفراز ہونے کا انتظار کرتے رہے''۔ (صفحہ ۱۴۵)۔

زیڈ اے سلہری کو ایوب صاحب نے اٹھا کر کرنل کا عہدہ دے دیا تھا۔ صدیق سالک نے دلچسپ بات لکھی تھی کہ کرنیلی کے دوسرے ہی دن پریس کانفرنس میں کسی نے الٹا سوال کر دیا تو سلہری صاحب چراغ پا ہو گئے کہنے لگے ''تم بلڈی سویلین لوگ ہماری مشکلات کو نہیں سمجھتے ہو''۔ تجمل صاحب نے بھی ان کی ایک بوالعجبی لکھی ہے لکھتے ہیں ''ہوائی جہاز میں اسلام آباد جاتے ہوئے مشہور صحافی جو جنگ کے دوران جی ایچ کیو میں کرنل بنا دئے گئے تھے ملے اور رازدارانہ انداز میں کہنے لگے آپ آج ہی انڈونیشیا سے آئے ہیں لیکن ہمیں معلوم ہے کہ آپ ہمارے لئے بہت کچھ لے کر آئے ہیں۔ میں نے اسی سرگوشی میں کہا اب آپ کرنل ہیں صحافی نہیں اور کرنل منہ بند رکھتے ہیں''۔ (صفحہ ۱۴۶)

ان کی دوستی جنرل اختر ملک سے تھی ان کی محاذ سے عین کامیابی کے دوران تبدیلی پر انہیں بہت دکھ تھا۔ کہتے ہیں ''میری ان کی دوستی کوئٹہ کے زمانہ سے چلی آ رہی تھی جوان کے دم آخر تک قائم رہی۔ اتنی گہری دوستی کے باوجود مجھے ان کے مذہبی عقیدہ کا پتہ تب چلا جب انہیں دفنانے کے

لئے ربوہ لے جایا جا رہا تھا۔ فقہی خیالات شریفانہ اور مہذب محفلوں میں ہمیشہ ذاتی سمجھے جاتے تھے لہذا کبھی بھی گفتگو میں شامل نہیں ہوتے تھے'' (صفحہ ۹۷)۔ اسی طرح ایم ایم احمد کے بارہ میں بھی ان کی رائے یہ تھی کہ وہ ''کھرے آدمی تھے'' (صفحہ ۱۲۰)۔

ضیا الطاف گوہر کی ملاقات کا ذکر بھی ہے ''ضیا صاحب نے کہا آپ شاید ہمارے ساتھ کام کرنے سے ڈرتے ہیں۔ انہوں نے کہا نہیں سر آپ سے نہیں ڈرتا ان سے ڈرتا ہوں جو آپ کے بعد آئیں گے۔ اس پر ضیا نے فقرہ بولا وہ تاریخی تھا اگر تمہاری مراد بھٹو سے ہے تو وہ تو اس وقت زندہ نہیں ہوگا۔ ضیا کا نام لکھتے ہوئے قلم رک جاتا ہے ظلمت کو ضیا کیا لکھنا'' (صفحہ ۲۰۸) اور یہ بھٹو کے دار پر کھینچے جانے سے کہیں پہلے کی بات ہے۔

پاکستان کے نامور ججوں کے بارہ میں یہ بات لکھی ہے جو سنہرے حروف میں لکھے جانے کی مستحق ہے کہ ''بہ حیثیت وکیل میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ بعض ججوں کو مائی لارڈ کہتے ہوئے شرمندگی ہوتی ہے مگر فخر الدین جی ابراہیم جیسے ججوں کو بار بار مائی لارڈ کہنے کو جی چاہتا ہے''۔ (صفحہ ۱۸۶)۔ اس کے ساتھ ہی وہ بات یاد آتی ہے۔ جسٹس اجمل میاں کی خودنوشت سوانح عمری کی رونمائی کی تقریب کراچی میں ہوئی تو سابق جج جسٹس فخر الدین جی ابراہیم نے کہا ''میں بڑے کرب سے کہتا ہوں کہ شومئی قسمت سے جسٹس ارشاد حسن خاں اور جسٹس ریاض جیسے لوگ بھی ہمارے چیف جسٹس رہے۔ ہم نے تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا'' (بزنس ریکارڈر مورخہ ۳۱ جولائی ۲۰۰۴)۔

غرض راجہ تجمل حسین کی خودنوشت پڑھنے کی چیز ہے اور گوہر گزشت کی طرح محض للو تھپو کرنے کی کوشش نہیں۔ یہ خودنوشت صاف بیانی اور صاف گوئی کے اوصاف کی وجہ سے ممتاز رہے گی۔ ایسی صاف گوئی ہمارے ہاں صرف رندانِ صاف باطن کے لئے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے اور غنیمت ہے کہ اس زمانہ میں بھی کوئی ایسی باتیں کرنے میں حجاب محسوس نہیں کرتا۔

پینسٹھ کی جنگ کے زمانہ میں تجمل حسین ریڈیو سے شہرنامہ پڑھا کرتے تھے اسی اسلوب میں لکھی ہوئی یہ کتاب ان کی زندگی کا زندگی نامہ ہے۔

راجہ تجمل حسین کی واقعاتی غلطیاں

راجہ تجمل حسین کی خودنوشت ''جو بچے ہیں سنگ ۔۔۔'' سنگ میل پبلشرز کی جانب سے ۲۰۰۷ میں چھپی ہے۔ میں اس خودنوشت کا جائزہ لے چکا ہوں مگر اس خودنوشت میں بعض ایسی غلطیاں راہ پا گئی ہیں جن کی تصحیح کرنا ضروری ہے۔ ان جیسے زیرک آدمی سے ایسا تسامح ہونا نہیں چاہئے تھا۔ راجہ تجمل حسین حکومت کے بڑے ذمہ دار افسر تھے۔ کچھ عرصہ تک سفیر کبیر بھی رہے۔ ۱۹۶۵ کی جنگ میں ریڈیو پاکستان سے شہریوں کا مورال بلند کرنے کے سلسلہ میں قابل قدر کام کیا۔ اسی طرح تھنکرز فورم کے ذریعہ بین الاقوامی حلقوں میں ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنے میں کوشاں رہے۔

راجہ صاحب کی یہ خودنوشت اپنی صاف گوئی اور بے لاگ تبصروں کی وجہ سے خاصے کی چیز ہے۔ قیام پاکستان سے عین قبل یہ تحریک پاکستان میں بڑی سرگرمی سے حصہ لے رہے تھے اور قائد اعظم کے جان نثاروں میں سے تھے۔ تحریک پاکستان اور ۱۹۴۵ کے انتخاب کی تیاریوں میں سرگرم رہے مگر جب ''پاکستان بن گیا'' والا باب لکھنے بیٹھے تو ان کی یادداشت نے پوری طرح ان کا ساتھ نہیں دیا۔ معلوم ہوتا ہے تجمل صاحب نے اپنی یادداشت پر زیادہ ہی حصر کیا ہے اور قیام پاکستان کی تاریخ پر شائع ہونے والی کتب سے استفادہ نہیں کیا۔ اس موضوع پر سر محمد ظفر اللہ خاں کی تحدیث نعمت اور چوہدری محمد علی صاحب کی Emergence of.Pakistan ایسی کتابیں ہیں جنہیں نہ دیکھنا زیادتی تھی۔ پھر واقعاتی غلطیاں زیادہ تر پنجاب باؤنڈری کمیشن کے سلسلہ میں در آئی ہیں۔ باؤنڈری کمیشن کی مکمل روداد سرکاری طور پر شائع ہو چکی تھی۔ تجمل صاحب کو

اس سے استفادہ کرنا چاہئے تھا۔ بہر حال میں خطائے بزرگاں گرفتن خطاست کے باوصف ان واقعاتی غلطیوں کی نشان دہی کرنا چاہتا ہوں۔

لکھتے ہیں ''پنجاب کی تقسیم کے لئے ایک باؤنڈری کمیشن تشکیل دیا گیا اور انگلستان سے ایک ریڈکلف نامی نامعلوم وکیل کو صدر بنایا گیا جس کی نامزدگی (اور) ماؤنٹ بیٹن کی سازش کا راز اب مختلف تحقیقی کتابوں میں افشا ہو چکا ہے۔ اس کمیشن میں کانگریس کے دو ممبر اور مسلم لیگ کے دو رکن جسٹس محمد منیر اور جسٹس دین محمد مقرر ہوئے سکھوں کے نمائندہ رکن جسٹس بوٹا سنگھ تھے'' (جو بچے ہیں سنگ ۔۔۔'' صفحہ ۵۸)۔ کانگریس کی طرف سے نمائندگی کے لئے جسٹس مہر چند مہاجن مقرر کئے گئے تھے جن کا ذکر راجہ صاحب نے نہیں کیا۔ اسی طرح سکھوں کی نمائندگی کے لئے جسٹس تیجا سنگھ مقرر کئے گئے تھے جسٹس بوٹا سنگھ نام کے کوئی جج پنجاب ہائی کورٹ میں نہیں تھے۔ یاد رہے کہ یہ اصحاب پنجاب باؤنڈری کمیشن کے اراکین تھے بنگال باؤنڈری کمیشن ایک علیحدہ کمیشن تھا اگرچہ ریڈکلف دونوں کمیشنوں کے صدر تھے۔ پنجاب باؤنڈری کمیشن کے لئے پنجاب ہائی کورٹ کے ججوں کو نامزد کیا گیا تھا۔

راجہ صاحب نے لکھا ہے'' کانگریس نے اپنے حقوق کی پیروی کے لئے ہندوستان کے شہرہ آفاق وکیل بھولا بھائی ڈیسائی کو چنا اور قائداعظم نے یہ فرض سر محمد ظفر اللہ کو سونپا جو اس وقت اپنے علم اور ایمان داری کی وجہ سے مسلمانوں میں بڑی شہرت کے مالک تھے اور پاکستان کی تحریک میں بھی انہوں نے گراں قدر حصہ لیا تھا'' (صفحہ ۵۹)۔ کانگریس کے نمائندہ کے سلسلہ میں انہیں غلط فہمی ہوئی۔ کانگریس کے نمائندے شہرہ آفاق وکیل موتی لعل سیتلواڈ مقرر کئے گئے تھے جو بعد کو ہندوستان کے اٹارنی جنرل بنے (تحدیث نعمت صفحہ ۵۲۱)۔ سکھوں کی طرف نمائندگی سردار ہرنام سنگھ صاحب نے کی جو لاہور کے نامور سکھ وکیل تھے۔

راجہ صاحب کا بیان جاری ہے'' میں اس وقت لا کالج میں ایل ایل بی کا آخری سال ختم کر چکا تھا لہذا اپنی تعلیم اور سیاسی لگن کی وجہ سے ہر روز بلاناغہ کمیشن کے اجلاس (کی کارروائی) سننے کے لئے لاہور ہائی کورٹ میں حاضری دیتا تھا۔ ساری کارروائی میں یہ ظاہر تھا کہ

ہندو جج بھولا بھائی ڈیسائی کے طرف دار تھے اور مسلمان جج سر ظفر اللہ کے دلائل پر سر دھنتے تھے ۔ہم سب پر عیاں ہو رہا تھا کہ ریڈ کلف بھی ڈیسائی کی طرف جھکا ہوا ہے مسلمان ججوں نے کئی دفعہ اس یک طرفہ جھکاؤ پر تشویش کا اظہار بھی کیا'' (صفحہ ۵۹) ۔اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریڈ کلف بھی کمیشن کے اجلاس میں موجود ہوتا تھا حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ریڈ کلف کمیشن کے کسی بھی اجلاس میں خود شامل نہیں ہوتا تھا۔ سر ظفر اللہ لکھتے ہیں ''دوسرے دن منگل کی صبح گیارہ بجے ہم سر سیرل ریڈ کلف کی خدمت میں حاضر ہوئے کمیشن کے اراکین جسٹس دین محمدؒ جسٹس محمد منیر جسٹس مہر چند مہاجن اور جسٹس تیجا سنگھ صاحب بھی موجود تھے۔ سر سیرل نے کمیشن کا پروگرام بتلاتے ہوئے حکم دیا کہ آنے والے جمعہ کی دوپہر تک فریقین اپنے تحریری بیانات داخل کر دیں آئندہ سوموار سے کمیشن وکلاء کی بحث کی سماعت شروع کرے گا وہ خود بحث کی سماعت میں شریک نہیں ہونگے ۔ کیونکہ اگر کمیشن کے چار اراکین بالاتفاق یا کثرت رائے سے حد بندی تجویز کر دیں تو ان کی طرف سے کسی دخل اندازی کی ضرورت نہیں ہوگی ان کا کام صرف اس صورت میں فیصلہ دینا ہے جب کمیشن کے چار ارکان متفقہ یا کثرت آرا سے کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکیں۔ کمیشن کے روبرو جو کچھ بیان کیا جائے گا اس کی تفصیلی رپورٹ ہر روز انہیں بھیج دی جایا کرے گی۔ یہ طریق کار بھی میرے لئے پریشانی کا باعث ہوا'' (تحدیثِ نعمت صفحہ ۵۱۳)

راجہ صاحب مزید فرماتے ہیں۔ ''ایک شام دونوں جج صاحبان نے نواب ممدوٹ اور ممتاز دولتانہ کو بتایا کہ ریڈ کلف کسی سازش میں مبتلا ہے اور مصدقہ نقشوں کو چھوڑ کر کہیں سے دوسرے نقشے بنا رہا ہے اور ہمارے بغیر جہاز پر دو دفعہ پنجاب کے ان حصوں کا چکر بھی لگا چکا ہے جو زیر بحث ہی نہیں ہیں اگر انہیں ہندو پنجاب میں شامل کر دیا گیا تو پاکستان کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی۔ اس اطلاع پر چوہدری نذیر احمد ایڈووکیٹ اور مولانا داؤد غزنوی کو دہلی قائداعظم کے پاس بھیجا گیا تا کہ وائسرائے کو بتایا جائے کہ کوئی سازش ہو رہی ہے قائد نے بھی اس شکایت پر کوئی کان نہ دھرے اور چوہدری نذیر احمد (مولوی غلام محی الدین قصوری کے داماد اور ابا جی کے چچا زاد بھائی تھے) نے مجھے بتایا کہ قائداعظم نے ساری بات سن کر فرمایا کہ ریڈ کلف لنکنز ان کا بیرسٹر ہے وہ تو غلط کام کر ہی نہیں سکتا اور قائداعظم کی شرافت اور لوگوں پر ایمانداری کے بھروسے نے اس سازش

کو طشت از بام نہ ہونے دیا'' (صفحہ ۵۹)۔ اگر راجہ صاحب نے اس موضوع پر لکھی گئی کتب کا مطالعہ کر لیا ہوتا تو ایسی بات نہ کہتے۔ سر ظفر اللہ کا بیان ہے ''بدھ کی شام جسٹس دین محمد صاحب تشریف لائے وہ بہت پریشان معلوم ہوتے تھے فرمایا تم اپنی طرف سے تحریری بیان تیار کرو اور جیسے بن پڑے بحث بھی کرنا لیکن میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ یہ سب کارروائی محض کھیل ہے حد بندی کا فیصلہ ہو چکا ہے اور اسی کے مطابق حد بندی ہوگی'' (تحدیثِ نعمت صفحہ ۵۱۹)

پہلی بات تو یہ ہے کہ دونوں جج نہیں صرف جسٹس دین محمد سر سید مراتب علی کے گھر تشریف لائے تھے کیونکہ سر ظفر اللہ نواب ممدوٹ کے ممدوٹ ولا میں نہیں سر مراتب کے گھر میں قیام پذیر تھے اور وہی مسلم لیگ کے کیس کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ اور یہ بدھ کی بات ہے جب ابھی فریقین کے بیانات بھی تیار نہیں ہوئے تھے۔ آگے پھر سر ظفر اللہ ''میں نے پوچھا آپ کو کیسے معلوم ہوا انہوں نے فرمایا کل جب تم لوگ چلے گئے تو سر سیرل ریڈ کلف نے ہمیں بتایا کہ وہ کل صبح ہوائی جہاز میں اردگرد کا علاقہ دیکھنے جائیں گے۔ اس پر میں نے کہا اگر آپ حد بندی کے سلسلہ میں متنازعہ علاقہ اکیلے دیکھنے جا رہے ہیں تو آپ ضرور اس معائنہ سے کچھ تاثر لیں گے بطور امپائر آپ کا فرض ہے کہ اپنا فیصلہ اس مواد کی بنا پر کریں جو کمیشن کے روبرو پیش کیا جائے اور جو کمیشن آپ کی خدمت میں ارسال کرے اس معائنے سے جو تاثر آپ لیں گے اس کا علم کمیشن کو کس طرح ہوگا؟ سر سیرل نے کہا اس پرواز کے لئے جو جہاز مجھے مہیا کیا گیا ہے وہ فوجی قسم کا ہے اور اس میں زیادہ سواریوں کے لئے گنجائش نہیں لیکن اگر آپ پسند کریں تو دو اراکین میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔ چنانچہ طے پایا کہ ایک مسلم اور ایک غیر مسلم رکن ریڈ کلف کے ساتھ جائیں۔ روانگی آج صبح سات بجے والٹن کے ہوائی اڈے سے تھی جب یہ سب وہاں جمع ہوئے تو فضا گرد آلود تھی۔ پائیلٹ نے کہا میں آپ کو لے چلتا ہوں لیکن گرد کی وجہ سے آپ کو کچھ نظر نہیں آئے گا اور آپ کا وقت ضائع ہوگا۔ اس پر ریڈ کلف نے پرواز منسوخ کر دی۔ پائیلٹ کو اس پرواز کے لئے جو تحریری ہدایات تھیں وہ میں نے دیکھی ہیں تحریری ہدایات کے کاغذ پر پرواز کے لئے ایک لائن لگی ہوئی ہے مجھے یقین ہے کہ جس لائن پر پرواز کرنے کی ہدایت کی گئی ہے وہی حد بندی لائن پہلے سے طے پا گئی ہے۔۔۔۔ ان علاقوں میں ایک خاص لائن پر پرواز کرنے کا انتظام کرنے سے یہی قیاس ہوتا ہے

کہ حد بندی کے سلسلہ میں انہیں بریف کیا جا چکا ہے اور حد بندی کی لائن بھی ان کو تجویز کر کے دی جا چکی ہے۔ جس کے مطابق بہت سا ایسا علاقہ جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے بالخصوص ضلع گورداس پور کی تحصیلات بٹالہ و گورداسپور پاکستان میں شامل نہیں ہونگی۔ ایسی صورت میں جب کہ حد بندی بالا بالا طے پا چکی ہے میرا اور منیر کا کمیشن کے ڈھونگ میں شامل رہنا مناسب نہیں۔ میں آج رات دلی جا رہا ہوں کل صبح قائد اعظمؒ سے مل کر یہ معاملہ ان کے گوش گزار کروں گا اور ان سے اپنے اور منیر کے کمیشن سے مستعفی ہونے کی اجازت طلب کروں گا۔ میں نے کہا اس واقعہ سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ حد بندی کا تعین پہلے سے ہو چکا ہے اور کمیشن کی کارروائی محض ڈھونگ ہے۔ آپ ضرور دلی جائیں لیکن قائد اعظم کی خدمت میں یہ معاملہ پیش کرتے ہوئے یہ بات ضرور ذہن میں رکھیں کہ وہ قانونی طبیعت کے مالک ہیں اس لئے آپ اپنے استعفیٰ کی بنیاد کسی قانونی عذر پر رکھیں ورنہ وہ رضامند نہیں ہونگے۔ جسٹس دین محمد نے پوچھا تمہارے ذہن میں کوئی قانونی عذر آتا ہے میں نے کہا آپ کہیں کہ ہم نے سر سیرل ریڈ کلف کو امپائر تسلیم کیا ہے اور ہم پر ان کے فیصلے کی پابندی لازم ہے لیکن امپائر کا فرض ہے کہ وہ اپنے فیصلہ پر پہنچنے سے پہلے کسی دوسرے شخص کی رائے یا مشورہ سے متاثر نہ ہو۔ پائیلٹ کی ہدایات پرواز سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی جانب سے امپائر کو مشورہ دیا گیا ہے کہ صوبہ پنجاب کی تقسیم کے لئے حد بندی کی لائن وہ ہونی چاہئے جو ہدایات پرواز میں دکھائی گئی ہے۔ اب ہمارا حق ہے کہ امپائر کی مجوزہ پرواز کی غرض دریافت کریں اور یہ بھی دریافت کریں کہ اس لائن پر پرواز کرنے کا کس نے مشورہ دیا اور اس کی اہمیت کیا ہے اگر ظاہر ہو کہ کسی دوسرے شخص نے مشورہ دیا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں امپائر کی غیر جانبداری پر اطمینان نہیں رہا لہذا کمیشن کے پاکستانی نمائندے استعفیٰ دے رہے ہیں۔ جسٹس دین محمد نے فرمایا میں اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کروں گا اور پرسوں صبح دلی سے واپسی پر تمہیں اپنی ملاقات کے نتیجہ سے مطلع کروں گا"۔ (تحدیثِ نعمت صفحہ ۵۲۰)۔

یہ سلسلہ ابھی جاری ہے "ہدایات پرواز والا نقشہ دیکھ کر جسٹس شیخ دین محمد صاحب نے جس اندیشہ کا اظہار کیا تھا وہ انہوں نے قائد اعظم سے بیان کر کے حد بندی کمیشن سے مستعفی ہونے کی اجازت چاہی تھی قائد اعظم نے کمیشن سے مستعفی ہونے کی اجازت تو نہ دی لیکن ۱۸ اگست

۱۹۴۷ کو جسٹس دین محمد صاحب کی رپورٹ کی بنا پر انہوں نے چوہدری محمد علی صاحب کی زبانی لارڈ اسمے کو ایک پیغام بھیجا کہ پنجاب کی تقسیم اور بالخصوص ضلع گورداسپور کی تقسیم کے متعلق انہیں تشویشناک رپورٹیں مل رہی ہیں اور اگر حد بندی وہی رہی جس کے متعلق اطلاعات مل رہی ہیں تو اس سے پاکستان اور انگلستان کے تعلقات متاثر ہوں گے۔"۔۔۔آگے سر ظفر اللہ نے چوہدری محمد علی صاحب کی قابل قدر تصنیف The emergence of Pakistan کا حوالہ دیا ہے "چوہدری محمد علی لکھتے ہیں کہ وہ یہ پیغام لے کر لارڈ اسمے سے ملنے وائسرائے ہاؤس گئے۔ اسمے اس وقت ریڈ کلف سے مذاکرات میں مصروف تھے چوہدری صاحب نے انتظار کیا کوئی گھنٹہ بھر بعد اسمے فارغ ہوئے تو ان سے ملاقات ہوئی۔ چوہدری صاحب نے قائد اعظم کا پیغام پہنچایا اسمے نے کہا کہ انہوں نے یا ماؤنٹ بیٹن نے حد بندی کے معاملہ میں ریڈ کلف سے کبھی کوئی بات نہیں کی اور انہیں اس امر کے متعلق ریڈ کلف کے خیالات کا کوئی علم نہیں۔ انہوں نے وضاحت سے کہا کہ حد بندی کے متعلق ریڈ کلف کو ان کی جانب سے یا ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے کوئی مشورہ نہ دیا گیا ہے نہ دیا جائے گا۔ جب چوہدری صاحب نے اس رپورٹ کی تفصیل بیان کی جو قائد اعظم کو ملی تھی تو اسمے نے کہا انہیں چوہدری صاحب کی بیان کردہ تفصیل کی سمجھ نہیں آ رہی۔ اسمے کے کمرے میں ایک نقشہ لٹک رہا تھا چوہدری صاحب نے اسمے کو اشارہ سے نقشہ کے قریب بلایا تاکہ نقشہ سے اپنی بات کی وضاحت کر سکیں۔ چوہدری صاحب نے دیکھا کہ اس نقشہ پر صوبہ پنجاب میں پنسل سے ایک لکیر لگی ہوئی ہے جو بالکل اس رپورٹ کے مطابق تھی جو قائد اعظم کو ملی تھی۔ چوہدری صاحب نے اسمے سے کہا قائد اعظم کو جو رپورٹ ملی اس کی وضاحت کے لئے کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ کے نقشہ پر لگی ہوئی لائن خود منہ سے بول رہی ہے۔

چوہدری صاحب لکھتے ہیں Ismay turned pale and asked in confusion who had been fooling with his map. (یعنی اسمے کا رنگ فق ہو گیا اور وہ کھسیانا ہو کر کہنے لگا میرے نقشے میں کس نے یہ گڑ بڑ کی ہے) (تحدیثِ نعمت صفحہ ۵۲۳۔۵۲۴)

✓

تین صدور کا ایڈی کانگ

ایمبیسڈر ارشد سمیع خاں نے جو فیلڈ مارشل ایوب، جنرل یحییٰ خاں اور صدر، غیر فوجی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ذوالفقار علی بھٹو کے اے ڈی سی رہے ان تینوں صدور کے زمانہ کی یادداشتیں انگریزی میں لکھی ہیں جنہیں پینگا گان پریس دہلی نے ۲۰۰۸ میں ہندوستان سے شائع کیا ہے۔ فلائٹ لیفٹیننٹ ارشد سمیع خاں کو ۱۹۶۵ کی جنگ میں نمایاں کارکردگی کی بنا پر ستارہ جرات دیا گیا تھا۔ جب یومِ پاکستان کے فلائی پاسٹ میں شرکت کے بعد اپنا ستارہ جرات کا اعزاز لینے کو صدر فیلڈ مارشل ایوب خاں کے سامنے پیش ہوئے تو فیلڈ مارشل ان کے "حسنِ جہاں سوز" سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہیں اپنا اے ڈی سی مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ یہ نئے نویلے اے ڈی سی چھ برس تک ایوانِ صدر میں ایوب یحییٰ اور بھٹو کی خدمت میں مصروف رہے۔ وہاں سے فارن آفس میں ڈپٹی چیف پروٹوکول افسر اور چیف پروٹوکول افسر بنائے گئے اور پھر سویڈن میں سفیر کے عہدے سے مرکزی حکومت میں سکرٹری ثقافت کے طور پر تبدیل ہوئے اور چوالیس سال کی خدمت کے بعد ریٹائر ہوئے اور افواہ ہے کہ ایمبیسڈر صاحب یہاں ہمارے پڑوس ہی میں کہیں کینیڈا میں مقیم اور گمنامی کی زندگی گذار رہے ہیں۔

سویڈن میں سفارت کے دوران ان سے روشناسی اور یاد اللہ رہی مگر اس کتاب کی ایک تصویر دیکھ کر ہمیں اس زمانہ کی تلخی یاد آ گئی جس نے ہمارے تعلقات میں دراڑ پیدا کر دی تھی۔ آپ نے سویڈن کی بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں سے بے شمار فنڈ کا عطیہ اس بہانے حاصل کیا کہ آپ پاکستان اور سویڈن کے ثقافتی تعلقات کے فروغ کے لئے پاکستان کے نامور فنکاروں کا ایک طائفہ سویڈن بلائیں گے۔ سویڈن کی مشہور ثقافتی شخصیت، بادشاہ کی بہن شہزادی کرسٹینا اور ان کے

شوہر کو مہمان خصوصی کے طور پر بلایا۔ تصویر میں آپ شہزادی کرسٹینا سے محو گفتگو ہیں۔ چنانچہ جب تمام تر پروپیگنڈے اور اشتہار بازی کے بعد پاکستان کا مشہور ثقافتی طائفہ سٹیج پر بلایا گیا تو وہ صرف امیسیڈر صاحب کے فرزندِ ارجمند عدنان سمیع خاں اور ان کے ساتھیوں پر مشتمل تھا۔ جو پاکستانی اس تقریب میں موجود تھے وہ پانی پانی ہو گئے۔ ۱۹۹۵ میں جب آپ سکرٹری ثقافت کے مرتبہ پر پہنچے تو آپ نے اپنے بیٹے کو پرائڈ آف پرفارمنس دلوانے کی سعیء نامشکور شروع کر دی۔ یہ تو ہمیں معلوم نہیں کہ عدنان سمیع خان کو یہ ایوارڈ ملا کہ نہیں البتہ اس کے والدین اپنے پوتے یا پوتی کو اغوا کرنے کی وجہ سے اتنے بدنام ہو گئے ہیں کہ اب لوگوں کے سامنے آنا انہیں کھلتا ہے۔ اور ان کا فنکار بیٹا اب ہندوستان کا شہری ہے۔

آپ نے سویڈن میں سفارت کے دوران اپنا کارڈ چھپوایا تو اس پر ایس جے یعنی ستارہ جرات بڑے دلولے سے لکھا۔ مگر جس سویڈ کو وہ کارڈ دیتے وہ معنی خیز نظروں سے انہیں دیکھنے اور مسکرانے لگتا۔ ہم نے سفیر صاحب سے گذارش کی کہ سویڈن میں ایس جے sveriges jarnvag سویڈش ریلوے کا مخفف ہے اس لئے لوگ حیران ہوتے ہیں کہ پاکستان کے سفیر کا ہماری ریلوے سے کیا تعلق ہے۔ جب آپ لوگوں سے کہتے کہ میں پائیلٹ تھا تو وہ اور حیران ہوتے ہیں کیونکہ سویڈن کی تیز رفتار گاڑی کے ڈرائیور کو پائیلٹ کہا جاتا ہے۔

یہ کتاب پڑھ کر ہمیں امیسیڈر صاحب کی اولاد پروری کی لم سمجھ میں آ گئی ہے۔ صدر ایوب خاں کے زوال میں ان کے فرزندان ارجمند کی جائز و ناجائز خواہشات کا بہت دخل تھا اور صدر ایوب اپنے بیٹوں کی ہر خواہش قبول کرنے پر مستعد تھے۔ نواب کالاباغ اس بات کے سخت خلاف تھے۔ نواب کالاباغ نے تو اپنی اولاد پر گورنمنٹ ہاؤس کے دروازے بند کر رکھے تھے وہ صدر کے بیٹوں کی کیا مدد کرتے چنانچہ انہوں نے ایوب کے صاحبزادوں کی سال انڈسٹری لگانے کی درخواست مسترد کر دی اور ایوب کے بیٹوں نے باپ کے کان بھرنے شروع کر دئے کہ نواب کالاباغ خود صدر بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اور اس پر صدر ایوب نے نواب کالاباغ کو فارغ کر دیا۔ (تین صدور ایک اے ڈی سی صفحہ ۲۸) اے کاش امیسیڈر صاحب اس بات سے سبق سیکھتے اور خود اپنے ہاتھوں اپنی بدنامی کے سامان پیدا نہ کرتے۔

صدر ایوب کے عہد کے بارہ میں بعض نئی باتیں سامنے آئیں۔ صدر ایوب مستعفی ہوئے تو ایک جرنیل ان سے افسوس کرنے آیا اور ملاقات کے معاً بعد اس نے یحیٰی سے ملاقات کا وقت مانگا (صفحہ ٦)۔ ایوان صدر خالی کرنے سے قبل ایوب نے یحیٰی سے بات کرنا چاہی تو یحیٰی نے فون سننے سے انکار کر دیا (صفحہ ٧) کراچی سے ایک سیٹھ افسوس کرنے آیا اور صدر ایوب کو اپنی کمپنی میں نوکری پیش کی۔ صدر نے ازرہ تفنن تنخواہ کا پوچھا تو سیٹھ صاحب نے فرمایا کہ وہ سب کچھ شامل کر کے ساٹھ ہزار روپے سے زیادہ نہیں دے سکتے (صفحہ ١١)۔ نواب بہاولپور نے صدر ایوب کی بیگم کو آٹھ قیمتی ہاروں کا تحفہ بھیجا۔ بیگم نے واپس کر دیا کہ میں ایسا تحفہ نہیں لے سکتی جس کو میں لوٹا نہ سکوں۔ (صفحہ ٥٩) پیر صاحب مانکی شریف اور پیر صاحب دیول شریف ملنے کو آئے۔ ویٹنگ روم میں دونوں پیر ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو گئے اور ایک دوسرے کی داڑھیاں پکڑ کر دشنام طرازی کرنے لگے۔ انہیں علیحدہ کرنے کے لئے پولیس کو بلانا پڑا (صفحہ ٧٦)۔ شکار کرنے کو سکھر گئے تو صدر ٹیٹو کپڑوں سمیت جھیل میں گر گئے جنہیں بمشکل تمام پانی سے نکالا گیا (صفحہ ٨٤) ابو ظہبی کے حکمران سلطان نہیان کو صدر نے چاندی کا ایک سگار باکس تحفہ میں دیا۔ سلطان نے اسی قسم کا بکس صدر کو دیا فرق صرف یہ تھا کہ سلطان کے باکس میں ایک رولز رائس گاڑی کی سونے کی چابی تھی جس کو اپنی پسند کے مطابق بنوا کر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ یہ رولز رائس صدر ایوب کے بعد کے صدور کے کام میں آئی (صفحہ ٩٨) سندھ کے ایک وڈیرے "میاں صاحب" صدر کے ساتھ تصویر کھچوانے کھڑے ہوئے تو ان کی پتلون گر گئی اور انہوں نے زیر جامہ نہیں پہن رکھا تھا۔ (صفحہ ٨٦)۔ اس شکار کے موقعہ کی ایک روداد ایک پولیس افسر نے بھی لکھی ہے۔ "مارشل ٹیٹو شکار کے لئے تشریف لائے۔ ان سے ذرا قبل ذوالفقار علی بھٹو وزیر خارجہ پہنچے۔ صدر کا جلوس آ کر رکا۔ صدر ایوب نے مسٹر بھٹو کا تعارف یوں کروایا "یہ ہیں ذوالفقار علی بھٹو میں انہیں بیٹا کہوں یا فارن منسٹر۔" صدر ٹیٹو نے کہا اس صورت میں میں آپ کے بیٹے سے ملنا پسند کروں گا" (عمر گزشتہ۔ خودنوشت سمیع محمد خاں صفحہ ٢٦٠)۔ اے ڈی سی صاحب نے خدا معلوم اس تعارف کا ذکر کیوں نہیں کیا۔

ایک بار سلطان نہیان اور ان کے قافلہ کو نتھیا گلی کے گورنمنٹ ہاؤس میں ٹھہرایا گیا۔ یو بی ایل نے ان کی تفریح طبع کے لئے پاکستان کے مشہور طائفے مدعو کئے۔ رات کو شدید ژالہ باری

ہوئی اور طوفان آیا۔ ٹین کی چھتوں پر اولوں کی بارش نے عربوں کو سراسیمہ کر دیا۔ صحراؤں کے رہنے والے اتنے خائف ہوئے کہ رات کو گڑ گڑا گڑ گڑا کر نماز توبہ ادا کی اور فوری طور پر پنڈی واپس آنے کی خواہش کی کہ ہم اس عذاب الہٰی سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں (صفحہ ١٠٠) کیا ڈپٹی چیف آف پروٹوکول کو یہ خیال نہیں آیا کہ صحرائی بدوؤں کو پہاڑی مقامات پر ٹھہرانا بجائے خود پرٹوکول کے آداب کے منافی تھا۔

صدر یحیٰی خاں کے بارہ میں ان کے دل میں نرم گوشہ ہے اس لئے آپ نے ان کے بارہ میں عام طور پر پھیلائی جانے والی افواہوں کی تردید کی اپنی سی کوشش کی ہے اور حمود الرحمٰن کمشن کے سامنے جب گواہی کے لئے پیش ہوئے ہیں تو بھی کچھ کہہ کے نہیں دیا۔ لکھتے ہیں مجھے حلف دیا گیا اس کے بعد جسٹس حمود الرحمٰن نے کہا "سکواڈرن لیڈر! اے ڈی سی کی حیثیت سے آپ نے ان عورتوں کو ان تاریخوں میں ایوان صدر میں داخل ہونے کی اجازت دی جن کے نام میں نے پڑھے ہیں۔ جب آپ ان کو صدر تک لے کر گئے تو اس کے بعد ان کے اور صدر کے مابین کیا کچھ ہوا؟ یہ یاد رہے کہ آپ نے حلف اٹھایا ہوا ہے"۔ یہ سوال بڑا مشکل تھا مگر میں نے ٹھنڈے دل سے سچا سچا جواب دیا کہ اس سوال کے دو حصے ہیں ایک کا تعلق سیکیورٹی اور ایک کا پروٹوکول سے ہے۔ جہاں تک سیکیورٹی کا تعلق ہے کہ جو لوگ ایوان صدر میں بغیر پیشگی اجازت کے داخل ہونا چاہتے ہیں ڈیوٹی پر موجود اے ڈی سی ان کو اجازت دیتا ہے۔ پروٹوکول کا مطلب یہ ہے جو لوگ صدر سے ملنے کو آتے ہیں اے ڈی سی ان کو صدر کی خدمت میں حاضر کر کے باہر آ جاتا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جب آپ ملاقات کے لئے تشریف لائے تھے تو میں آپ کو صدر کے کمرہ میں پیش کر کے باہر آ گیا تھا اس لئے مجھے علم نہیں کہ آپ کے اور صدر کے مابین کیا گفتگو ہوئی تھی۔ اس لئے مجھے کچھ علم نہیں کہ ان عورتوں اور صدر کے مابین کیا ہوا۔ صدر یحیٰی کی فیملی صدر کے ساتھ رہتی تھی اس لئے کوئی ناروا بات ہوتی تو ان کو پتہ ہوتا۔ مجھے کسی غیر مناسب بات کا علم نہیں"۔ جسٹس حمود الرحمٰن نے دوسرا سوال کیا "سکواڈرن لیڈر کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ صدر یحیٰی دن میں کتنی شراب پیتے تھے؟ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ہر وقت نشہ میں دھت رہتے تھے۔ میں نے کہا سر یہ سوال آپ نے غلط آدمی سے پوچھا ہے۔ اس سوال کا مخاطب تو ان کا بیرا ہو سکتا ہے جو انہیں شراب پیش

کرتا تھا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے انہیں کبھی نشے میں دھت نہیں دیکھا۔ سوال ہوا کیا آپ نے تین سال کے عرصہ میں ایک بار بھی انہیں دھت نہیں دیکھا؟ میں نے جواب دیا ہرگز نہیں۔ سوال تھا کیا آپ نے اکہتر کی جنگ کے دوران بھی انہیں نشہ میں نہیں دیکھا؟ میں نے جواب دیا بالکل نہیں۔'' (صفحہ ۲۱۳۔۲۱۴)۔ اس سوال و جواب سے اے ڈی سی اور اس کے باس کے درمیان ذہنی مفاہمت کا جواب مل جاتا ہے۔ اس سلسلہ کی اہم بات یہ ہے کہ امبیسیڈر ارشد سمیع خان محترمہ اقلیم اختر رانی کے داماد ہیں۔

اب تیسرے صدر بھٹو صاحب کا زمانہ آیا۔ اے ڈی سی نے ائیر مارشل رحیم خاں اور جنرل گل حسن کی ایک سازش کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ کس طرح ان دونوں نے چین کے سفر کے دوران صدر یحیٰی سے اقتدار بھٹو کو منتقل کروانے کی کوشش کی اور سقوط ڈھاکہ کے بعد اہم کردار ادا کیا مگر بھٹو نے دونوں کو فارغ کر دیا۔ جب ارشد سمیع خاں صاحب لزبن میں ناظم الامور تھے اور کسی کام سے سپین آئے ہوئے تھے جہاں ائیر مارشل صاحب سفیر تھے تو انہوں نے ان کے سامنے اپنے قصور کا اعتراف کیا اور ان سے کہا کہ وہ صدر یحیٰی سے کہیں کہ وہ انہیں معاف کر دیں۔ (صفحہ ۲۰۸)۔

بھٹو صاحب کے سول مارشل لا کا ذکر ہے۔ ضیاء الحق کے خدائی گرفت میں آ کر ہلاک ہونے کا ذکر ہے (صفحہ ۲۱۱)۔ بی بی بے نظیر کے زمانہ میں آپ چیف آف پروٹوکول تھے۔ یاسر عرفات دورہ پر آئے تو بی بی نے ان کو تاکید کی کہ وہ انہیں بتا دیں کہ بی بی مردوں سے مصافحہ نہیں کرتیں۔ آپ نے کہہ دیا مگر یاسر عرفات طیارہ سے باہر آئے تو حسب عادت آپ نے ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھا دیا بی بی کو مصافحہ کرنا پڑا اور ان پر نارض ہوئیں۔ یاسر عرفات نے بی بی کی ناراضگی دیکھ لی خود ہی کہنے لگے ''میڈم! خیر گذری ہے کہ میں نے اپنے رواج کے مطابق آپ کو دو بار منہ پر بوسہ نہیں دیا ہے''۔ (صفحہ ۲۲۷)۔

ارشد سمیع خاں صاحب کی یہ کتاب اپنے مندرجات کے اعتبار سے دلچسپ ہے مگر بعض مقامات پر ان کی پیش کی ہوئی توجیحات قاری کو مطمئن نہیں کرتیں۔

✓

آپ بیتی

برصغیر کے نامور قانون دان، جج اور مصنف رائٹ آنریبل سید امیر علی کی آپ بیتی اسی عنوان سے مکتبہ اسلوب کراچی نے ۱۹۸۴ میں شایع کی تھی۔ یہ خودنوشت پہلی مرتبہ حیدرآباد دکن کے مجلّہ ''اسلامک کلچر'' میں ۱۹۳۱۔۳۲ میں دو قسطوں میں شائع ہوئی تھی۔ انگریزی میں لکھی گئی اس آپ بیتی کا ترجمہ سید جمیل نقوی نے کیا۔

رائٹ آنریبل سید امیر علی ۱۸۴۹ میں بنگال میں چنسورہ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ ۱۸۹۰ میں کلکتہ ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے اور چودہ سال تک اس مرتبہء جلیلہ پر فائز رہے۔ ایک کامیاب اور معزز زندگی گذارنے کے بعد ۱۹۲۸ میں برک شائر لندن کے قریب فوت ہوئے۔ آپ ۱۹۰۹ میں پریوی کونسل کے رکن مقرر ہوئے اور لمبے عرصہ تک برطانیہ عظمیٰ کی نوآبادیات کی اس سب سے بڑی عدالت کے رکن رہے یعنی برطانوی فرمانروا کے مشیر انصاف رہے اور یہ اعزاز بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتا ہے۔ پریوی کونسل کی ''جوڈیشل کمیٹی'' پریوی کونسل کی ایک کمیٹی تھی ''جو فرمانروا کی خدمت میں مشورہ پیش کرتی تھی یہ رپورٹ پریوی کونسل کے ایک باقاعدہ اجلاس میں پیش ہوتی تھی جس میں فرمانروا بذاتِ خود موجود ہوتا تھا'' (تحدیثِ نعمت صفحہ ۲۷۷)۔ اپنی قانونی اور عدالتی مصروفیات کے علاوہ سید صاحب اسلام اور اہلِ اسلام کی خدمت پر ہمیشہ مستعد رہے۔ برصغیر میں رہے تو مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرتے رہے جب انگلستان چلے گئے تو بھی اسلامی ممالک کے مسائل اخباروں میں زیر بحث آتے تو ہر موقعہ پر زوردار لفظوں میں ان کے موقف کی حمایت کرتے۔ ان کے دیباچہ میں ارنسٹ گریفن نے لکھا ہے کہ ایک بار کسی نے اعتراض کیا کہ ''سید صاحب جس مرتبہ جلیلہ پر فائز ہیں اس

پر رہتے ہوئے اس دلیری کے ساتھ مسلمانوں کے موقف کی حمایت کرنا انہیں زیب نہیں دیتا ایسا کرنا ان کے مرتبہ کے منافی ہے'' سید صاحب نے فوراً جواب دیا ''جس مرتبہ پر میں بیٹھا ہوں مسلمانوں کے موقف کی حمایت کرنا میرا فرضِ منصبی بنتا ہے'' (دیباچہ آپ بیتی صفحہ ۶)۔

رائٹ آنریبل سید امیر علی کو اسلام سے بے حد لگاؤ تھا آپ کی دو تصانیف ''سپرٹ آف اسلام'' یعنی روح اسلام اور ''ہسٹری آف دی سار اسنز'' بین الاقوامی طور پر مقبول ہوئیں اور آج تک حوالہ کی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ مولانا شبلی نے جو سیرۃ النبی جیسی عظیم الشان کتاب کے مصنف ہیں سید امیر علی کی کتاب روح اسلام پر تبصرہ کرتے ہوئے سید امیر علی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا '' حضرات اس وقت تک جو کچھ اسلام کی خدمت کی ہے غیر قوموں کے سامنے ہمارے علما نے نہیں کی ہے مولویوں نے نہیں کی ہے ہم دستار بندوں نے نہیں کی ہے۔ بلکہ ان لوگوں نے کی ہے جو داڑھی منڈاتے ہیں۔ امیر علی نے کی ہے جو بالکل داڑھی منڈاتا ہے جس کو میں صورتاً عیسائی سمجھتا ہوں۔ اس نے ایک کتاب اسپرٹ آف اسلام لکھی ہے اس کو پڑھ کر عیسائیوں اور یہودیوں نے اسلام کی وقعت اور تعریف کی'' (آپ بیتی سید امیر علی صفحہ ۱۵) انگلستان میں تعلیم کے دوران ان کے ایک دوست کیٹنگ نے انہیں لارک کی کتاب دس بڑے مذاہب پڑھنے کو دی۔ انہیں محسوس ہوا کہ اس میں تو بہت غلط بیانیاں ہیں چنانچہ انہوں نے ۱۸۷۲ میں پہلی کتاب اسلام کے دفاع میں The critical examination of the life and teachings of Mohammad لکھی اور یہ کتاب ان کے ہندوستان مین واپس آنے سے قبل چھپ بھی گئی۔

انگلستان سے واپسی کے سفر کے دوران آپ پیرس میں ٹھہرے اور مشہور مستشرق گارساں دتاسی سے ملاقات کی روداد لکھتے ہیں'' ان کی شخصیت انتہائی دلکش تھی وہ اور ان کی بیٹی دونوں بہت اچھی انگریزی بولتے تھے لیکن انہوں نے اردو یعنی ہندوستانی میں اپنی استعداد دکھانے کے فطری جذبہ کے ساتھ مجھ سے اسی زبان میں گفتگو کرنے کو ترجیح دی۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھے انگریزوں میں کوئی ایسا شخص نہیں ملا جسے اردو زبان پر اس طرح عبور ہو۔۔۔ ایک روز لنچ کے بعد گارساں دتاسی نے مجھے اپنا کتب خانہ دکھایا اس موقع پر انہوں نے بہت سے اشعار بھی سنائے جو

زیادہ تر سودا کے اور ان کے دوست اور مد مقابل (آتش؟) کے تھے'' (آپ بیتی صفحہ ۳۷)۔

پریکٹس شروع کرتے وقت بڑی دقتیں ان کی راہ میں حائل ہوئیں '' مجھے کسی کی تائید و پشت پناہی کی امید نہ تھی اور نہ ہی آئندہ چل کر کبھی حاصل ہوئی۔ انگریز مجھے خواہ مخواہ کا در انداز سمجھتے تھے اور ہندو تو کھلے عام مجھے ناپسند کرتے۔ رہے مسلمان تو وہ مجھے میری انگریزی بود و باش کی وجہ سے ایک طرح کا مرتد سمجھتے تھے'' (صفحہ ۵۰) مگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کا قدم آگے ہی بڑھتا رہا۔ آپ ابتدا میں کلکتہ میں مجسٹریٹ مقرر ہوئے اس اثنا کے دو مقدمات کا ذکر آپ نے خاص طور سے کیا ہے۔ پہلا مقدمہ ایک ضعیف عورت کا تھا جو خود کشی کرنے کی کوشش کے جرم میں ملوث تھی '' میں نے اس سے دریافت کیا کہ وہ اپنی جان کیوں لینا چاہتی تھی؟ اس نے کہا اس کا بیٹا اس کی دیکھ بھال کرتا تھا وہ مر گیا۔ پھر اس کی بہو بھی مر گئی۔ اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ رہا تو وہ جی کر کیا کرتی؟'' میں نے اسے بری کر دیا اور پولیس بکس فنڈ سے اس کا تین روپیہ ماہانہ گذارا مقرر کر دیا جب میں نے فیصلہ سنایا تو وہ جذبہ تشکر کی شدت سے رو پڑی۔ جب تک میں مجسٹریٹ رہا وہ مقررہ تاریخ پر ہر ماہ عدالت میں حاضر ہو کر وظیفہ وصول کرتی رہی اور مجھے دعاؤں سے نوازتی رہی غالباً یہ اس کی دعاؤں کا ہی نتیجہ تھا جس نے میرے مستقبل کو روشن کر دیا'' (صفحہ ۵۵)۔ دوسرا مقدمہ یوں تھا '' ایک دفعہ ایک نوجوان عورت جس کی گود میں ایک شیر خوار بچہ تھا عدالت میں پیش کی گئی۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے ایک خوردہ فروش کی دکان سے مٹھی بھر چاول چرائے تھے جس کی قیمت بمشکل ایک دھیلہ ہوگی۔ میں استغاثہ اور اس کے اہلکار پر برس پڑا۔ ملزمہ کا بیان تھا کہ وہ اور اس کا بچہ کئی وقت کے بھوکے تھے چاولوں پر نظر پڑتے ہی اس نے بے اختیار مٹھی بھر چاول اٹھا لئے تھے۔ میں نے اس عورت کے متعلق بھی وہی حکم صادر کیا جو خود کشی کرنے والی بوڑھی عورت کے سلسلہ میں کیا تھا (صفحہ ایضاً)۔ گویا سید امیر علی عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر بھی انسانی ہمدردی کے اوصاف سے عاری نہیں ہو گئے تھے۔

اپنی پبلک زندگی کے سلسلہ میں سید امیر علی نے لکھا ہے'' ۱۸۷۸ میں حکومت نے شاہ اودھ (واجد علی شاہ) کے معاملات کی تحقیق کے لئے ایک کمشن مقرر کیا۔ یہ بدنصیب حکمران اپنے ناقص مصاحبوں کے ہاتھوں جلد ہی بری طرح مقروض ہو گیا تھا۔ اور اس وظیفہ کا بڑا حصہ جو

برطانوی حکومت اسے دیتی تھی قرض خواہ چھین لیا کرتے تھے اس کے بچے جن کے بارہ میں خیال تھا کہ وہ بہت سے اتالیقوں سے تعلیم پا رہے ہونگے وہ تعلیم سے محروم ہی رہے" (صفحہ ۶۲) اس کمشن کی سفارش پر حکومت نے بادشاہ کے وظیفہ میں سے پانچ ہزار کی رقم بچوں کی تعلیم کے لئے مخصوص کر دی مگر بادشاہ اودھ اس بات پر بہت ناراض ہوئے۔ حال ہی میں محمد کاظم کی سوانح عمری کے نام سے ایک آپ بیتی منظر عام پر آئی ہے۔ محمد کاظم نے اس دور کے آنکھوں دیکھے حالات لکھے ہیں جو سید صاحب کی باتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ (محمد کاظم کی سوانح عمری کا جائزہ اسی کتاب میں کسی دوسرے مقام پر موجود ہے)۔

سید امیر علی جانتے تھے کہ انگریز اپنے معاشرہ میں مسلمان ہو جانے والوں کو اچھا نہیں سمجھتے "ایلڈرلی کے لارڈ سٹینلے کو بدنام کرنے والوں نے سنکی مشہور کر دیا تھا مجھے تو وہ بھلے چنگے نہایت ہوشیار اور پڑھے لکھے اور وسیع النظر انسان لگے ان کے معترضین کے ذہنوں میں ان کے سنکی ہونے کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے عیسائیت کا آبائی مذہب ترک کر کے اسلام قبول کر لیا تھا" (صفحہ ٦٦) بھلا انگریز اس بات کو ٹھنڈے پیٹوں کیسے قبول کر لیتے؟

آسکر وائلڈ کا ذکر ہے "یہ جمالیاتی تحریک کا سنہری زمانہ تھا اس تحریک کا رہنما آسکر وائلڈ اس میں بہت پیش پیش تھا اور سوسائٹی کے اکثر لوگ اس سے ملاقات کرتے رہتے تھے مگر اس کے تصنع اور بناوٹ کی وجہ سے آدمی کو اس سے کچھ نفرت سی محسوس ہوتی تھی" (صفحہ ٦٧)۔ اسی صفحہ پر یہ بھی درج ہے کہ "جمعہ ۱۶ جولائی کو دوستوں کے مکان پر میری ملاقات خوابوں کی ملکہ سے ہوئی جس نے چند سال بعد مجھے اپنا شوہر بنانے کا اعزاز بخشا"۔ بیگم امیر علی نے اپنے شوہر کے دوش بدوش ہندوستانیوں خاص طور سے مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت کرنے کو اپنا فرض جانا۔ سید امیر علی نے ۱۹۰۸ میں لندن میں مسلم لیگ قائم کی "میرے کچھ دوست عرصہ سے مجھ پر زور دے رہے تھے کہ ایسا ادارہ قائم کیا جائے جو نہ صرف مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرے بلکہ ان مسلمان طالب علموں کو جو کثیر تعداد میں برطانیہ آ رہے تھے عمدہ اور وفادار شہری بنانے کے لئے ایک تربیتی ادارے کا کام دے۔۔۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ برطانوی سیاست کے تغیر پذیر حالات میں مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کے لئے اس قسم کے مربوط اور اہم ادارے کی

کس قدر ضرورت ہے۔ ہمارے ادارے کے مقاصد کا ان جملوں سے اظہار ہوتا تھا جو اس کے دستور العمل کے شروع میں آتے ہیں

(۱) ہندوستان کی مختلف قومیتوں کے درمیان دوستی اور یگانگت بڑھانا

(۲) دوسرے ہندوستانی فرقوں کے ساتھ مل جل کر ملک کے عام مفاد کے لئے کام کرنا

(۳) ملک معظم کی مسلمان رعایا کے خصوصی مفاد کی ترقی اور حفاظت کے لئے جملہ آئینی اور وفادارانہ طریقوں سے کام کرنا۔

(۴) جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کا انگلستان کے ممتاز مفکرین سے رابطہ پیدا کرنا" (صفحہ ۹۵)

اس مسلم لیگ نے اس نازک دور میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا کام بطریق احسن انجام دیا خصوصاً آپ طلبا کے ساتھ ہمدردی کے ساتھ پیش آتے رہے اور ان کے قائم کردہ اداروں میں سرگرمی سے شریک ہوتے اور نو آموزوں کی رہنمائی کرتے رہے۔ سر ظفر اللہ خاں اپنی بیرسٹری کی تعلیم کے دوران کا ایک واقعہ لکھتے ہیں "۲۱ کرامویل روڈ پر ہم قانون کے طلبا نے moot یعنی مجلس بحث کا طریق جاری کیا ہوا تھا۔ پہلے موٹ کے لئے جو قانونی مسئلہ بحث کے لئے چنا گیا اس کا فیصلہ مسٹر جسٹس امیر علی نے "موہری بی بی بنام دھرموداس گھوش" کے مقدمہ میں کیا تھا انکا فیصلہ اپیل میں بھی بحال رہا اپیل کے فیصلے کے خلاف پریوی کونسل میں بھی اپیل ہوا اور وہاں بھی سید امیر علی صاحب کا فیصلہ بحال رہا۔ اب رائٹ آنریبل سید امیر علی پریوی کونسل میں جج تھے انہوں نے moot میں جج بننا منظور کیا ان کے ساتھ دوسرے جج سر ہوریو شیپرڈ تھے جو تھوڑا عرصہ قبل مدراس ہائی کورٹ کی ججی سے فارغ ہوئے تھے۔ فریقین کی طرف سے دو دو وکیل تھے سینئر وکیل تو دو ایسے طالب علم تھے جو بیرسٹری کا آخری امتحان پاس کر چکے تھے مگر ابھی انہیں بیرسٹری کی سند نہیں ملی تھی۔ اپیلانٹ کی طرف سے سینئر وکیل گجرات کے چوہدری عبدالغنی صاحب تھے ان کے ساتھ جونیئر میرے ہم جماعت مسٹر محمد حسن تھے۔ رسپانڈنٹ کی طرف سے سینئر وکیل ایک بنگالی صاحب تھے اور میں ان کے ساتھ جونیئر تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ فیصلہ پریوی کونسل کے فیصلہ

کے مطابق رسپانڈنٹ کے حق میں ہی ہوگا۔ غرض یہ تھی کہ moot میں حصہ لینے والوں کو عدالت میں بحث کرنے کی مشق ہو جائے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ دونوں طرف سے سینئیر کچھ گھبرائے ہوئے رہے اور اپنا کیس واضح طور پر پیش نہ کر سکے اور دونوں طرف سے کیس پر بحث جونیئر وکیلوں نے کی۔ بحث کے آخر پر سید امیر علی صاحب نے فیصلہ سنایا اور بڑی وضاحت کے ساتھ متنازعہ امور اور مسائل بیان کر کے فیصلہ کی تائید میں دلائل بیان کئے۔ ان کا فیصلہ ہمارے لئے ایک نہایت مفید سبق تھا۔ فیصلے کے دوران میں نے انہوں نے فریقین کی طرف سے جو بحث کی گئی تھی اس کے متعلق کچھ تعریفی کلمات بھی کہے۔ moot کی کارروائی کے بعد ساتھ کے بڑے کمرے میں چائے وغیرہ کا انتظام تھا حاضرین کی تعداد خاصی تھی۔ بیگم امیر علی (جو برطانوی نژاد تھیں) بھی موجود تھیں۔ سید امیر علی نے کمال شفقت کے ساتھ میرا تعارف بیگم صاحبہ سے کروایا اور فرمایا یہ نوجوان بہت ترقی کرے گا'' (تحدیثِ نعمت صفحہ ۱۰۴)۔ رائٹ آنریبل سید امیر علی کا یہ اندازہ کتنا درست ثابت ہوا وہ نوجوان نہ صرف برصغیر کے قانونی حلقوں میں محترم و معزز رہا بلکہ بین الاقوامی عدالت کا صدر بن کر وظیفہ یاب ہوا۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

انگلستان میں جا کر بس جانے پر سید صاحب نے جنگ عظیم اول شروع ہو جانے پر برطانیہ کا ادارہ ہلالِ احمر قائم کیا جس نے زخمیوں کی دیکھ بھال اور بہبودی میں قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ ان کی وفات پر ان کے مرقد پر جو پھول چڑھائے گئے ان میں ایک کارڈ بھی منسلک تھا جس پر لکھا ہوا تھا ''اس شخص کی جدوجہد سے بھوکوں کو کھانا ننگوں کو کپڑے ملے۔ بیماروں کا علاج ہوا اور زخمیوں کو صحت عطا ہوئی۔ تھکے ہارے آبلہ پا پناہ گزینوں کو مدد بہم پہنچائی گئی۔ اور کتنی ہی مائیں ان بچوں کو سینے سے لگا سکیں جو عدم توجہی کی صورت میں راستے ہی میں ہلاک ہو جاتے مایوس کسانوں کو جنگی تباہی کے بعد پھر چلانے کے لئے ہل اور بونے کے لئے بیج فراہم کئے گئے'' (دیباچہ سر ارنسٹ گریفن صفحہ ۸)

مادرِ ہند کا یہ سپوت اور ملت اسلامیہ کا یہ ترجمان انگلستان میں آسودہ خاک ہے۔

لمحہ بہ لمحہ زندگی

محترم ابوالامتیاز ع س مسلم کی ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل خودنوشت ''لمحہ بہ لمحہ زندگی''، القمر انٹرپرائزز اردو بازار لاہور سے ۲۰۰۵ میں شائع ہوئی تھی۔ مسلم صاحب کے قول کے مطابق آپ نے ڈاکٹر انور سدید کے کہنے پر یہ خودنوشت مجھے بھیجی تھی مگر سوئے اتفاق کہ مجھ تک نہ پہنچی۔ کوئی دو ہفتے قبل مسلم صاحب کا ایک خط موصول ہوا کہ میں نے ان کی خودنوشت پر تبصرہ کیا ہے نہ ان کے خط کا جواب دیا ہے اور یہ کوئی مناسب بات نہیں۔ میں نے انہیں بواپسی ڈاک مطلع کیا کہ ان کی فرستادہ کتاب اور خط مجھ تک پہنچا ہی نہیں تو میں جواب کیسے دیتا۔ اس جواب کے ایک ہفتہ کے بعد کل کوریئر کے ذریعہ دوبئی سے یہ خودنوشت مجھے موصول ہوئی ہے اور میں حسبِ وعدہ اس کو پڑھنے کے بعد اس کا تجزیہ کر رہا ہوں۔ اس خودنوشت کے پڑھنے سے قبل مسلم صاحب سے میرا تعارف نہیں تھا مگر وہ ماشاءاللہ صاحب تصانیف کثیرہ ہیں۔ نظم ونثر پر برابر کی قدرت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کے ایک کالم کے مطابق ان کی ادبی خدمات پر بھارت کی کسی یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی لکھا جا چکا ہے جو چھپ کر اہلِ نظر سے خراجِ تحسین وصول کر رہا ہے۔ اللھم زد فزد۔ میں تو اس طول طویل اور ضخیم خودنوشت کے حوالہ سے انہیں جاننے پہچاننے کی کوشش کرونگا۔

مسلم صاحب جالندھر کے ایک کوردہ میں پیدا ہوئے ان کے والد کلکتہ اور بنارس میں کاروبار کے سلسلہ میں مقیم رہے گھر میں خوش حالی کا دور دورہ بھی رہا مگر مسلم صاحب کے ہوش سنبھالنے تک وہ دور گذر چکا تھا ایک گونہ عسرت اور تنگ دستی میں ابتدائی تعلیم کے مرحلے طے ہوئے۔ ۱۹۴۲ میں کراچی آجانے تک ان کی تعلیم صرف میٹرک تک تھی اور ان کی پہلی پہلی ملازمت محنت مزدوری کی تھی جس کی اجرت ایک روپیہ یومیہ تھی۔ محنت اور مشقت کرتے اور اپنے

مستقبل کو سنوارنے کی سعیِ حاصل میں مصروف رہے اور اب اللہ تعالیٰ کے فضل سے ستاسی برس کے ہیں اور خوش حال۔ اس ترقی نے ان کے اندر کے ہمدرد انسان کو مرنے نہیں دیا۔ انسان دوستی اور مفید معاشرتی خدمات میں پیش پیش رہے۔ مزاج میں لیڈری نہیں تھی مگر لیڈری انہیں ملتی رہی۔

مولانا محمد زکریا کاندھلوی کی خودنوشت میں ان کے والد محترم مولانا محمد یحییٰ کا ایک واقعہ نقل ہؤا تھا جس کا تعلق ان کے چچا مولانا محمد الیاس بانیِ تبلیغی جماعت سے تھا۔ لکھتے ہیں ''منشی صاحب (یعنی ان کے مکتبہ کے مہتمم) نے ایک مرتبہ میرے چچا جان یعنی مولانا محمد الیاس کو ڈانٹ دیا کہ یونہی پھرتے رہتے ہو کوئی کام کبھی کتب خانہ کا بھی کرلیا کرو۔ میرے والد صاحب کو بہت ہی ناگوار ہؤا۔ اور منشی جی کو خوب ڈانٹا اور فرمایا کہ منشی جی میں تو سمجھتا ہوں کہ اسی کی برکت سے مجھے روزی مل رہی ہے۔ حدیث پاک میں بھی یہ مضمون آیا ہے ھل تُنصرون و تُرزقون اِلّا بِضُعفائِکم (کذافی لمشکوٰۃ بروایۃ البخاری)۔'' (آپ بیتی مولانا زکریا کاندھلوی حصہ سوم صفحہ ۱۳۶)۔ یہ مسئلہ نہایت اہم مسئلہ ہے۔ بعض گھرانوں میں اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے تحت ایسے بچے پیدا ہو جاتے ہیں جو ذہنی یا جسمانی طور سے معذور و ضعیف ہوتے ہیں عام طور سے معاشرہ اور گھر میں والے ایسے بچوں کو وہ توجہ نہیں دیتے جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں بلکہ ان کو بوجھ خیال کیا جاتا ہے۔ لاریب کہ ایسے بچوں کی پرورش اور نگہداشت زیادہ توجہ چاہتی ہے اور حضور کی حدیث میں جو بات واضح کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ تمہیں کیا علم ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اسی ضعیف بچے کی پرورش اور نگہداشت کرنے کے صلہ میں رزق عطا فرماتا چلا جاتا ہے۔ مسلم صاحب کی خودنوشت اس حدیثِ مبارکہ کی نہایت خوب صورت تشریح کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ضعیف بچے کی خدمت کی برکت سے انہیں اتنی اور ایسی کشائش عطا کی کہ جوان کے تصور میں بھی نہیں تھی۔ میرے لئے اتنی طویل اور بھاری بلکہ ایک حد تک بوجھل خودنوشت میں یہی کشش تھی کہ میں نے ایک نشست میں اس خودنوشت کو ختم کر کے دم لیا۔

اس کتاب کی ضخامت دیکھتے ہوئے میرا اندازہ تھا کہ یہ total recall of memory کے زمرہ میں ہوگی اور ایسی خودنوشتیں عام طور سے لکھنے والے کی ڈائریوں یا یادداشتوں کے نوٹس کی وجہ سے طویل ہوتی جاتی ہیں۔ مسلم صاحب کا کہنا ہے کہ انہوں نے کبھی ڈائری یا نوٹس نہیں لکھے (لمحہ بہ لمحہ زندگی صفحہ ۲۴) مگر ہر بات کی تفصیل میں جانے کی عادت نے ان

کی خودنوشت کو طویل تر اور بوجھل بنا دیا ہے۔ اپنی ابتدائی زندگی اور گاؤں کے بیان میں اپنے ارد گرد رہنے والے خدمت گار طبقات کے پیشوں کی تفصیل میں ایسے الجھے ہیں کہ بیالیسویں صفحے تک پہنچ گئے ہیں پھر ذات پات کی تمیز کا قضیہ لے بیٹھے ہیں، رسوم و رواج کے بیان میں کافی تفصیل درج ہے غرض ایسی تفصیلات جن کا ان کی خودنوشت سے براہ راست تعلق نہیں غیر ضروری طور پر معرضِ بیان میں آئی ہیں۔ پھر جالندھر کے نامور یا بدنام زمانہ (چوہدری محمد علی سے ضیاء الحق تک) لوگوں کی فہرست بھی درج گزٹ ہے۔ کہیں کسی نے انکشاف کر دیا کہ لوبھ گڑھ کی کوئی تاریخی حیثیت بھی ہے (صفحہ ۱۰۰) تو اس تاریخ کی تفصیل و تلاش و تحقیق میں الجھ گئے ہیں۔ غرض اس خودنوشت کی ضخامت کو قابو میں رکھا جا سکتا تھا۔ اواخر میں بھی یہی صورت ہے کچھ پے کمشن کا ذکر ہے، کہیں پرل بک کے ساتھ اٹھارہ صفحے کی خط و کتابت کا حوالہ ہے، خوابوں کی تفصیل ہے کچھ شوکت صدیقی صاحب کے خلاف مقدمہ کی تفصیلات ہیں غرض وہ تمام غیر ضروری عناصر یکجا ہیں جو کسی خودنوشت کو فنی لحاظ سے کمزور کرتے ہیں۔

ایک بڑا سقم اس خودنوشت کا یہ ہے کہ واقعات و حالات کے بیان میں تقدیم و تاخیر کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اکثر ایسا ہؤا ہے کہ کسی واقعہ کا حوالہ کہیں پہلے دے دیتے ہیں حالانکہ خودنوشت کے بیانیہ میں وہ واقعہ کہیں بعد میں بیان میں آتا ہے۔ مثلاً بی اے کرنے کے لئے ایک پرائیویٹ کالج میں داخلے کا ذکر کرتے ہیں ''میں اپنی مارس مائنر کار میں وہاں پہنچ گیا'' (صفحہ ۱۹۱) قاری حیران ہوتا ہے کہ ابھی تو ان کی تنگدستی کا ذکر چل رہا تھا یہ کار کہاں سے آ گئی؟ کہیں صفحہ ۲۴۷ پر جا کر یہ عقدہ کھلتا ہے کہ یہ کار ان کی کمپنی کی کار تھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ''سطور بالا میں جمشید نسروانجی مہتہ کا ذکر کر چکا ہوں میری ان سے خاصی نیازمندی تھی'' (صفحہ ۴۴۳) مگر حیرت ہے کہ ''سطور بالا'' میں کہیں ان کا ذکر موجود نہیں۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ آپ نے یہ خودنوشت وقتاً فوقتاً لکھی ہے اور یکجا کرتے وقت دوبارہ اس میں تنسیخ و ایزاد روا نہیں رکھی۔ طویل خودنوشتوں میں یہی خرابی رہ جاتی ہے کہ لکھنے والا خود بھی اس کی طوالت سے گھبرانے لگتا ہے اور چھاپنے سے قبل نظر ثانی سے جی چراتا ہے۔

اس خودنوشت میں محض فنی اسقام ہی نہیں بہت سی فکر انگیز باتیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً استقلال پاکستان کے سلسلہ میں قائداعظم کی گیارہ اگست والی تقریر کا حوالہ درج ہے جو آپ نے

ہیکٹر بولیتھو کی کتاب سے لیا ہے۔ یہ تقریر پاکستان کی اساس ہے "آپ آزاد ہیں آپ کو پاکستان میں اپنے مندروں یا دوسری عبادت گاہوں میں جانے کی مکمل آزادی ہے خواہ آپ کسی بھی مذہب یا نسل یا ذات سے تعلق رکھتے ہوں اس کا کوئی تعلق اس بنیادی اصول سے نہیں ہے کہ ہم سب ایک ریاست کے شہری اور مساوی حیثیت رکھنے والے شہری ہیں"، مسلم صاحب نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ "بعض برادران وطن نے اس وسیع الظرفی کے اعتراف کی بجائے اس تقریر کی ایسی تعبیریں شروع کر دیں کہ گویا یہ ضمانت نظریہء پاکستان سے انحراف کے مترادف تھی۔ اسلامی قومیت کے مخالفین یعنی شکست خوردہ نیشنلسٹ مسلمانوں، مارآستیں منافقوں یا کچھ کم فہم مسلمانوں نے اپنی سادگی میں اس ساز کے ساتھ سر ملانا شروع کر دیا کہ یہ اعلان نظریہء پاکستان سے متصادم اور خلاف اسلام ہے" (صفحہ ۳۶۹) غنیمت ہے کہ خودنوشت نگار نے نام نہیں لئے ورنہ اس زمرہء منافقین میں ایک آدھ نام اس شخص کا بھی آجاتا جس کی تصویر اس خودنوشت میں شامل ہے اور جسے صاحب تصنیف کے صاحبزادے بنگلہ دیش کی امداد کے لئے کوئی چیک پیش کر رہے ہیں۔ اس تاریخی تقریر میں تحریف کرنے کا نیک کام اسی "مردمومن" نے سرانجام دیا تھا مسلم صاحب کس کس مارِ آستین منافق کا ماتم کریں گے؟

پھر کہیں کہیں ادبی چاشنی بھی قاری کا دامن کھینچتی ہے۔ گونا گوں اسفار کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی ان کا دل قرآنی حقیقتوں کی گواہی دیتا ہے۔ لکھتے ہیں "میں نے سنہرے وسرخ صحراؤں ۔۔ جنت نشاں مرغزاروں ۔۔ بحر کی نیلم رنگ موجوں کی طرح مسلسل حرکت پذیر ریت کے ٹیلوں ۔۔ حدِ نظر تک لہروں کی طرح ابھرتے اور اترتے ہوئے سبزہ زاروں ۔۔ ہم سر فلک پہاڑوں ۔۔ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے زمردیں سمندروں ۔۔ قصرِ سلیمان کے نیلگوں بلوریں فرش کے مانند دامنِ صحنِ کوہ میں بادِ صبا کی طرح مہکتی بل کھاتی ہوئی پانی کی نرم و نازک خرام موجوں اور ان پر کنول کی طرح ہلکورے کھاتی ہوئی کشتیوں ۔۔ پریوں کی طرح بلندیوں سے اترتے ہوئے آبشاروں ۔۔ چنچل اور سرمست بل کھاتے ہوئے پہاڑی جھرنوں اور ندیوں ۔۔ تشنہ لب وخشک سار کھیتوں ۔۔ خوبصورت بستیوں اور شہروں کے بیچوں بیچ سے حسن کوہ قاف کی سنہری زلفوں کی طرح لہراتے ہوئے دریاؤں ۔۔ فضاؤں میں پریوں سے سرگوشیاں کرتے ہوئے سربفلک

درختوں ۔۔ روش بہ روش پھولوں سے مزین اور ان کی خوشبوؤں سے معطر تختوں ۔۔ سخت وسنگین پہاڑی پگ ڈنڈیوں ۔۔ کراں تا کراں سفید ملبوس میں برف پوش میدانوں اور چٹانوں ۔۔ قیامت کی گرمی اور گردشِ خون کو منجمد کر دینے والی سردی کے موسموں ۔۔ اور قدرت کی ہمہ دم نوع بنوع اور تحیر خیز نیرنگیوں کے مناظر سے قلب ونظر کو شاداب کیا۔ میں نے **کُلَّ یومٍ ھُوَ فی شان** (۵۵۔ الرحمٰن ۔ ۲۹) کا جلال و جمال ان آنکھوں سے مجسم دیکھا" (صفحہ ۳۰۰)۔

ایک موقعہ پر اپنے ایک احمدی دوست کے ہمراہ جماعت احمدیہ کے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود احمد سے ملاقات کا بھی ذکر ہے اور آپ نے ان سے ملاقات کا ناخوشگوار تاثر لیا ہے حالانکہ خود کہتے ہیں کہ "ہم ان کے معتقدین کے سامنے الٹے سیدھے سوالات کر رہے تھے" اور "ہمارا مطالعہ بھی محدود تھا" (صفحہ ۳۳۸) مگر اسی احمدی دوست نے ان کی بچھڑی ہوئی بہن کو اس کی منزل مقصود تک پہنچایا ہے تو اس کے شکرگزار بھی ہوئے ہیں (صفحہ ۴۰۵)۔ ورنہ ۴۷ کی قیامت صغریٰ میں کون کسی کا پرسانِ حال تھا؟ اسکا مطلب یہ ہے کہ یہ خود دوسروں سے مروت واحسان سے پیش آتے تھے تو دوسروں کے احسان ومروت کو تسلیم کرنے کا حوصلہ بھی ان میں تھا۔ **ھل جزاء الاحسان الا الاحسان.**

غرض یہ خودنوشت ایک نیک سرشت انسان کی جہد للبقاء کی داستان ہے جو اس دورِ ناپرساں میں بھی ہمدردی محبت اور اخوت جیسے انسانی اوصاف سے ممسوح ہے مگر ان کے انداز بیان میں ایسی خوداعتمادی ہے جس کے ڈانڈے خودستائی سے جا ملتے ہیں۔ انہیں اختلاف کرنے والے کی بات خوش نہیں آتی مگر تعریف ہو تو پھولے نہیں سماتے پے کمشن کے سربراہ کے الفاظ آپ نے خاص طور سے درج کئے ہیں کہ "یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے اتنے کمسن اور کم پڑھے لکھے نوعمر آدمی کو اتنا صاحبِ علم پایا ہے" (صفحہ ۴۳۲) اور کمشن کے ارکان کا تعارف کرواتے ہوئے خاص طور سے لکھا ہے کہ وہ جسٹس منیر تھے۔

سرورق پر وقت کے پیش منظر میں ایک باریش اور متدین شخص کی تصویر ہے اور امید واثق ہے کہ یہ ریش مبارک ان کے اس دوست جیسی حادثاتی تبدیلی کی آئینہ دار نہیں جس کا ذکر آپ نے فرمایا ہے کہ "اس کی بیوی بیماری کی تاب نہ لا کر اس کا ساتھ ہمیشہ کے لئے چھوڑ چکی تھی اور خود اس کی

ذہنی حالت ایسی تھی کہ اس کو نارمل ہونے میں ایک ڈیڑھ سال کا عرصہ لگا اس کی دنیا ہمیشہ کے لئے بدل گئی اس نے داڑھی رکھ لی گھٹنوں سے نصف گز نیچی قمیض اور سر پر باقاعدہ ٹوپی پہننے لگا'' (صفحہ ۳۴۱)۔

اردو کی خودنوشتوں میں جاوید شاہین کی خودنوشت ''میرے ماہ و سال'' واحد خودنوشت ہے جس میں نے انہوں نے اپنے والد مرحوم کا ذکر تحقیر سے کیا ہے مگر اس سے قبل ایک سی ایس پی افسر جناب محمد منصور کاظم کی خودنوشت ''میری داستان'' بھی چھپ چکی جس میں انہوں نے اپنے والد گرامی کے جوتے پالش کرنے کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ جناب ع س مسلم نے بھی اپنے والد گرامی کا ذکر بڑے احترام اور محبت سے کیا ہے۔ ان کے ہاں مسلم ولا میں دعوتوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ لکھتے ہیں ''ایسے مواقع پر میرا معمول تھا کہ انہیں مہمانوں کے درمیان لان میں تشریف آوری کے لئے اسی وقت کہتا جب زیادہ تر لوگ آ چکتے۔ میں والد گرامی کو اندر سے بلاتا جو اپنی چھڑی سے فرش پر ٹک ٹک کرتے ہوئے آہستہ آہستہ لاؤنج میں برآمد ہوتے اور میں بہ آواز بلند اعلان کرتا خواتین و حضرات میرے والد گرامی!'' (صفحہ ۵۲۵) اس پذیرائی سے ان کا دل ہاتھ بھر کا ہو جاتا ہوگا اور وہ اپنے سعادت مند بیٹے کو کتنی دعائیں دیتے ہونگے۔ اس دور نا پرساں میں ایسی مثالیں شاذ ہیں مگر قابلِ تقلید۔

اس کتاب کے آغاز میں آپ نے صفحہ ۱۲۴ پر رضا علی معجز کا ایک مشہور مصرعہ لکھا ہے ''سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے'' اس شعر کا مصرعہ اولیٰ ہم انہیں یاد کروائے دیتے ہیں ''مہیا گرچہ سب اسباب ملکی اور مالی تھے۔'' مصرعہ ثانی کے مقابلہ میں مصرعہ اولیٰ کمزور اور کم زوردار تھا اس لئے دوسرا مصرعہ ہی لوگوں کو یاد رہ گیا اور ضرب المثل بن گیا۔

مجھے توثق ہے کہ اگر یہ خودنوشت اتنی طویل نہ ہوتی تو زیادہ دلچسپی سے پڑھی جاتی۔

ذکرِ میر

میر تقی میر کی خودنوشت سوانح حیات ''ذکرِ میر'' کے نام سے موسوم ہے۔ نکات الشعراء میں میر نے اپنا احوال یوں لکھا تھا ''فقیر حقیر میر تقی میر' اس کتاب کا مؤلف اکبر آباد (آگرہ) کا رہنے والا ہے زمانے کے انقلاب کے باعث کچھ مدت سے دہلی میں آباد ہے۔'' آگے ذکرِ میر کا ذکر۔ ''فقیر میر محمد تقی میر کی کہانی اس کی زبانی۔ فقیر میر محمد تقی تخلص میر بیان کرتا ہے کہ میں ان دنوں بیکار تھا اور گوشہء تنہائی سے خوگر۔ میں نے اپنا احوال جس میں تاریخی واقعات، حکایات اور روایات ہیں قلم بند کیا ہے۔ اس تصنیف کے (جس کا نام ''ذکرِ میر'' ہے) آخر میں لطائف بھی شامل کر دئے ہیں۔''

ان کے مورثِ اعلیٰ حجاز سے ہندوستان وارد ہوئے۔ معاش کی تلاش میں ان کے پردادا دارالخلافہ آگرے میں آباد ہوئے۔ آب و ہوا کی تبدیلی سے بیمار ہوئے اور ایک بیٹا چھوڑ کر رہگزائے قضا ہو گئے۔ ان کے دادا کو انتہائی جدوجہد کے بعد آگرے کے نواح کی فوجداری مل گئی۔ پچاس سال کی عمر میں بیمار ہوئے علاج معالجہ سے صحت یاب ہو گئے مگر گوالیار کا سفر آن پڑا جس کی صعوبت برداشت نہ کر سکے اور عالم باقی کی جانب سفر کیا۔ ان کے دو لڑکے تھے ایک بیٹا خلل دماغ کا شکار ہوا وہ جوان ہی مر گیا۔ دوسرے بیٹے یعنی میر تقی میر کے والد نے ترک دنیا کا ارادہ کر لیا قناعت اختیار کی۔ وہ جوان صالح متقی اور عشق پیشہ تھے اس لئے اپنے پیر سے علی متقی کا خطاب پایا۔ فقر کی حالت میں ایک فقیر سے ملنے کے لئے لاہور کا ارادہ کیا'' جہاں راستے میں ٹھہرتے رزاقِ مطلق رزق بہم پہنچاتا (صفحہ ۳)۔ واپس دلی پہنچے تو امیر الامراء نے ملاقات کی خواہش کی۔ نہیں ملے کہلا بھیجا'' کہہ دینا ملاقات کے لئے مناسبت شرط ہوتی ہے اس لئے مجھے معذور سمجھئے'' (صفحہ ۵)۔ ان کے ایک شاگرد امان اللہ تھے انہوں نے میر کو متبنیٰ کر لیا۔ ذکر میر میں

لکھا ہے ''میں سات سال کا تھا کہ سید امان اللہ نے مجھے بیٹا بنا کر اپنے پاس رکھ لیا مجھے نہایت نازو نعم سے پالا'' (صفحہ ۷)۔ امان اللہ فوت ہو گئے تو میر کو بہت صدمہ ہوا۔ میر متقی نے ان سے کہا'' بیٹا میں خود چراغِ سحری ہوں تم اب بچے نہیں ہو ماشاءاللہ دس برس کے ہو گئے ہو فقیر زادے ہو صبر اور حوصلے سے کام لو'' (صفحہ ۱۵) میر متقی بیمار ہوئے بخار ہڈیوں میں اتر گیا یعنی والد کو جو پہلے ہی ہڈیوں کا ڈھانچہ تھے دق ہو گیا والد نے مجھ سے کہا'' مجھے غذا کی رغبت نہیں کھانے سے تکلیف ہوتی ہے جو دوا حکیم دیتا ہے وہ دوسری صبح تک کفایت کرتی ہے میں چاہتا ہوں کہ جیتے جی نرگس کے پانچ چھ گلدستے بازار سے لے آؤ میں انہیں سونگھ لیا کروں گا۔ میں نے نرگس کے گلدستے منگوا کر ان کے پاس رکھ دئے جب آنکھ کھولتے تو گلدستہ اٹھا کر سونگھ لیتے اور کہتے الحمد للہ کہ میں سیر ہو گیا'' (صفحہ ۱۶)۔ ان کی رحلت کے بعد میر کا اپنا احوال شروع ہوتا ہے۔

میر نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے زمانے کی طوائف الملو کی اور بدامنی کا ذکر کیا ہے۔ مغلوں کا زوال، مرہٹوں کی مرہٹہ گردی، ایسٹ انڈیا کمپنی یعنی انگریزوں کی عمل داری، روہیلوں کی جنگیں، آصف الدولہ کے معرکے، یہ سب باتیں معرض بیان میں آئی ہیں اور یہ بھی کہ شرفاء گذر بسر کے لئے کسی نہ کسی رئیس سے وابستہ رہتے تھے اور اسی کے دست نگر تھے۔ میر کا اپنا حال یہی ہے کہ کبھی ایک در کے ساتھ وابستہ ہیں کبھی دوسرے کے ساتھ۔ ''باپ کے مرنے کے بعد ہمارا کوئی سرپرست نہ رہا بڑے بھائی کا دست نگر بھی خدا نے نہ بنایا چھوٹے بھائی پر گھر چھوڑ کر میں آگرے کے اطراف میں اسباب معاش کی تلاش میں سرگرداں رہا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا آخر مجبور ہو کر آگرے سے دلی پہنچا۔ خواجہ محمد باسط جو صمصام الدولہ امیر الامراء کا بھتیجا تھا میں اس سے ملا اس نے میرے حال پر عنایت کی مجھے امیر الامراء کے پاس لے گیا۔ امیر الامراء نے دیکھ کر پوچھا یہ کس کا لڑکا ہے خواجہ باسط نے کہا میر محمد علی کا ہے۔ امیر الامراء نے کہا اس کے آنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا سے چل بسے۔ پھر اظہار افسوس کے بعد بولے کہ میر محمد علی کے مجھ پر حقوق ہیں ایک روپیہ روزینہ میری سرکار سے اس لڑکے کو دیا جائے'' (صفحہ ۱۹)۔ ''نادر شاہ کے محمد شاہ پر فتح پانے تک وہ روزینہ مجھے ملتا رہا صمصام الدولہ کے بادشاہ کے مقابلہ پر مارے جانے پر وہ روزینہ بند ہو گیا۔ ہنگامہء نادری کے بعد پھر زمانے کے مصائب کا شکار ہوا والد کی زندگی میں جو سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے انہوں نے آنکھیں پھیر لیں''۔۔۔ ''ناچار دوسری

بار دہلی کا سفر اختیار کیا اور مجبوراً سراج الدین خاں آرزو کا احسان مند ہونا پڑا۔۔۔ وہ پکے دنیادار تھے میرا بگاڑ چاہنے لگے۔ اگر میں ان سے ملتا تو مذاق اڑاتے اگر بچتا تو شکایت کرتے۔ میں نے ان سے جو ذہنی کوفت اٹھائی اس کا کیا بیان کروں؟ گھٹتے گھٹتے آخر مجھے جنون ہو گیا جب سورج ڈوب جاتا اور چاند نکلتا تو اسے تکتا رہتا۔ چاند کی طرف تکتے رہنے سے یہ کیفیت پیدا ہوئی کہ پیکر ماہ ایک حسینہ جلوہ کناں نظر آتی جس طرف نظر اٹھاتا اسی کی صورت نظر آتی۔ رات کو تصویر خیالی سے باتیں رہتیں۔ دن نکلتا اور اس کی صورت غائب ہو جاتی اس کی جدائی میں یہ حالت ہوتی کہ دیوانہ وار گھومتا۔ ہاتھ میں پتھر ہوتے لوگ مجھ سے بھاگتے چار ماہ اسی طرح گذرے۔ موسم بہار کا آنا تھا کہ میری دیوانگی اور بڑھ گئی آخر مجھے زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔۔۔۔ فصل خریف کا آنا تھا کہ دیوانگی جاتی رہی۔'' (صفحہ ۲۱)

''ایک بار میں نے راجہ جگل کشور سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا وہ بے چارہ شرمندہ ہو گیا۔ کہنے لگا میری حالت بگڑ گئی ہے اگر مجھے مقدور ہوتا تو کوتاہی نہ کرتا'' ایک دن راجہ جگل کشور سوار ہو کر راجہ ناگرمل کے یہاں گیا اور میری سفارش کی۔ ناگرمل نے بلایا تو میں گیا تو بڑی مہربانی سے پیش آیا۔ کہا دعوت شیراز حاضر ہے یعنی آپ کا حصہ آپ کو ملے گا۔ مجھے اطمینان ہو گیا۔ چلا آیا۔ دوسرے دن گیا شعر سنے اور کہا کہ میر کے اشعار موتیوں کی لڑیاں ہیں۔ مجھے ان کا طرز کلام بہت پسند ہے اس طرح ان کے ہاں آتا جاتا رہا لیکن حاصل کچھ نہ ہوا'' (صفحہ ۳۱) ایک رات میں راجہ ناگرمل کی خدمت میں حاضر ہوا مجھے ایک سال کی تنخواہ دے کر کہا اکثر مجھ سے ملتے رہئے اس کے بعد میں روزانہ عشاء کی نماز کے بعد بطور ملازموں کے ان کے پائیں باغ میں حاضر ہوتا اور دو پہر رات گذار کر اٹھ آتا'' (صفحہ ۳۲)

دہلی کی بربادی کا نقشہ میر نے کھینچا ہے ''ایک دن میں سیر کو نکلا میرا گذر شہر کے ایک نئے ویرانے میں ہوا میں ہر قدم پر رویا اور عبرت حاصل کی جب آگے بڑھا تو حیرت بڑھ گئی کیونکہ میں ان مقامات کو نہ پہچان سکا۔ مجھے شہر کے اس حصے کا پتا نہ چل سکا کیونکہ نہ وہاں عمارات ہیں نہ رہنے والے۔ ڈھئے ہوئے گھر ٹوٹی ہوئی دیواریں بے صوفی کی خانقاہیں، بغیر شرابیوں کے بھٹیاں۔۔۔ بازار کہاں جن کا ذکر کروں؟ بازاری حسین لڑکے کہاں؟ حسن کا کیا ذکر، زرد رخسار احباب۔ کہاں حسین جوان چلے گئے بوڑھے پارسا گذر گئے محلے برباد گلیاں ناپید ہر طرف وحشت کے آثار۔۔۔ اچانک اس محلے کی طرف گذر ہوا جہاں میں رہتا تھا یہاں کسی زمانہ میں محفلیں جمتی تھیں شعر خوانی ہوتی تھی اور

عاشقانہ زندگی بسر ہوتی تھی۔ راتوں کو ہنستے اور روتے۔ حسینوں سے محبت کرتے ان کی تعریف کرتے ان کے ساتھ وقت گزارتے تھوڑی دیر ان سے جدا رہتے تو ہزاروں تمنائیں پیدا ہوتیں۔ محفلیں سجاتے حسینوں کو ان میں بلاتے۔ مگر اب محلے میں کوئی شناسا نظر نہیں آیا جن سے دو باتیں کرتا۔ پھر وہاں سے جنگل کی طرف نکل گیا اور عہد کیا جب تک دہلی میں قیام ہے شہر میں نہیں آؤں گا'' (صفحہ ۴۷۔۴۸) یہ تو دہلی کا حال تھا اب آگرے کی بپتا بھی سن لیجئے ''آگرے کے شاعر مجھے سرآمد شعرا سمجھ کر اکثر ملنے آتے تھے۔۔۔ میں صبح شام روزانہ جمنا کے کنارے چلا جاتا اور دریا کی سیر سے لطف اندوز ہوتا یہ کہنا درست ہوگا کہ یہ دریا نہیں جنت کی نہر ہے میری شعر گوئی ملک گیر ہو چکی تھی حسین جمیل شکیل پاکیزہ طینت موزوں طبیعت دم بھر کو اکیلا نہ چھوڑتے میرا انتہائی احترام کرتے دو تین بار میں نے شہر کی گشت کی اکبر آبادی علما فقرا شعرا سے ملا لیکن کوئی ایسا فرد نہیں ملا جس سے میرے دل کو تسلی ہوتی۔۔۔ میں نے دل میں کہا سبحان اللہ یہ وہی شہر ہے کہ جس کی ہر گلی میں عارف' کامل' فاضل' شاعر' منشی' دانشمند' وغیرہ رہتے تھے اور ہر گلی میں مدرسہ مسجد خانقاہ تکیہ مہمان سرا اور باغ وغیرہ ہوتا تھا مگر اب کوئی ایسا مقام نہیں جہاں خوشی کے چند لمحات گذار سکوں۔ غرض چار مہینے آگرے میں قیام رہا روانگی کے وقت میری آنکھوں میں آنسو آ گئے'' (صفحہ ۵۰۔۵۱)

اب لکھنؤ کا قصہ سنئے ''وزیر اعظم آصف الدولہ گورنر بہادر (جو کلکتے سے آ رہے تھے اور برعظیم پاک و ہند کا اکثر علاقہ ان کا مقبوضہ تھا) کے استقبال کے لئے لکھنؤ سے نکلے لشکر کی گرد آسمان تک پہنچی۔ یہ سفر الہ آباد تک رہا گورنر جنرل کے دیکھنے اور استقبال کرنے کے لئے علاقے کے تمام سردار جمع ہوئے ایک منزل آگے بڑھ کر نواب آصف الدولہ نے گورنر جنرل سے ملاقات کی اور وہاں سے اپنے ساتھ گورنر بہادر کو لکھنؤ لائے'' (صفحہ ۸۶) جب گورنر دریا کے رستے کلکتے کی جانب روانہ ہوا آصف الدولہ اپنے دارالریاست میں واپس آیا۔۔۔'' ''اب بادشاہ کے پاس کوئی سردار نہیں ہے'' ''بادشاہ بے طاقت ہے'' گمان غالب ہے کہ مرہٹوں کا دور دورہ ہو جائے گا۔'' (صفحہ ۸۸) '' اب مرہٹوں کی فوج دہلی میں آ گئی ہے سنا ہے شہر انہی کے قبضے میں ہے'' (صفحہ ۹۰) ''نابینا شاہ عالم کو بادشاہ بنایا اور قلعے کو جاٹوں کے حوالے کیا اب بادشاہ کو سو روپیہ یومیہ خرچ کے لئے دیتے ہیں۔ اب بادشاہ مرہٹے ہیں جو چاہتے ہیں کرتے ہیں دیکھئے کیا نوبت آتی ہے؟'' (صفحہ ۹۳)۔

اس کے بعد میر نے کتاب کا اختتام عجب دردناک انداز میں کیا ہے ''قصہ مختصر دنیا عجیب حادثہ گاہ ہے کتنے مکانات برباد ہوئے اور کیسے کیسے جوان چل بسے۔ باغ ویران ہو گئے محفلوں کے فقط افسانے رہ گئے کیسے کیسے پھول مرجھائے۔ حسین جوان مٹی میں مل گئے قافلے روانہ ہو گئے عزت داروں نے ذلتیں اٹھائیں اور مرد جاں بہ لب ہو گئے۔ اس چشمِ عبرت نے کیا کچھ نہ دیکھا اور گوشِ شنوا نے کیا کیا نہ سنا؟۔ ''ہر کاسہء سر زافسرے می گوید۔ ہر کہنہ خرابے ز درے می گوید۔ دنیاست فسانہ پارہء ما گفتیم۔ واں پارہ کہ ماند دیگرے می گوید''۔ یعنی (''ہر کاسہء سر تاج کا دیتا ہے نشاں' کہتا ہے کھنڈر میں بھی کسی دن تھا مکاں' دنیا ہے فسانہ کچھ کہا ہے ہم نے' باقی جو ہے دوسرا کہے گا وہ میاں'') ''اس عرصہ زندگی میں دل نے جو قطرہء خوں ہے کیا کیا ستم نہ اٹھائے دل تمام خون ہو گیا۔ طبیعت ناساز تھی لہذا میں نے سب سے ملاقات چھوڑ دی۔ اب تو بڑھاپا آ گیا ہے یعنی عمر ساٹھ سال کو پہنچ گئی ہے اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں کچھ مدت آنکھوں کی تکلیف رہی جب نظر کمزور ہو گئی تو میں نے عینک لگا لی۔ افسوس اب تو نظر بازی سے محروم ہو گیا۔ دیدہ چوں محتاج عینک گشت فکر خویش کن۔ ہر نفس دارندروز واپسیں آئینہ را۔ دانتوں کے درد کی تکلیف کا کیا حال سناؤں آخر میں کہاں تک علاج کروں۔ تنگ آ کر ایک ایک دانت نکلوا دیا۔ روزیء خود را بہ

رنج از دردِ دنداں می خورم۔ تاں بہ خوں تر می شود تا پارہ ناں می خورم!

غرض ضعفِ قویٰ بے دماغی' ناتوانی' دل شکستگی اور آزردہ خاطری سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں زیادہ نہ جیوں گا۔ اب زمانہ بھی رہنے کے قابل نہیں رہا۔ دنیا سے ہاتھ جھاڑنا چاہئے خاتمہ بخیر ہونے کی تمنا اور دعا ہے ورنہ خدائے تعالٰی کے اختیار میں سب کچھ ہے'' (صفحہ ۹۳ تا ۹۵) یہاں ''ذکر میر'' یعنی میر کی سرگشت ختم ہوتی ہے۔ یہ سرگزشت فارسی میں تھی انجمن ترقیء اردو نے اسے اردو میں منتقل کروایا۔ ترجمہ غالباً بابائے اردو کا کیا ہوا ہے مگر اس سلسلہ میں میں توثق سے کچھ کہہ نہیں سکتا کہ مجھے جو نسخہ بتلاش و کوشش بسیار دستیاب ہوا ہے وہ ناقص ہے اس کا سرورق موجود نہیں نہ کوئی اور وسیلہ مترجم کی تعیین کا ہو سکتا ہے۔ یہی غنیمت ہے کہ میر کے حالات خود ان کے قلم سے لکھے ہوئے تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔

✓

شناسائیاں رسوائیاں

کشور ناہید کی خودنوشت ''بری عورت کی کتھا'' کے مختصر جائزہ میں میں نے لکھا تھا کہ ''کشور ناہید ایک منہ پھٹ بڑبولی اور نہتی عورت ہے'' (بری عورت کی کتھا۔ صفحہ ۲۵) ''جب کسی ایسی عورت کا منہ کھل جائے تو اسے بند نہیں کیا جا سکتا۔'' (پس نوشت صفحہ ۶۳) میں نے اس وقت اس خود نوشت کا تفصیلی جائزہ لینے سے گریز کیا تھا کہ اس میں رجال کا حصہ بالکل معدوم تھا اور رجال کے تذکرہ کے بغیر انسان کی پوری شخصیت سامنے نہیں آتی۔ اب کشور نے وہ حصہ ''شناسائیاں رسوائیاں'' کے عنوان سے علیحدہ چھپوا دیا ہے اور ان کی شخصیت آئینہ ہو کر سامنے آ گئی ہے۔

کشور ناہید ہماری ہم عصر ہیں ان کی یونیورسٹی کی تعلیم کا دورانیہ بھی وہی ہے جو ہمارا ہے۔ اس زمانہ میں ہم نے بہت سے ایسے مباحثوں میں بھی شرکت کی ہے جن میں کشور ناہید شریک ہوتی رہی بہت سے ایسے مشاعروں میں شریک ہوئے جن میں کشور ناہید نے بڑے بڑے انعام جیتے۔ ہماری ٹیم تو شبنم عابد علی (بعد کو شبنم شکیل) کی ٹیم تھی کیونکہ یونیورسٹی کے زمانہ میں وہ ہمارے ساتھ اورئینٹل کالج میں تھیں (اور ہمارے ایک مرحوم دوست کے قول کے مطابق ہم تو محض شلغم کے ''تابعِ مہمل'' بلکہ ''تابع محمل'' تھے)۔ وہ بھی کشور ناہید کی دوست اور ہم عصر ہیں۔ اس لئے ایک ہم عصر کی خودنوشت کا جائزہ لینے والا لامحالہ اپنے ماضی کو بھی کھنگالنے لگتا ہے۔ ہمیں اسلامیہ کالج کا وہ شمع تاثیر والا مشاعرہ بھی یاد ہے جس میں کشور ناہید نے بڑا انعام جیتا تھا اور یہ ان کے اور ہمارے یونیورسٹی تک پہنچنے سے پہلے کا زمانہ ہے۔ اگرچہ ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ کشور ناہید اب جو کچھ بھی چاہے کہے اس زمانہ میں ابھی کشور ناہید کا نام اتنا نمایاں نام نہیں تھا کہ لوگ ان

سے شناسائی کو رسوائی کا نام دینے لگتے۔ ہمارے ایک دوست نے کشور ناہید کی اس کتاب پر پھبتی کہی ہے کہ ''یوں لگتا ہے کشور ناہید پیدا ہی D.G. N.C.A ہوئی تھی'' ان کی ساری شناسائیوں کا بیان اسی سطحِ بلند سے شروع ہوتا ہے۔

کشور ناہید نے اس زمانہ کے ریڈیو اور ٹی وی کے ماحول کو بھی یوں روایت کیا ہے جیسے یہ اس ماحول اور اس establishment کا حصہ ہوں۔ درست کہ کشور ناہید اس زمانہ میں ریڈیو اور ٹی وی کے کچھ پروگرام کرتی تھیں مگران کی حیثیت' میرے منہ میں خاک' محض ایک جز وقتی آرٹسٹ کی تھی۔ ٹی وی کے آنے سے پہلے تو ریڈیو والوں کا تبختر دیکھنے والا ہوتا تھا وہ ایک ایک پروگرام کے لئے لوگوں کو جس طرح خوار و خجل کرتے تھے وہ کوئی ڈھکا چھپا راز نہیں۔ ٹی وی نے آ کر ان کی ساری کر و فر کو خاک میں ملا دیا ٹی وی پروگرام بھی شروع شروع میں ہر ایک کی دسترس میں نہیں تھے۔ اس لئے کشور ناہید کا یہ کہنا عجیب تر لگتا ہے کہ ''۱۹۶۴ میں ہم لوگ نئے ریڈیو سٹیشن جاتے جاتے پیچھے کی جانب بنے دو کمروں کی جانب مڑ جاتے'' (صفحہ ۱۱۱) یا یہ کہ ''ضیاء الحق کے زمانہ تک ٹیلیویژن سنٹر ہمارے لئے دوسرے گھر کی طرح تھا'' ۔۔۔ یا ۔۔ ''ادھر ہم لوگ میرا جی سے لے کر ناصر کاظمی اور منیر نیازی کا کلام منتخب کر کے دیتے ادھر لوگ ۔۔۔'' (صفحہ ۱۱۳) کشور ناہید نے تو یہ تک لکھ دیا ہے کہ ''ایک زمانہ میں ظہور آذر نے شور مچایا کہ تم ادیب لوگ کہتے ہو کہ ٹیلیویژن پر کوئی پڑھا لکھا بندہ مقرر ہونا چاہئیے تا کہ پروگرام معیاری ہوں بتاؤ کس کو لگائیں؟ صوفی تبسم اور میں اور یوسف' اختر وقار عظیم کے کمرہ میں گئے یہ اس وقت لاہور کے پروگرام مینیجر تھے ہم نے ضیا جالندھری کو فون کیا کہ تم نے خواہش کا اظہار کیا تھا کہ تمہیں ایم ڈی ٹیلیوژن لگوا دیا جائے ہم نے یک زبان ہو کر کہا ''بول تیری مرضی کیا ہے'' ضیا جالندھری اس وقت پوسٹل سروس میں کسی عام سے عہدے پر تھے منمنا کر بولے اگر مجھے اونچا گریڈ مل جائے تو میں آنے کو تیار ہوں۔ ہم نے افسر بادشاہ تک بات پہنچائی افسر نے غضبناک ہو کر کہا فکر مت کرو آؤ تو سہی اونچا گریڈ بھی مل جائے گا بس اگر بادشاہ سلامت کو سلام تو پیش کرو۔ جی حضوری ہوئی مراد بر آئی۔ عہدہ مل گیا۔ پھر اختر وقار عظیم کا کمرہ تھا اور افسر بنے ضیا جالندھری تھے فرمایا ''یہ ذرا کشور ناہید اور یوسف کامران کو

ٹی وی پر مت بلایا کرو'' (صفحہ ۱۱۴۔۱۱۵)۔ ہم کشور ناہید کی رسائیوں کے قائل ہیں مگر ان بیانات کی روشنی میں اگر کشور ناہید چاہتی ہیں کہ انہیں اس دور کے ٹیلویژن کا نفس ناطقہ مان لیا جائے تو شاید یہ ممکن نہ ہو۔ اور ان کے ضیا جالندھری والے بیان کو تو شاید ان کے دوست بھی مشکل سے باور کریں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ جملہ معترضہ ہی سہی بات بڑے پتے کی ہے جو ہم نے منیر نیازی سے منسوب سنی ہے اور اس نے ضیا جالندھری کے ایم ڈی ٹی وی ہونے پر کہی تھی کہ'' خوش آ گئی ہے ضیا کو جلندھری میری''۔ اس زمانہ میں بادشاہ سلامت کے معیار ایسے ہی تھے۔

صوفی صاحب کے ذکر میں کشور نے لکھا ہے کہ گورنمنٹ کالج کے جشن صد سالہ پر کتاب شائع ہوئی تو اس میں صوفی صاحب کا ذکر کم کم تھا۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ جب اسی کالج کی صد سالہ تقریبات ہوئی تھیں تو ان میں ڈاکٹر سلام جیسے نابغہ کا ذکر ہی نہیں تھا۔

اس کتاب میں یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ بے نظیر نے حبیب جالب کی تعزیت کرتے ہوئے ان کی بیوی سے کہا'' میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں'' تو اس بے بدل عورت نے جواب دیا'' جب میرے شوہر نے اپنی زندگی میں آپ سے کچھ نہیں لیا تو میں کیا لے سکتی ہوں'' (صفحہ ۱۰۹)

ہمارے دور کے عظیم آرٹسٹ ایم ایف حسین نے اپنی خودنوشت میں کشور ناہید کے دوپٹہ پر پینٹنگ کرنے کا واقعہ لکھا ہے'' کشور ناہید کی کہانی کے اوراق پر ایک کاغذ کورا نہیں چھوٹا ان کا سفید دوپٹہ ہی سہی۔ کاغذ نہ ملنے پر احمد فراز کی ضد پر دوپٹے پر حسین کا برش چلا'' (ایم ایف حسین کی کہانی اپنی زبانی۔ صفحہ ۲۰۳۔ کشور لکھتی ہیں'' انہوں نے احمد فراز کو اسلام آباد سے لاہور بلوایا تھا مجھے حکم ملا آج شام کوئی اور نہیں ہوگا تم میں اور فراز بیٹھیں گے۔ میں تم دونوں سے شعر سنوں گا۔ ابھی حسین صاحب کو آئے ہوئے دس منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ مستنصر حسین تارڑ ایک بورڈ اور مار کر لئے آن دھمکے۔ اس سے پہلے میں نے حسین صاحب کو اتنے برے موڈ میں نہیں دیکھا تھا۔ میں نے لجاجت سے کہا'' ذرا سی ڈرائینگ کر کے دستخط کر دیں''۔ مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھا پھر کتنی دیر لگتی تھی ڈرائینگ کرنے میں۔ جس وقت مستنصر نے کہا میرا نام بھی لکھ دیں بس بیچ پا ہو گئے۔ میں نے مستنصر کو رخصت کیا اور اب کہا کہ دروازے کو تالا مار دیا کسی کو خبر بھی نہیں کہ گھر میں

کوئی ہے آئیے بیٹھیں۔ آؤ فراز شعر سناؤ۔'' پہلے ہم موڈ ٹھیک کرنے کو باتیں کریں گے''۔ پتہ نہیں چلا کہ گفتگو کہاں شعر میں ڈھل گئی۔ ایک دم دیکھا کہ حسین صاحب نے میرا اوڑھا ہوا ململ کا دوپٹہ میرے کندھے پر سے گھسیٹا مار کر ہاتھ میں لیا فراز کا پورٹریٹ اور میرے ہاتھ پاؤں بنا کر فراز کو کہا '' لو یہاں اپنے دستخط کرو اپنا شعر لکھو پھر میں اور تم دستخط کریں گے''۔ (صفحہ ۱۲۶)۔

مصور علی امام کے گھر ڈاکہ کا ذکر ہے (صفحہ ۱۳۱) حقی صاحب کی ہزلیات کا تذکرہ ہے (صفحہ ۱۵۸) قاسمی صاحب کے حواریوں کا بیان ہے کہ'' بزرگوں کے پڑھنے کے دوران ساقی فاروقی اور باقر مہدی ٹوک دیا کرتے تھے اور وہ لوگ بڑے تھے برا نہیں مانتے تھے۔ یہی بات اگر قاسمی صاحب کے سامنے کہہ دی جائے تو وہ معصوم خود کچھ نہیں کہتے تھے لیکن ان کے حاشیہ بردار طومار باندھ دیتے تھے بات دشمنی کی حد تک پہنچ جاتی تھی'' (صفحہ ۱۵۲)۔

نیرنگیِ زمانہ کے ذکر میں یہ بھی مرقوم ہے'' سید سبط حسن افسوس سے سناتے تھے کہ کس طرح فیض صاحب کی ایک بیٹی نے اس گھر کا کرایہ مانگا تھا جس گھر میں وہ رہتے تھے کہ وہ کوٹھی اس بیٹی کے نام خریدی گئی تھی۔ جب سید صاحب نے ڈانٹ کر خط لکھا کہ تم مجھے بیوپاری لگ رہی ہو تو اس نے کہا تھا ہاں ہوں میں بیوپاری آخر گھر میرے نام ہے مجھے کرایہ چاہئے'' (صفحہ ۱۷۰)۔ ایسی ہی بات بریگیڈیر اسمٰعیل صدیقی صاحب نے کرنل محمد خاں کے احوال میں لکھی تھی کہ ان کی اولاد نے انہیں ان کے اپنے ہی مکان سے بے دخل کر دیا۔ (لخت لخت داستان صفحہ ۲۱۳۔۲۱۴)

لاہور میں مرزا ادیب کے ساتھ جو کچھ ہُوا وہ تو اب قصہ پارینہ ہے اس کا ذکر کشور ناہید نے نہیں کیا۔ سرسید کو بھی ان کے صاحبزادے جسٹس سید محمود نے آخری وقت میں اپنے گھر سے نکال دیا تھا ان کی وفات بھی نواب اسماعیل خاں دتاولی کے ہاں ہوئی تھی (میر ولایت علی کی آپ بیتی صفحہ ۱۲۱) تلک الایام نداولہا بین الناس۔

اور اب ہمارے ایک بیوروکریٹ سفیر کا ذکر خیر۔'' پاکستان میں ہر سال مئی جون تک ان ناموں کا انتخاب ہوجاتا ہے جن کو چودہ اگست کو اعزازات دئے جاتے ہیں۔ ایک کمیٹی کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ سکرٹری کلچر عدنان سمیع کے والد تھے ان کا اصرار تھا کہ حسن کارکردگی کے لئے میں

عدنان کا نام تجویز کروں۔ ابھی ۱۹۹۵ میں عدنان نے باقاعدہ گانا بھی شروع نہیں کیا تھا بلکہ بچوں کے پروگرام میں گانا سکھاتا تھا میں نے التجا اًعرض کی کہ حضور عدنان کو ذرا میچوئر ہو جانے دیجئے آئندہ سالوں میں اس کا نام دیا جاسکتا ہے۔ بس میرا اتنا کہنا تھا کہ سیخ پا ہو گئے جب تک میں دفتر پہنچوں یہ احکامات پہنچ چکے تھے کہ مجھے ٹریننگ پر فوری طور پر کوئٹہ بھیجا جارہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ شہناز وزیر علی نے یہ آرڈرر کوا لئے تھے'' (صفحہ ۱۸۵)۔ اب انہی سفیر کبیر کا ذکر ہم سے بھی سنئے۔ ہز ایکسی لنسی ارشد سمیع خاں سویڈن میں پاکستان کے سفیر تھے۔ آپ نے سویڈن کی بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں سے بہت سا فنڈ اس نام سے اکٹھا کیا کہ پاکستان اور سویڈن میں کلچرل تعاون بڑھانے کے لیے ایک نمائندہ ثقافتی وفد بلایا جائے گا۔ یہ ۱۹۹۵ سے پہلے کی بات ہے۔ ہمیں بھی دعوت نامہ ملا بادشاہ سلامت کی ہمشیرہ شہزادی کرسٹینا مہمانِ خصوصی تھیں۔ جب پاکستان کا ثقافتی وفد سٹیج پر آیا تو اس میں صرف عدنان سمیع اور ان کے ساتھی تھے۔ ہم لوگ ہکا بکا رہ گئے کہ سفیر صاحب نے کس طرح رائیلٹی کی موجودگی میں پاکستان سے گھناؤنا مذاق کیا ہے۔ ایک ایک کر کے پاکستانی اس تقریب سے شرم کے مارے منہ چھپا کر واک آؤٹ کر گئے۔ سٹاک ہالم میں سفیر صاحب کی اس حرکت سے پاکستان کی بہت بدنامی ہوئی۔ اس لئے وہی صاحب سکرٹری کلچر ہو کر اپنے بیٹے کو پرائڈ آف پرفارمنس دلوانے کی کوشش نہ کرتے تو کیا کرتے؟

میں نے احمد بشیر کی خودنوشت ''دل بھٹکے گا'' کا جائزہ لیتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ ''احمد بشیر کے بے باک قلم نے دوستوں کی بیویوں تک کو اپنی بے رحم صاف گوئی سے مجروح کرنے میں باک محسوس نہیں کیا''۔ (نیا زمانہ لاہور ستمبر ۲۰۰۴)۔ احمد بشیر نے اس کے جواب میں لکھا تھا کہ ''یا اللہ خیر میں دوستوں کی بیویوں کو اپنی بہنیں سمجھتا ہوں اور اپنے ۵۸ سالہ کیریئر میں دوستوں کی بیویوں کے بارہ میں کچھ نہیں لکھا'' (نیا زمانہ لاہور اکتوبر ۲۰۰۴)۔ ہمیں اس بات کا تجسس تھا کہ کشور ناہید جو احمد بشیر کی صاف گوئی کا نشانہ بنی تھیں اس بارہ میں کیا کہتی ہیں۔ لکھتی ہیں ''زندگی نے کہا تم سب کا ذکر کر رہی ہو مگر احمد بشیر کے مضمون کے حوالے سے گریز کر رہی ہو اس نے تمہیں چھپن چھری کہا تھا اس نے مضمون میں ایسی واہیات باتیں کی تھیں کہ جلسے میں موجود خدیجہ مستور

رونے لگی تھیں۔ زندگی نے کچوکا دیا''۔۔۔ ''یہ سچ ہے احمد بشیر نے مجھے کئی دفعہ کہا تھا کہ تو میرا مضمون پڑھ لے جو چاہے کاٹ دے۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ اس قسم کی زبان استعمال کرے گا۔ ویسے میں نے اس کے لکھے ہوئے مضمون پڑھنے بھی نہیں تھے'' (صفحہ ۲۱۲)۔ ہمیں کشور ناہید کے حوصلہ کی داد دینی چاہیئے۔ اس کی اس بات نے اس کی عزت ہمارے دل میں دو چند کر دی ہے ایسی باتوں کو حوصلہ سے انگیز کر جانا ہر کسی کا کام نہیں ہوتا۔ ہر مردے و ہر کارے۔ احمد بشیر کی وفات پر کشور ناہید لاہور نہیں آئیں تو لوگوں نے لکھا تھا کہ کشور ناہید اپنی ''ناموجودگی'' کی وجہ سے نمایاں تھی۔

بڑے افسروں کے احوال میں لکھتی ہیں ''اب آئی بیگم کی باری۔ فون کیا کہ ایک گاڑی میرے لئے بھجوایئے مجھے فلاں فلاں پارٹیز میں جانا ہے'' (صفحہ ۱۹۱) یہ ایسی کون سی انہونی بات ہے؟ ایسا حادثہ کراچی میں بھی ہوا تھا جب ہمارا دارالحکومت کراچی میں تھا۔ ایک بیگم نے میاں سے کہا گاڑی بھجوایئے مجھے ضروری شاپنگ کے لئے جانا ہے۔ جواب ملا۔ گاڑی نہیں مل سکتی کیونکہ کسی اہم کام میں مصروف ہے رکشاء لے کر چلی جایئے۔ وہ خاتون رکشاء لے کر مارکیٹ پہنچیں تو ان کے میاں کی گاڑی سے کوئی اور خاتون اتر کر اتراتی ہوئی مارکیٹ میں چلی گئیں۔ بیگم صاحبہ نے بڑا فیل مچایا۔ اگلے روز رئیس امروہوی کا وہ مشہور عالم قطعہ جنگ میں چھپا جس کے پہلے تین مصرعے تو ہمیں مستحضر نہیں آخری مصرعہ یوں تھا۔ ''بیگمات آیند بہ رکشا داشتہ آید بہ کار''!

ہم عصروں کے لئے اس کتاب میں دلچسپی کا بہت سامان ہے امید ہے مستقبل والے بھی اس کے مندرجات سے لطف اٹھائیں گے۔ اے کاش ہمارے دوست یوسف کامران مرحوم کا ذکر اذکار ذرا زیادہ ہوتا۔ وہ جانِ بہار تو کشور کی جانب سے دو اچھے بولوں کو ترستا مر گیا۔

✓

یادوں کا سفر

مشہور براڈ کاسٹر اخلاق احمد دہلوی کو یادنگاری میں خاص کمال حاصل ہے۔ ان کی خود نوشت ''یادوں کا سفر'' کے عنوان سے روزنامہ مشرق میں کوئی سو قسطوں میں چھپی۔ جب یہ قسطیں کتاب کی صورت میں مرتب ہو کر مکتبہ عالیہ والوں کے سپرد ہوئیں اور طباعت میں جا بیجا تاخیر ہوتی گئی تو اخلاق صاحب کو گمان ہوا کہ مسودہ غالباً مکتبہ عالیہ کے جمیل النبی صاحب سے گم ہوگیا ہے اور وہ مروت میں اس کی گمشدگی کا اعتراف نہیں کرتے تو اخلاق صاحب نے اپنی زندگی کے بعض ایسے واقعات کو جو آپ نے لاہور کے رسالہ جلوہ میں کیسے کیسے لوگ کے عنوان سے حمید اختر کے اصرار پر لکھے تھے ایک نئی کتاب ''میرا بیان'' کے نام سے مرتب کر کے مکتبہ عالیہ والوں کے حوالے کر دئے اور کہا ''آرٹسٹ رشید کا بنایا ہوا اسکیچ ان آخری مضامین کے ساتھ چھاپ دیجئے''۔ اخلاق صاحب نے سکیچ دیکھا تو اپنے قلم سے اس پر لکھا ''اخلاق احمد دہلوی مرنے سے ذرا پہلے''۔ مکتبہ عالیہ کے جمیل النبی صاحب کا قول ہے کہ ''اخلاق صاحب کے آخری مضامین پر مشتمل ان کی آخری کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے''۔ (میرا بیان صفحہ ۶) آرٹسٹ رشید کے سکیچ کے نیچے اخلاق صاحب نے خواجہ میر درد کا شعر بھی اپنے قلم سے لکھا ہے ''روندے ہے نقشِ پا کی طرح خلق یاں مجھے۔ اے عمر رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے''۔ خود اخلاق صاحب نے اپنے ''پس و پیش'' میں لکھا ہے کہ ''اور پھر بیاں اپنا'' اور ''پھر وہی بیاں اپنا'' کے بعد اب ''میرا بیان'' آپ کو پڑھنے کے قابل معلوم ہوگی'' (صفحہ ۸)

''ماضی کی یادوں اور مستقبل کی امیدوں کے نام'' ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ''اور پھر بیاں اپنا'' ۱۹۵۷ میں چھپا تھا۔ دوسرا مجموعہ ''پھر وہی بیاں اپنا'' ۱۹۷۹ میں شائع ہوا۔ خدا کا شکر

ہے کہ اخلاق صاحب نے ''یادوں کا سفر'' کو اپنی زندگی میں چھپا ہوا دیکھ لیا۔ ''میرا بیان'' تو کہیں ۱۹۹۵ میں جا کر چھپی۔ اخلاق صاحب ۱۹ مارچ ۱۹۹۲ کو چپ چپاتے شہرِ خموشاں میں جا سوئے۔ بزرگ ادیب حمید اختر نے لکھا تھا ان کے جنازہ کے ساتھ صرف تین آدمی تھے۔ اور میں نے نوحہ کیا تھا ''بھرے شہر میں تین لوگ؟ ایسی بے حسی اور ناقدری پر تین حرف'' (پس نوشت اور پسِ پس نوشت صفحہ ۴۴۶)۔

اردو کا یہ عظیم یادداشت نگار دلی کا روڑا تھا۔ مستزاد کہ ان کی تربیت بہادر شاہ ظفر کی ایک پوتی کے ہاتھوں ہوئی۔ اخلاق صاحب کے بزرگ قلعہ کے متوسلین میں سے تھے اور شہزادیوں کو پڑھانے کا کام ان کے سپرد تھا۔ آشوبِ غدر میں بہادر شاہ ظفر کی یہ پوتی ان کے ساتھ دربدر ہوئیں اور امی جمی کے بعد یہ لوگ دہلی واپس آئے تو وہ بھی ان کے ساتھ ہی ان کے ہاں مدت العمر قیام پذیر رہیں۔ ان کی دادی کے والد کو فرنگیوں نے انہیں کو پناہ دینے کے جرم میں گولی سے اڑا دیا تھا۔ یہ شہزادی جو سو سے زیادہ عمر کی تھیں دہلی کے عالموں اور بزرگوں کے لئے کشش کا باعث تھیں اور لوگ ان کی باتیں سننے کو ان کے گھر میں جمع ہوتے تھے۔ مرزا اخلاق احمد نام کا بچہ اسی ماحول میں پلا بڑھا اور اس بزرگ شہزادی کی طرح برفی اور پراٹھوں پر پلا۔ سالن کا ذائقہ اس بچے نے بھی اپنی ''ددا'' کے مرنے کے بعد چکھا۔ اللہ آمین کے کھنورے میں پلنے والا مرزا اخلاق احمد دہلوی نامور براڈ کاسٹر بنا اور ''یادوں کا'' سفر اسی کی داستان ہے۔

اس داستان میں دہلی کے لوگ، دہلی کے بزرگ، دہلی کے ادیب اور شاعر، دہلی کے دکاندار، دہلی کے جوہری، دہلی کے حکماء حتیٰ کہ دہلی کے جیب کترے، چلتے پھرتے نظر آتے ہیں یہ اخلاق صاحب کے بچپن اور لڑکپن کی دہلی ہے۔ پھر بڑے ہوئے تو دہلی کے ریڈیو سے وابستہ ہوگئے اب آل انڈیا ریڈیو کے لوگ اور ریڈیو کا ماحول ان کا موضوع بن گیا۔ یادوں کا یہ سفر ریڈیو اور ریڈیو کے وابستگان کی آنکھوں دیکھی یا منہ بولی سرگزشت ہے اور ہر لحاظ سے مستند۔ اس وقت ریڈیو میں اپنے وقت کے سارے نابغے جمع ہو گئے تھے۔ کچھ بڑے شعرا اور ادیب فوج کے محکمہ سے وابستگی کے باعث دہلی میں مقیم تھے اس لئے اس دور کی دلی بڑی ادب پرور دلی تھی۔ ان تمام

باتوں کے سبب یادوں کا سفر بڑی دلچسپ اور من موہنی کتاب ہے۔

از بسکہ میں ''پھر وہی بیاں اپنا'' اور ''میرا بیان'' کا جائزہ پہلے لکھ چکا ہوں لیکن ان کی مرتب کردہ خودنوشت ''یادوں کا سفر'' اب آ کر مجھے میرے بزرگ دوست اور کرمفرما حمید اختر کی وساطت اور مہربانی سے دستیاب ہوئی ہے۔ یہ خودنوشت ۱۹۹۱ میں انہی کے دوست جمیل النبی نے مکتبہ عالیہ لاہور سے شائع کی تھی مگر مارکیٹ میں کہیں دستیاب نہیں تھی۔ حمید اختر صاحب نے اپنے کسی کالم میں ایک علم دوست استاد کا ذکر کیا کہ انہوں نے ''یادوں کا سفر'' کی فوٹو کاپی ان سے مانگی تھی۔ میں نے اس خبر کو غنیمت جانا اور حمید اختر صاحب سے اس کتاب کی فوٹو کاپی کی فرمائش کر دی۔ میں احسانمند ہوں کہ حمید اختر صاحب نے اپنی بیٹی عزیزہ ہما حامد کی وساطت سے میری خواہش پوری کر دی اور وہ از راہ کرم لاہور سے واپس آتے ہوئے میرے لئے ''یادوں کا سفر'' بھی لیتی آئیں۔ ہما بیٹی آپ کا بہت شکریہ!

میں کہ اخلاق صاحب کی یادنگاری کا بہت مداح ہوں مگر اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے کئی مقامات پر ٹھٹکا۔ پہلا مقام تو وہ تھا جہاں اخلاق صاحب نے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے ذکر میں یہ لکھا ہے کہ ''اختر حسین رائے پوری مولوی عبدالحق کے ایما پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے پیرس چلے گئے'' (یادوں کا سفر صفحہ ۲۰۸)۔ جن لوگوں نے حمیدہ اختر حسین کی خودنوشت ''ہم سفر'' پڑھ رکھی ہے وہ شاید اخلاق صاحب کی یہ بات باور نہ کریں۔ اختر حسین رائے پوری مولوی صاحب کی مرضی کے خلاف حیدرآباد سے دہلی آ گئے تھے۔ پھر وہ پی ایچ ڈی کے لئے پیرس چلے گئے تو ان کی غیر موجودگی میں وہ لغت شائع ہوئی جس پر اختر حسین رائے پوری نے دن رات محنت کی تھی جب وہ لغت اختر حسین رائے پوری کو پیرس میں ڈاک سے ملی تو ''اختر نے بڑی خوشی خوشی شوق کے ساتھ کھولی اور پیش لفظ پڑھنے لگے۔ میں بھی کرسی سے اٹھ کر ان کی پشت پر کھڑی ہو گئی اور پیش لفظ خود بھی جھک کر پڑھنے لگی۔ مولوی صاحب نے ہر اس شخص کا جس نے کسی بھی حیثیت سے کام کیا تھا بڑی فراخ دلی سے ذکر فرمایا تھا سوائے ایک اختر کے جس نے تن من لگا کر رات دن ایک کر کے ہر ہر لفظ کی چھان پھٹک کی تھی۔ میں نے دیکھا پہلے اختر نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بڑی مضبوطی سے ڈکشنری کو دونوں طرف سے دبا کر پکڑے رکھا۔ پھر جیسے

ان کے ہاتھ کانپ گئے گرفت ڈھیلی پڑی۔ اور ڈکشنری ان کے قدموں کے قریب جا گری۔ میں گھبرا کر سامنے کے رخ آ کھڑی ہوئی چہرہ زرد، ہونٹ بھینچے ہوئے، منہ سے ایک لفظ نہ بولے۔ مگر ان کے صدمے کی پوری کیفیت مجھ پر عیاں ہو رہی تھی۔'' (ہم سفر۔ حمیدہ اختر حسین صفحہ ۲۳۲)۔ اس شہادت کے ہوتے ہوئے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ اختر حسین رائے پوری مولوی صاحب کے ایما سے پی ایچ ڈی کرنے کے لئے گئے تھے۔ اور مولوی صاحب کے بارہ میں تو خود اخلاق احمد دہلوی نے لغت کبیر کے سلسلہ میں مولوی احتشام الدین حقی کی حق تلفی کا قصہ بھی بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان دونوں باتوں کے ہوتے ہوئے اخلاق صاحب کی بات پر کون یقین کرے گا؟

دوسری بات جس پر میں چونکا ہوں یہ ہے کہ ان کا کہنا ہے کہ ''گاندھی کے قتل کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کی جان جذباتی نہرو نے نہیں، سیاست دان پٹیل نے بچائی جس نے اپنی تقریر کے شروع ہی میں یہ کہا کہ یہ کام ایک ہندو ہتھیارے کا ہے''۔ (صفحہ ۲۹۴) اب تک جتنی بھی روایتیں ہم نے دیکھی سنی تھیں ان میں یہی کہا گیا تھا کہ نہرو نے یہ کہہ کر کہ گاندھی کا قاتل ہندو ہے مسلمانوں کے سر سے بہت بڑا خطرہ ٹال دیا۔ جوش صاحب نے تو اسی بات پر نہرو کو روح انسانیت کا سجدہ قبول کرنے کی درخواست کی تھی۔

خواجہ حسن نظامی صاحب کے باب میں ان کا کہنا ہے کہ ''داد و دہش کے باوجود کچھ لوگ ان دونوں بزرگوں (یعنی خواجہ صاحب اور جامع مسجد دہلی کے امام بخاری صاحب) کو انگریزوں کا پٹھو اور جاسوس جانتے تھے'' (صفحہ ۹۸) اب تو اس سلسلہ میں خواجہ حسن نظامی کے ایک عقیدت مند اور جناب اکبرالہ آبادی کی پوتی کے شوہر، جناب مشتاق احمد وجدی سابق کمپٹرولر اینڈ آڈیٹر جنرل پاکستان کی خودنوشت ''ہنگاموں میں زندگی'' چھپ چکی ہے اور اس کی گواہی یاد رکھنے کی ہے۔ ''حسن نظامی صاحب پہلی مرتبہ کراچی تشریف لائے تو فرمایا مجھے امریکن سفیر سے ملنا ہے اور مترجم کی ضرورت ہے تم ساتھ چلو۔ میں دفتر سے رخصت لے کر حاضر ہوا اس دن کی گفتگو سے مجھے تعجب بھی ہوا اور بہت سے خیالات بھی بدل گئے۔ مختصراً انہوں نے کہا کہ میں انگریزی سرکار کے لئے ہمیشہ ہندوستان میں پروپیگنڈا کرتا رہا اور سرکارِ برطانیہ کے لئے بہت اہم کام کئے ہیں آپ چاہیں تو میں امریکن گورنمنٹ کے لئے پاکستان یا ہندوستان میں پروپیگنڈے کے لئے

موجود ہوں۔ سفیر صاحب سنتے رہے اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس قسم کا کام میرے سپرد نہیں'' (ہنگاموں میں زندگی، صفحہ ۵۷)۔

اخلاق صاحب مہاجر بن کر لاہور پہنچے تو ایک بے درو دیوار سے مکان میں بسیرا کیا۔ لکھتے ہیں ''اچھرے اور رحمان پورے کے اس وسیع و عریض میدان میں جہاں اب وحدت کالونی بن چکی ہے ایک مندر تھا جس میں کسی جعلی پیر نے ڈیرہ جما رکھا تھا وہ لوگوں کو یہ جھانسا دے کر لوٹتا تھا کہ اس کے پاس جنت کی کنجی ہے اور جو خاندان اپنی سب سے پیاری اور سب سے معصوم بچی اس کے حوالے کر دے گا وہ اسے خط دے کر دوسری دنیا کو روانہ کر دیگا اور اس خط کی وجہ سے فرشتے موتی کے محل جنت میں اس لڑکی کے خاندان کے تمام افراد کے لئے الاٹ کرا دیں گے۔ الاٹ کا لفظ اس زمانے میں نیا نیا چلا تھا۔۔۔ کوئی اس جعلی پیر کی طرف میلی آنکھ سے اس لئے نہیں دیکھ سکتا تھا کہ نواب ممدوٹ اس نام نہاد پیر کے مرید تھے'' (صفحہ ۳۳۸)۔ معصوم بچوں بچیوں کو اگلے جہان بھیج کر موتی محل الاٹ کروانے کا کام تو آج بھی جاری ہے۔ وہ پیر تو خدا جانے بچیوں کو اگلے جہان کس طرح بھیجتا ہوگا آج کے پیر جسموں پر بارود باندھ کر معصوموں کو اگلے جہان بھیج کر موتی محل الاٹ کروا دیتے ہیں۔ طریقِ واردات بدل گیا ہے ورنہ پیر بھی ہزاروں ہیں اور ممدوٹ بھی ہزاروں جو ایسے پیروں کے مرید ہیں اور کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔

اس خودنوشت میں گدھوں کا ذکر بھی آیا ہے جو پڑھ رکھنے کا ہے۔ ''ایک دفعہ چوہدری سلطان ریڈیو پروگرام میں مویشیوں کے دام بتا رہے تھے۔ اتفاق سے زیڈ اے بخاری بھی کہیں سے ٹہلتے ٹہلتے سٹوڈیو میں پہنچ گئے۔ چوہدری سلطان اس وقت بتا رہے تھے کہ بیلوں کی جوڑی کے دام کیا ہیں بخاری صاحب سے نہیں رہا گیا انہوں نے بے ساختہ کہا ''اور گدھوں کی جوڑی کے''؟ چوہدری سلطان بولے ''بھیا اپنا جوڑی دار لے آؤ تو گدھوں کی جوڑی کے دام بھی بتا دئے جائیں گے''۔ (صفحہ ۲۰۰) اور دوسری بار کا ذکر مولانا حامد علی خاں کے گدھے کا ہے کسی لفظ کے تلفظ کی بحث تھی۔ حامد علی خاں دن بھر محمود نظامی کو اپنے بتائے ہوئے تلفظ کا قائل کرتے رہے۔ پھر رات کو نظامی صاحب کے گھر کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ نظامی صاحب نے دروازہ کھولا تو ''معلوم ہؤا حامد علی خاں ایک گدھا لئے کھڑے ہیں جس کے دونوں طرف ایسی کتابیں لدی ہیں جن میں ان الفاظ

کے وہ تلفظ ہیں جو اساتذہ نے مناسب جانے اور باندھے ہیں۔ ایک طرف اساتذہ کے دواوین اور دوسری طرف مستند لغات کی جلدیں ہیں'' (۲۲۱)۔

اخلاق صاحب کی یادوں پر مشتمل کم از کم تین چار کتابیں موجود ہیں۔ اگر ان کے قول کے مطابق ان کا ''حافظہ دروغ گو'' والا ہوتا تو یہ دروغ بیانیہ میں ضرور اپنے کرشمے دکھاتا مگر ایسا نہیں ہؤا۔ البتہ اتنا ضرور ہؤا ہے کہ بعض جگہ روایت میں اختلاف در آیا ہے۔ مثلاً حکیم اجمل خاں صاحب کے گھر دعوت میں مدعو ہوئے تو ان کی دادی اماں نے اندازہ لگایا کہ ''ہمارے بچے کو جو حکیم صاحب نے یاد کیا ہے تو ضرور وہ یہ دیکھنا چاہتے ہوں گے کہ بچہ اب کیسا ہے کیونکہ انہی دنوں میں میری خونی پیچش کا علاج حکیم صاحب نے کیا تھا'' (میرا بیان صفحہ ۷۷) مگر یادوں کا سفر میں یہ روایت یوں ہے کہ ''میری دادی یہ سمجھیں کہ بچے کو حکیم صاحب نے اس لئے شاید بلایا ہو کہ وہ جس بچے کو لہولہان دیکھ چکے ہیں اب اسے صحت یاب دیکھنا چاہتے ہوں'' (یادوں کا سفر صفحہ ۴۱)۔ ایسا اختلاف عین قدرتی ہے۔ اصل واقعہ تو حکیم صاحب کی دعوت کا تھا جس میں مہمانوں کے سامنے کھانے نہیں کھانوں کے کشتے پیش کئے گئے تھے۔

احوال الرجال کے سلسلہ میں جن لوگوں کا ذکر ہے ان میں مولانا جوہر مولانا شوکت علی آصف علی، ارونا آصف علی، مولوی عبدالسلام، خواجہ حسن نظامی، بیخود دہلوی، اشرف صبوحی اور ان کے برادر محترم وصی اشرف، کتب خانہ علم و ادب کے سب بیٹھنے اٹھنے والے اور ریڈیو اور اس کے متعلقین مذکور ہیں مگر جن اصحاب کے ذکر نے یادوں کا سفر کو دلچسپ بنا دیا ہے وہ ذکر ہے مولانا مودودی کے برادر بزرگ مولانا ابوالخیر مودودی اور ان کی والدہ محترمہ کا۔ ہجرت کے بعد لاہور میں اخلاق صاحب ایک ڈھنڈار ویران مکان میں اترے۔ مولانا ابوالخیر مودودی اور ان کی والدہ محترمہ کسی بات پر ناراض ہو کر مولانا ابوالاعلیٰ کے گھر سے نکل آئے اور ان کے سامنے کے میدان میں ایک درخت کے نیچے ڈیرا لگا لیا اور پھر اخلاق صاحب کے مکان کے ساتھ بنے ہوئے گیراج میں قیام کی اجازت دینے کی درخواست کی۔ اخلاق صاحب نے انہیں اپنے گھر میں جگہ دی اور یہ دونوں خانہ ان اس خانہء ویران کو آباد کر کے بیٹھے رہے۔ ابوالخیر مودودی پہلی بار ان سے ملنے آئے تو ''پیروں میں کھڑاویں، چہرے پر سونے کے فریم کی عینک، گھر کے دھلے ہوئے کپڑے، مگر صاف ستھرے گو بغیر

استری کے، کلین شیو، دبلے پتلے نازک سے کوئی چالیس پینتالیس کا سن اور کلائی میں سونے کے چین کی گھڑی، تھی۔ ابوالخیر صاحب نہایت مہذب اور شائستہ انسان تھے میں نے کبھی انہیں اونچی آواز سے بولتے یا کسی پر خفا ہوتے نہیں دیکھا۔ عام لوگوں سے بڑی انکساری اور نیازمندی سے ملتے لیکن صاحبِ ثروت حضرات کے روبرو ان میں بلا کی رعونت قیامت کا غرور آجاتا۔" سبط حسن کا کہنا ہے" بہت مدت کے بعد حیدرآباد کے اس بانکے کو لاہور میں دیکھا سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے چہرے کی آب وتاب زائل ہو چکی تھی اور افکار کی لکیریں ابھر آئی تھیں مگر اسی خندہ پیشانی سے ملے نہ زمانے کا شکوہ نہ احباب کا گلہ وہی پرانی شانِ استغنا وہی بے نیازی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے" (صفحہ ۴۰۶) یہ بھی معمول تھا کہ" روزانہ ہر کھانے اور ناشتے کے وقت توشہ لگ کر ابوالاعلیٰ صاحب کے گھر سے آتا اور واپس کر دیا جاتا۔ اور کمال یہ تھا کہ ان کے بچوں کی آنکھ تک میں بھی میل تک نہ آتا۔"" ابوالاعلیٰ کہیں زیادہ تکلف پان کھانے میں فرماتے تھے وہ مشک وعنبر میں بسے ہوئے پانوں میں کتھے کا کشتہ چھالیہ کا کشتہ اور موتی کا چونا کھاتے تھے خالص مروارید سچے موتیوں کا کشتہ اصل کیلشیم۔

ایک طرف یہ حال تھا اور دوسری جانب ابوالخیر صاحب امرودوں کے پتوں پر معمولی کتھا چونا لگا کر زعفران کا تمبا کو استعمال کرتے تھے"۔ (صفحہ ۴۰۸)۔" ابوالخیر اور ابوالاعلیٰ کی والدہ حکیم اجمل خان کے خاندان سے تھیں"۔" جب (۵۳ کے مارشل لاء میں مولانا مودودی کو سزائے موت سنائی گئی تو) ان کے ایک (ابوجہل صفت) بھانجے نے بہت خوش ہو کر یہ خبر انہیں سنائی کہ خالہ اماں منے کو سزائے موت ہوگئی۔ جاء الحق وزہق الباطل ان الباطل کان زہوقا۔ اس وقت وہ میری بیوی کے ساتھ کھانا کھا رہی تھیں انہوں نے اس جانکاہ خبر پر نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے فرمایا اللہ کا ملل ہے اللہ جس طرح چاہے لے لے ہم اور تم کون" اور جب موصوف یہ خبر سنا کر تشریف لے گئے تب انہوں نے کھانے سے منہ موڑا اور سربسجدہ ہوئیں اور اپنے سخت دل بھانجے کی یہ آرزو پوری نہ ہونے دی کہ اس خبر سے نوالہ چھوٹتا" "اس مٹی کی بنی ہوئی خواتین اب دور دور نصیب نہیں" (صفحہ ۴۱۶)۔

غرض یادوں کا سفر دلی کی چٹخارے دار زبان اور دلی کے دل موہ لینے والے لوگوں کے بیان کی وجہ سے یادداشتی ادب میں نمایاں اور منفرد سمجھی جائے گی۔

✓

کچھ دیر پہلے نیند سے

ادبی مجلّہ اوراق کے نائب مدیر جناب سجاد نقوی کی خودنوشت "کچھ دیر پہلے نیند سے" العصر پبلی کیشنز لاہور کی جانب سے مارچ ۲۰۰۹ میں شائع ہوئی ہے۔ سجاد نقوی نے اپنی زندگی کا آغاز پرائمری سکول ٹیچر کی حیثیت سے کیا۔ پھر کلرکی کی چکی میں پسے۔ ڈپلوما ان لائبریری سائنس حاصل کرنے کے بعد لائبریرین اور پھر ایم اے کرنے کے بعد لیکچرار بنے اور اسی حیثیت میں وظیفہ یاب ہوئے۔ صحیح معنیٰ میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ اپنا مستقبل بنانے کی دھن میں بہت صعوبتیں اٹھائیں اللہ نے انہیں سرخرو کیا اور اب سعادت منداور پڑھی لکھی اولاد و اخلاف کے سائے میں زندگی کی شام کے مزے لے رہے ہیں۔ یہ داستان ایک حوصلہ منداور اولوالعزم شخص کی داستان ہے۔

"کچھ دیر پہلے نیند سے" یادوں کی مکمل بازیافت کے عیب سے مملو خودنوشت ہے جس میں چھوٹی چھوٹی غیر اہم تفصیلات قدم قدم پر قاری کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ سجاد صاحب کو تو کتابوں سے پیشہ ورانہ تعلق خاطر کے علاوہ ادیبانہ شغف بھی رہا ہے اس لئے توقع تھی کہ آپ نے اس باب میں خودنوشت کے فن کا مطالعہ ضرور کیا ہو گا کم از کم وزیر آغا کی خودنوشت "شام کی منڈیر سے" تو ضرور بالاستیعاب دیکھی ہو گی مگر معلوم دیتا ہے نقوی صاحب زندگی کی جزئیات میں اتنے منہمک رہے کہ انہیں اس جانب توجہ کرنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ اتنی تفصیل کہ یہ تک مذکور ہے کہ فلاں موقعہ پر کس عزیز نے کس قسم کا کھانا پکایا تھا یا فلاں موقعہ پر بازار سے انہوں نے کیا خریدا تھا اور کیوں خریدا تھا' فلاں سفر کس بس میں ہوا تھا اور کیوں؟ ایسی تفصیلات سے ان کے مستقبل کے قاری کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟

نقوی صاحب کے برادر بزرگ غلام الثقلین نقوی اردو کے جانے پہچانے افسانہ نگار تھے اور ان کی اپنی ادبی حیثیت مسلم تھی۔ سجاد نے برادرِ بزرگ کی بزرگی کا لحاظ بھی رکھا ہے مگر ان کی ادبی فتوحات کو اپنی خودنوشت کا اہم حصہ بنالیا اور ان کے ہر افسانے ہر کتاب ہر سفرنامے کا ذکر کرنا لابدی سمجھا۔ یہ تو غلام الثقلین نقوی صاحب کے دیباچہ نما مضمون ''برادرخرد'' سے ہی عیاں تھا کہ وہ برادرِ بزرگ کے ''فین'' ہیں مگر اس حد تک فین ہو جانا قاری کو کھلنے لگتا ہے۔ نقوی صاحب نے غلام الثقلین نقوی کے افسانوں کے ذکر کے شوق میں اوراق کے افسانہ نمبر کا ذکر دوبار کردیا ہے پہلے صفحہ ۱۳۱ پر اور پھر صفحہ ۱۴۵ پر۔ ہاں بجا طور پر اپنے والد گرامی کا ذکر پورے احترام سے کیا ہے اور شاہ جی کے ایک دوست کے ملفوظات میں یہ بات بھی درج کردی ہے کہ ''سید گورا ہو یا کالا' امیر ہو یا غریب' اچھا ہو یا برا ہم امتیوں کے لئے سید ذات کے لئے احترام واجب ہے'' (صفحہ ۸۶) سجاد نقوی صاحب اس فلسفے سے پوری طرح متفق ہیں حالانکہ سید ذات کے لئے احترام کا یہ فلسفہ قرآن کے بنیادی فلسفہ سے متصادم ہے **و جعلنکم شعوباً و قبائل لتعارفوا. ان اکرمکم عند الله اتقکم** کہ ہم نے تمہیں قبیلوں گروہوں میں بنایا کہ تم پہچانے جاؤ۔ تم میں سے بزرگ وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

غیر ضروری تفصیلات کے ضمن میں ہی برادر گرامی انور سدید کی کامرانیاں ان کی خودنوشت کا حصہ ہیں'' ۱۹۶۴ کا سال انور سدید صاحب کی کامرانیوں کا سال تھا۔ اس میں انہوں نے اے ایم آئی ای (انجینیئر نگ) کا امتحان پاس کیا اور ساتھ ہی ایم اے اردو کا امتحان دیا اس میں وہ یونیورسٹی بھر میں اول درجہ اول قرار دئے گئے انور سدید اس امتحان میں پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے شریک ہوئے امجد اسلام امجد نے اورئینٹل کالج کے طالب علم کی حیثیت سے ایم اے اردو کا امتحان دیا تھا۔ کالج والے انہیں اول لانا چاہتے تھے مگر انور سدید نے ریکارڈ نمبر لئے اس لئے اورئینٹل کالج اور امجد اسلام امجد اس اعزاز سے محروم رہے۔ انور سدید صاحب کو پنجاب یونیورسٹی اور مولوی عبدالحق کے گولڈ میڈل ملے'' (صفحہ ۹۰)۔ ہمیں امجد اسلام امجد سے کوئی تعلق نہیں ہے نہ ہمیں انور سدید کے تبحر علمی میں کوئی کلام ہے مگر سجاد نقوی صاحب نے میری مادر علمی اورئینٹل کالج پر راہ چلتے خوامخواہ کیچڑ اچھال دیا ہے اورئینٹل کالج کیوں کسی طالب علم کو اول لانا چاہے

گا یا دوسرے کو نیچا دکھانا چاہیگا؟ ایسی باتیں نقوی صاحب ایسے پڑھے لکھے آدمی سے سرزد ہوتی اچھی نہیں لگتیں آپ تو خود ایک پوسٹ گریجوایٹ ادارہ گورنمنٹ کالج سرگودھا سے وابستہ رہے ہیں کیا انہیں ایسی کوئی بات وہاں دکھائی دی تھی؟۔ ادارے اپنے طلبا کو علمی لحاظ سے تیار کرتے ہیں ان کے ریکارڈ کو دوسروں کو نیچا دکھانے کے لئے استعمال نہیں کرتے۔ ہم نے تو جناب انور سدید کا یہ بیان سنا ہؤا تھا کہ امجد اسلام امجد ایک پرچہ میں فیل ہوتے ہوتے بچے تھے اس پر مشفق خواجہ نے پھبتی کہی تھی کہ کہیں ''وہ پرچہ شاعری یا ڈرامہ کا تو نہیں تھا؟''۔ (بزرگی بہ سالگرہ۔ خامہ بگوش کے قلم سے۔ صفحہ ۱۱۳)۔ حاصل کلام یہ کہ انور سدید صاحب کے اس کارنامہء علمی کا سجاد نقوی صاحب کی سرگزشت سے کیا جوڑ ہے؟ اسی طرح نقوی صاحب اپنے حالات کے ضمن میں سیاسی اکابر کی موت کی تاریخیں بھی ساتھ کے ساتھ ریکارڈ کرتے جاتے ہیں۔ انور سدید صاحب کی کامرانیوں کے ذکر کا آخری فقرہ یوں ہے'' ۱۹۶۴ میں خواجہ ناظم الدین وفات پاگئے'' (صفحہ ۹۰) اس سے قبل ۱۹۵۶ میں ظفر علی خان کی وفات کی خبر ریکارڈ کی (صفحہ ۴۷) اور ۱۹۵۱ میں چوہدری رحمت علی کی وفات کی۔ (صفحہ ۳۲) ایسی باتوں سے تسلسلِ بیان میں جو روک پیدا ہوتی ہے نقوی صاحب کا دھیان اس طرف نہیں گیا وہ کچھ دیر پہلے نیند سے نیند کے منتظر رہے اور جو یاد آیا لکھتے چلے گئے۔ انہی وجوہات سے یادوں کی مکمل بازیافت والی خودنوشتیں فنی لحاظ سے سقیم سمجھی جاتی ہیں۔

سجاد نقوی صاحب کا اوراق جیسے رسالہ کے ساتھ وابستہ ہونے اور سرگودھے جیسے مردم خیز شہر میں رہنے کی وجہ سے بہت اہم ادبی شخصیتوں سے قریب رہے۔ مولانا صلاح الدین احمد کے سرگودھا آنے کی روداد۔ آغا محمد باقر نبیرہء آزاد کا سرگودھے آنا یا مولانا کے ساتھ عبدالشکور صاحب جیسے ادیب کا آنا یہ سب کچھ سرگودھے کے لئے برکت کا موجب ہؤا اور نقوی صاحب نے ان تقریبات کی روداد مناسب ادبی اختصار کے ساتھ ریکارڈ کردی ہے جس کے لئے تاریخ ادب ان کی احسان مند رہے گی۔ اسی طرح سرگودھا اکادمی یا دوسرے علمی اداروں کی سرگرمیاں ریکارڈ کرنا بھی انہی کو سزاوار تھا اور ان کی خودنوشت میں اجنبی نہیں لگتا۔ سرگودھے کے علمی اور ادبی رسالوں کا ذکر بھی انہی کو واجب تھا۔

انہیں بہت سے اہل علم پرنسپلوں ڈاکٹر عابد احمد علی، خان عبدالعلی خان، غلام جیلانی اصغر،

پروفیسر رفیع اللہ خان اور پروفیسر عبدالرسول کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا علم کے ایسے نابغوں کا ذکر اس سرگزشت میں کم کم ہے اور سرگودھے کے علمی ماحول سے شناسائی رکھنے والوں کو تشنگی کا احساس دلاتا ہے۔ اے کاش نقوی صاحب احوال الرجال کے باب میں زیادہ فراخ دلی دکھاتے۔ لوگ ان صاحب علم لوگوں کے بارہ میں زیادہ جاننا چاہتے ہیں۔

نقوی صاحب کے بارہ میں میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ وہ سرسری طور پر حاصل کی ہوئی معلومات پر بہت انحصار کرتے ہیں۔ جیون خان کے باب میں یہ لکھنا کہ وہ ریاضی کے استاد تھے (صفحہ ۱۹۰) بالبداہت غلط ہے ان کی جیون دھارا تو ان کی نظر سے ضرور گذری ہوگی اس میں مذکور ہے کہ موصوف کا مضمون پولیٹیکل سائنس تھا۔ اسی طرح ظفر چوہدری صاحب کے والد گرامی کا نام بشیر احمد تھا آپ نے انہیں جسٹس بشیر احمد (صفحہ ۳۰۷) بنا دیا حالانکہ وہ ہائی کورٹ کے جج کے مرتبہ پر فائز نہیں ہوئے۔ محض سب جج کے طور ریٹائر ہوئے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ نقوی صاحب سنی سنائی بات کو ذہن میں جگہ دینے کے قائل ہیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ خودنوشت اس لحاظ سے نہایت قابل قدر سرگزشت ہے کہ مصنف کو اپنے مقام کے بارہ میں کوئی غلط فہمی ہے نہ اس نے اپنے کئے ہوئے ادبی خدمت کے کاموں پر کبھی تفاخر کیا ہے اور اس دور میں جب ادبی بونے بھی اپنے قد و قامت کے باب میں غلط فہمیوں یا خوش فہمیوں شکار ہو جانا مستحب جانتے ہیں یہ سرگزشت بڑی قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ ان کا یہ اعتراف بہتوں کے لئے چشم کشا ہونا چاہئیے کہ ''میں نے بہت کم لکھا ہے ایک تو زندگی بھر اعزازی طور پر کبھی پس پردہ اور کبھی ظاہراً مختلف ادبی پرچوں سے منسلک رہا ہوں اس لئے اگر مجھ میں لکھنے کی کوئی صلاحیت تھی تو وہ بھی دوسروں کے مضامین پڑھنے اور ان کے پروف دیکھنے میں صرف ہوگئی۔ نئی کتابوں پر تبصرے بھی لکھے تو ان سے بھی بطور ادیب نام و نمود کی کوئی خواہش نہیں تھی'' (صفحہ ۲۰۶)۔ ہم سجاد نقوی کو اس فراخدلانہ اعتراف پر مبارکباد دیتے ہیں یہی اعتراف انہیں اردو کے عظیم ادبی جرائد کے عظیم مدیروں کی صف میں جگہ دے گا اور ان کی خود نوشت ان کی مومنانہ کسر نفسی کی گواہی دیتی رہے گی۔

✓

ایک ادھوری سرگزشت

''ایک ادھوری سرگزشت'' محترم انیس ناگی کے اوائل عمر کی سرگزشت ہے جو ان کے عملی زندگی میں داخل ہونے سے قبل کی ہے اور ان کے بچپن، نوعمری اور اوائل شباب کے واقعات کو محیط ہے۔ وہ خود سمجھتے ہیں کہ یہ سرگزشت اس لئے ادھوری ہے کہ اس میں میری زندگی کے ابتدائی پندرہ برسوں کا نقش ہے اور سرگزشت اس لمحے ختم ہو جاتی ہے جب میں بیس برس کا تھا'' (دیباچہ) والد کی وفات پر ان کی زندگی کا نیا باب شروع ہوتا ہے اسی لئے انیس ناگی نے باپ کی موت پر یہ محسوس کیا تھا کہ شاید یہ واقعہ ان کے آزاد ہونے کا پیش خیمہ ثابت ہو مگر ایسا نہیں ہوا۔ ''ان کے ابا پر حد سے زیادہ خودسری اور ایمان داری کا جنون طاری تھا'' (صفحہ ۱۲۴) اور اس رویہ نے انہیں ''سفاک باپ'' بنا دیا تھا (صفحہ ۱۴)۔

چھٹی دہائی کے ادبی تناظر میں انیس ناگی اور افتخار جالب کو اینگری ینگ مین سمجھا جاتا تھا کیونکہ دونوں نئی لسانی تشکیلات کے سلسلہ میں سرگرم تھے۔ اور جانتے تھے کہ ''بکھرے ہوئے حرفوں کے پیچھے معانی کا ایک جہان مخفی ہے اور انسان کی ساری زندگی ان حرفوں کو جوڑتے گذر جاتی ہے'' (صفحہ ۱۳۴) حلقہء ارباب ذوق میں ان کی منہ زور تنقیدیں لاہور کے ادبی حلقوں کا موضوع سخن رہیں اور پھر ادبی حلقوں میں متنازعہ۔ اب باون کتابوں کا مصنف ہونے اور ادب کی صحرانوردی کے بعد انیس ناگی کی خودنوشت آئی ہے تو وہ بھی ادھوری سرگزشت ہے کیونکہ ''میں ایک ناکام ادیب ہوں مجھے یہ بھی اچھی طرح احساس ہے کہ میں نے ادب کے آدرش کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کی تھی وہ بھی رائیگاں گئی ہے'' (صفحہ ۷) ان کا اپنا تجزیہ یہ ہے کہ ''میں

اندر سے کافی بزدل ہوں'' (صفحہ ۸۵) اور میں ''سپاٹ لکیر تھا جسے کوئی کھینچ کر لمبا کرتا جا رہا تھا'' (صفحہ ۴۷) بے اختیاری سی بے اختیاری۔ چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا والی بے اختیاری۔ لسانی تشکیلات کا سلسلہ شعر، افسانہ، اور دیگر اصناف ادب میں کچھ عرصہ تک خاصا ہنگامہ خیز رہا اور اب انیس ناگی کے اپنے لفظوں میں ''ایسے حوصلہ شکن حالات میں ادب کی بات کرنا یا ادب کی تخلیق کے لئے اصرار کرنا ایک طرح کے پاگل پن سے کم نہیں۔۔۔ اس احساس شکست کے باوجود میرے نزدیک لکھنا اور پڑھنا ایک عبادت ہے یہ زندگی کی اعلیٰ ترین حقیقتوں اور صداقتوں کی تلاش ہے میں اپنے آپ کو اس تلاش اور اس کی لذت سے محروم رکھنا چاہتا ہوں (صفحہ ۷)۔

ہماری بدقسمتی کہ ہم نے انیس ناگی کی باون کتابوں میں سے صرف ایک کتاب پڑھی ہے اور وہ بھی ان کی ادھوری سرگزشت ہے۔ اس لئے ہم ان کی ادبی حیثیت پر محاکمہ کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ تاہم مشفق خواجہ نے انیس ناگی کے کام پر جو توجہ دی ہے وہ ہماری نگاہ سے گذرتی رہی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ رائے متعصّبانہ ہو مگر خود انیس ناگی کی خودنوشت ان کی ''شکست کی کہانی'' (صفحہ ۹) یا ''زوال کی کہانی'' (صفحہ ۱۰) ہے۔ ۱۹۹۵ میں چھپی ہوئی یہ خودنوشت بھی ہمیں کم و بیش پندرہ برس بعد ملی ہے۔ اس بات کو سوائے ہماری محرومی کے اور کس بات کا نام دیا جاسکتا ہے۔

انیس ناگی اورئینٹل کالج میں ہم سے ایک سال پیچھے تھے مگر کالج کے طالب علم نہیں تھے گورنمنٹ کالج کے طالب علم کی حیثیت سے اورئینٹل کالج میں حصول علم کے لئے تشریف لاتے تھے۔ اس وقت بھی ہم نے انہیں ایک اداس اور تنہا فرد پایا۔ ان کی ساری ادبی سرگرمیوں کا محور بھی اورئینٹل کالج نہیں تھا۔ اپنے کالج کی مجلس اقبال میں بہت سرگرم رہے ہونگے جبھی تو ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سے بے تکلفی سے کہہ سکتے تھے کہ ''حفیظ جالندھری نے اگلے جمعرات مجلس میں نظم پڑھنی ہے اجازت ہو تو اسے اڑا دیں'' (صفحہ ۱۷۳)۔ بعد کی زندگی میں بھی کبھی ہمارا آمنا سامنا نہیں ہوا مگر ان کی ادبی معرکہ آرائیاں تو ہم تک پہنچتی رہیں۔ اس سرگزشت سے انیس ناگی کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ ایک حد سے زیادہ مایوس انسان کی ہے۔ ہمیں علم نہیں کہ ان کی بعد کی زندگی کے کوائف کیا ہیں ازدواج کا کیا سلسلہ ہے؟ ہوا یا نہیں؟ مگر بہ حیثیت ایک ادیب ان کی سرگزشت

پڑھ کر بہت دکھ ہوا ہے اور ایسا دکھ جس پر صرف ہمدردی ہی کی جاسکتی ہے۔

انیس ناگی کی اس کتاب میں اپنے اساتذہ پر ان کے اچٹتے ہوئے فقروں نے ہمیں بہت ملول کیا۔ استاد استاد ہوتا ہے۔ سوائے قاضی اسلم صاحب (صفحہ ۱۵۹) اور ڈاکٹر نذیر احمد (صفحہ ۱۷۳) کے کوئی اور ان کے قلم سے نہیں بچا۔ قیوم نظر (صفحہ ۱۷۵) صفدر میر (صفحہ ۱۷۷) جیلانی کامران (صفحہ ۱۵۴) جی ایم اثر سب ان کے تیر قلم سے چھلنی ہوئے ہیں۔ جی ایم اثر ہمارے بھی استاد تھے اور ہم نے جن اساتذہ سے کچھ سیکھا ہے ان میں ان کا اسم گرامی ایک روشن ستارہ کی مانند روشن ہے مگر انیس ناگی ''جی ایم اثر ایک کردار تھے بہار کے رہنے والے تھے، دبلے پتلے گندمی رنگ سبز آنکھیں خوش پوش ہر طرح کی عورت اور شراب کے رسیا اردو اور انگریزی نستعلیق طریق سے بولتے تھے۔۔۔ انہوں نے ایک متمول عورت سے شادی کرلی تھی وہ مرد مار قسم کی عورت تھی اور اثر صاحب چڑا نما شخص تھے'' (صفحہ ۱۷۵)۔ اگر اپنے اساتذہ کو متعارف کروانے کا یہی انداز ان کے نزدیک واجب تھا تو انیس ناگی نے اپنے بارہ میں جو نتائج اخذ کئے ہیں ان پر کسی دوسرے کو ایک حرف تک ایزاد کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے والد گرامی کا نام ابراہیم تھا، انیس ناگی کا یہ کہنا درست ہے کہ وہ کتاب کے بیان کردہ ''حالات میں اسماعیل کیسے بن سکتا تھا؟'' (صفحہ ۴)۔ مکتب ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکا اور فیضان نظر انہیں نصیب نہیں ہوا۔

✓

ایسا بھی ہوتا ہے

''ایسا بھی ہوتا ہے'' جناب سیف الدین بوہرہ کی ''آپ بیتی سفر نامہ سیاست اور حقائق'' پر مشتمل کتاب ہے جو شاد پبلیکیشنز کوئٹہ کی جانب سے ۲۰۰۵ میں چھپ کر منظر عام پر آئی۔ بلوچستان سے تعلق رکھنے والی یہ پہلی آپ بیتی تھی جو میری نظر سے گذری مگر پڑھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ جناب سیف الدین نے ہر اس چھپی ہوئی چیز کو جو ان کی نگاہ سے گذری اور انہیں دلچسپ معلوم دی اس کتاب کا حصہ بنالیا اور اس طرح یہ ''آپ بیتی'' طویل تر ہوتی چلی گئی۔ تقریباً پونے پانچ سو صفحات کی یہ کتاب اِن کے ''فلسفہ'' کے بوجھ تلے دبی ہوئی سرگزشت ہے اور انہیں فلسفہ کے مطالعہ اور غور و خوض کا بہت شوق ہے۔ ان کے اپنے قول کے مطابق ''کتاب لکھنے کی وجہ ماضی کا اذیت ناک سیاسی دور اور پنجاب کی بالادستی تینوں صوبوں کی غلامی اور احساس محرومی ہے''

(تعارف) کتاب کے مطالعہ سے ان کی کسی گہری سیاسی بصیرت کا سراغ نہیں ملتا۔ البتہ ایک عام سیاسی کارکن کی حیثیت سے وہ بلوچستان کی سیاست میں سرگرم ضرور رہے ہیں۔ کتاب میں جو حوالے درج ہیں وہ اقتباسات کے نہیں پورے پورے شذروں کے حوالے ہیں۔ لندن گئے ہیں تو انگریزوں کے بارہ میں لکھی ہوئی کتاب کا پور حوالہ درج کر دیا ہے اور وہ بھی خود اخذ کردہ نہیں کسی انگریز کی کتاب سے کسی دوسرے کا ترجمہ شدہ ہے۔ یہی حال ترکی افغانستان ایران کا ہے۔ مشرقی پاکستان کے احوال میں صدیق سالک کے ہمہ یاراں دوزخ کا بڑا حصہ درج ہے۔

یہ کتاب ایک عام سیاسی کارکن کے ذوق مطالعہ کی روداد ہے اور اس لحاظ سے بھی قابل قدر ہے کہ ہمارے سب سے بڑے مگر غریب اور محروم صوبہ کے کسی لکھنے والے کے قلم سے نکلی ہے اور کوئٹہ ہی سے چھپی ہے۔

✓

زندگانی کی گذرگاہوں میں

ملک نصر اللہ خاں عزیز کا نام ہمارے دینی صحافتی حلقوں کا مشہور نام ہے۔ بی اے کرنے کے بعد آپ نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز منڈی بہاؤالدین کے رسالہ صوفی کی ادارت سے کیا۔ پھر ''مدینہ'' بجنور میں چلے گئے۔ لاہور آ کر زمیندار سے وابستہ رہے۔ خود بھی مختلف اخبارات نکالے مگر ۱۹۴۱ میں جماعت اسلامی سے وابستہ ہونے کے بعد روزنامہ تسنیم نکالا اور ۱۹۵۴ میں ایشیا رسالہ کی ادارت سنبھالی۔ ملک صاحب صحافتی حلقوں میں اپنے نظریات کی پختگی اور اپنے مسلک سے وابستگی کی وجہ سے ہمیشہ ممتاز رہے اور سیاسی اختلافات کے باوجود جس بات کو سچ سمجھتے اس کا اظہار کرتے رہے۔ ابتدا میں کانگریسی رہے پھر جماعت اسلامی سے وابستہ ہو گئے۔ مولانا ابو الکلام کے معتقد رہے ان کے ساتھ رنجِ اسیری بھی کھینچا۔ یہ خودنوشت مختلف اقساط و اوقات میں لکھی گئی اور تسنیم میں چھپنے کے بعد ان کی وفات کے بعد یکجا طور پر ''زندگانی کی گذرگاہوں میں'' کے عنوان سے لاہور سے ستمبر ۱۹۹۴ میں شائع ہوئی۔ اس خودنوشت کا اسلوب بھی جناب عبدالکریم عابد کی خودنوشت ''سفر آدھی صدی کا'' کی طرح مقالاتی اسلوب ہے یعنی اس انداز سے شذرے لکھتے جاتے ہیں کہ ان کی زندگی کے حالات کے ساتھ ساتھ ان کے نظریات تعصّبات پسند ناپسند سب کچھ عیاں ہوتا چلا جائے۔

ان کی وفات پر مولانا مودودی نے اپنے بیان میں کہا تھا ''بلاشبہ میں کہہ سکتا ہوں کہ سیدنا ابوبکرؓ صدیق کو جس طرح ایک لمحہ کے لئے بھی اسلام قبول کرنے میں تامل نہ ہوا تھا اسی طرح مرحوم کو جماعت اسلامی کے نصب العین کو قبول کرنے میں ذرا برابر بھی تردد نہ ہوا'' (زندگانی کی

گذرگاہوں میں صفحہ ۱۱) ملک نصر اللہ خاں عزیز اپنے مشن سے عمر بھر خلوص دل سے وابستہ رہے۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے۔

ملک نصر اللہ خاں دینی مزاج کے آدمی تھے اور دین سے وابستگی انہیں ورثہ میں ملی تھی۔ ابوالکلام آزاد سے وابستگی بھی دین کی وجہ سے تھی اور بعد کو جماعت اسلامی سے وابستگی بھی دین کے حوالے سے ہوئی مگر انہیں احساس ہے کہ دونوں کے ''سفر اسلام'' میں واضح تفاوت تھا۔ ''مولانا ابوالکلام الحاد زندقہ اور اعتقادی و عملی گمراہیوں کے بعد منزل حق پر پہنچے۔ اور مولانا مودودی نے کتاب اللہ وسنت رسول کی طرف توجہ کی اور اسلام کے مجموعی نظام کو سمجھنے اور معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ''سفر'' کے اس اختلاف کی وجہ سے دونوں کے مطالعہ ومشاہدہ اسلام میں بھی فرق واضح ہوگیا'' (صفحہ ۱۰۹)۔ مولانا آزاد کے بارہ میں عام طور سے کہا جاتا تھا کہ وہ تارک نماز تھے ملک صاحب نے ان کی اقتداء میں نمازیں پڑھنے کا ذکر کیا ہے مگر یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ''جہاں تک اس معروف دینداری کا تعلق ہے جو ہمارے بزرگوں میں پائی جاتی ہے مولانا ابوالکلام آزاد اس کے عادی نہیں تھے'' (صفحہ ۴۲) بھارتی مصنف متھائی نے تو مولانا کی ''مے شبانہ'' کو ان کی شخصیت کا حصہ قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

جسٹس کیانی نے برطانوی یونیورسٹیوں کے طلبا کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہہ دیا کہ'' ایک ایماندار تاجر جو نماز روزے کا پابند نہیں مگر پورا تولتا اور ناپتا ہے اس نمازی اور روزے دار حاجی تاجر سے بہتر ہے جو عبادت تو بڑے اہتمام سے کرتا ہے مگر تجارت میں ناپ تول میں گڑبڑ کرتا ہے'' اس پر ملک صاحب نے دینی غیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ تصریح فرمائی ہے کہ ''عبادات میں اللہ کی اطاعت نہ کرنے کی وجہ سے جو خامی اس کے اندر پیدا ہوئی ہے اس کی تلافی تجارت میں ایمانداری سے نہیں ہوسکتی'' (صفحہ ۲۲۴)۔

ملک صاحب لمبے عرصہ تک کانگریس سے وابستہ رہے۔ کانگریسی مسلمان نماز کے لئے اجلاس ملتوی کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ ایک بار مولانا ظفر علی خاں نے نماز کے لئے اجلاس ملتوی کروانا چاہا تو منہ کی کھائی۔ ملک صاحب نماز کے اس ''سیاسی استعمال'' پر جز بز ہوئے۔ اور مولانا ظفر علی خاں سے باقاعدہ ان کا مناظرہ ہوا۔ ''ظفر علی خاں بولے آپ نے لکھا ہے کہ

کانگریس ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی نمائندہ ہے میں نے کہا اس میں کیا شک ہے فرمایا وہ مسلمانوں کی نمائندہ نہیں ہوسکتی میں نے پوچھا کیوں؟ کہنے لگے وہ مسلمانوں کی نمائندہ کیسے ہوسکتی ہے وہ تو مسلمانوں کو نماز نہیں پڑھنے دیتی۔ اس پر میں نے کہا مولانا وہ نماز پڑھنے سے کب روکتی ہے بولے وہ نماز کے لئے اجلاس ملتوی نہیں کرتی۔ میں نے کہا دفتر زمیندار کا بھی تو یہی حال ہے یہ بھی اوقات نماز میں بند نہیں ہوتا۔ جس کا جی چاہتا ہے جاکر خود پڑھ آتا ہے اور دفتر کا کام بدستور جاری رہتا ہے۔ مولانا نے میرے اس اعتراض پر برجستہ جواب دیا کہ اگر دفتر زمیندار بند نہیں ہوتا تو یہ ہماری غلطی ہے مگر ہمارا مطالبہ تو برحق ہے''۔ (صفحہ ۲۳۴)۔

بااین ہمہ انہیں احساس ہے کہ مسلمان رہنماؤں کی جاسوسی کرنے والے بعض لوگ ایسے بھی تھے جو مولویانہ وضع قطع بنالیتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ایک ایسے ہی داڑھی والے جاسوس کا ذکر کیا ہے کہ'' وہ وضع قطع کے مولوی نہیں تھے بلکہ فی الحقیقت مولوی تھے ان کی داڑھی محض جاسوسی کا ایک پردہ فریب نہیں تھی بلکہ ان کی وضع قطع کا ایک حصہ تھی۔ یہ صاحب بریلی کے رہنے والے تھے اب میں ان کا نام نہیں لینا چاہتا وہ دوسری دنیا کو جاچکے ہیں اور پاکستان بننے سے پہلے وہ اپنی خصوصی خدمات ترک بھی کرچکے تھے۔ انہوں نے علیگڑھ سے بی اے کیا پھر دیوبند میں باقاعدہ تعلیم بھی حاصل کی اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے حلقہ ارادت میں داخل ہوگئے اور ان کی خصوصی عنایات کا مورد بن گئے میں نے ان کو پاکستان بننے کے بعد دو ایک مرتبہ سڑکوں پر جاتے دیکھا تھا پھر ان کی وفات ہی کی خبر سنی'' (صفحہ ۲۳۹)۔ اس جاسوس داڑھی پر مولانا ظفر علی خاں نے بڑے مزے کی نظم کہی تھی وہ بھی محترم ملک صاحب نے چٹان کے حوالہ سے درج فرمائی ہے۔

افسانہء دیں کیا ہے افسونِ حرم کیا ہے
عیبوں کے چھپانے کو داڑھی مری کم کیا ہے
داڑھی ہے تو غم کیا ہے
پھنس جاتی ہے اک دنیا اس دامِ ریائی میں
اور میرے تقدس کے چرچے ہیں خدائی میں
داڑھی ہے تو غم کیا ہے

اس پردہ میں چھپ چھپ کر کرتا ہوں میں جاسوسی
دیتا ہے صلہ مجھ کو انگریز ہو یا روسی
داڑھی ہے تو غم کیا ہے

از بسکہ مرے منہ پر یہ لمبی سی داڑھی ہے
سی آئی ڈی والوں سے چھنتی مری گاڑھی ہے
داڑھی ہے تو غم کیا ہے

اس کو جو منڈا ڈالوں کھل جائے بھرم میرا
جب تک یہ سلامت ہے کب رتبہ ہے کم میرا
داڑھی ہے تو غم کیا ہے

اے ہم نفسو ! سمجھے میرا یہ اشارہ بھی
راضی ہیں مسلماں بھی اور خوش ہیں نصاریٰ بھی
داڑھی ہے تو غم کیا ہے

ملک نصر اللہ خاں عزیز نے استفسار فرمایا ہے کہ معاصر نے یہ نہیں بتایا کہ اس نظم کی شان نزول کیا ہے؟'' (صفحہ ۲۳۸)۔ پھر آپ نے اس جاسوس مولوی کا قصہ بیان فرمایا ہے مگر اس نظم کی معنویت آج کے ماحول میں تو اس وقت سے کہیں زیادہ ہے۔ اب تو ایک سے ایک داڑھی والا' داڑھی کی آڑ میں وطن عزیز ہی کو مٹانے پر تلا بیٹھا ہے۔ خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں۔ کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری۔

اور اب تکفیر کے فتاویٰ کی حقیقت بھی انہی کے قلم حقیقت رقم سے سنیئے۔ لکھتے ہیں ''میرے ایک محترم استاد جو نہ صرف ایک بہت بڑے فاضل عربی اور علومِ اسلامی کے عالم تھے بلکہ اپنے جذبہء اسلامی میں بھی ایک سنگ میل اور حریت فکر و رائے میں شمشیر برہنہ تھے اور جن کے قدموں میں بیٹھ کر حریت اسلامی کے سینکڑوں ہی جام چڑھائے تھے ان کے دستخط بھی ایک فتویٰ پر ثبت تھے۔۔۔۔ میں ایک روز مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس حیرت انگیز طرز عمل کی وجہ پوچھی۔ میں نے کہا مولانا! مجھے دوسرے علمائے کرام اور پیران عظام سے بحث نہیں مگر آپ

کے دستخط دیکھ کر تو میں سکتے میں آ گیا۔ آخر آپ نے کیوں دستخط کر دئے؟ مولانا نے اپنے انداز خاص میں اسی مشفقانہ طرزِ خطاب سے جو وہ اپنے ان شاگردوں کے متعلق استعمال کرتے تھے جن سے ان کو دلی محبت ہوتی تھی فرمایا'' بچہ عزیزی تو بھی یہ کہتا ہے حالانکہ تو میرے خیالات سے خوب واقف ہے۔ میں نے عرض کیا قبلہ اسی واقفیت کی بنا پر تو مجھے تعجب ہوا۔۔۔۔۔ فرمایا فلاں صاحب میرے پاس آئے اور ایک استفتاء ساتھ لائے تھے کہ میں اس پر دستخط کر دوں۔ میں نے ان کے سامنے صاف انکار کیا۔۔۔ مگر انہوں نے جواب دیا کہ ہمیں سر مائیکل ایڈوائر لفٹننٹ گورنر نے بھیجا ہے آپ یہی بات ان کے سامنے چل کر فرما دیجئے۔ تانگہ باہر سڑک پر کھڑا ہے۔ یہ کہہ کر مولانا نے فرمایا'' بچہ عزیزی تو ہی بتا کہ پھر میں کیا کرتا'' (صفحہ ۲۴۵)۔

مولانا نصر اللہ خاں عزیز پہلی بار مولانا مودودی سے ملاقی ہوئے تو وہ ''بڑا باریک اور نفیس لباس پہنے ہوئے تھے اور میں نے دل میں کہا اللہ اکبر! یہ حضرت حکومت الہیہ قائم کریں گے؟ ایسے پر تکلف اور راحت پسند شخص کا اس منزل صعب و دشوار میں کیا کام'' (صفحہ ۸۹) غالباً اسی تاثر کی تردید کے لئے مرتب نے جناب فضل معبود کا مضمون جس میں مولانا مودودی کے گھر میں گڑ کی چائے پکنے کا تذکرہ بڑی تفصیل سے ہے شامل کر دیا ہے (صفحہ ۱۹) مولانا کی نفاست طبع کی گواہی تو ایک دلی والے واقف حال نے بھی دی ہے جن کے گھر میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی والدہ محترمہ لاہور میں قیام فرما تھیں جو اپنے بیٹے کے گھر سے بوجوہ نکل کر ان کے ہاں آ گئی تھیں اور پھر مدت العمر واپس نہیں گئیں ''ابوالاعلیٰ کہیں زیادہ تکلف پان کھانے میں فرماتے تھے وہ مشک و عنبر میں بسے ہوئے پانوں میں کتھے کا کشتہ چھالیہ کا کشتہ اور موتی کا چونا کھاتے تھے خاص مروارید سچے موتیوں کا کشتہ۔ اصل کیلشیم'' (یادوں کا سفر از جناب اخلاق احمد دہلوی (صفحہ ۴۰۸) اگرچہ ذاتی عادات کا مولانا کے مشن سے کوئی تعلق نہیں مگر لوگ اپنے بزرگوں سے ایسی باتیں منسوب کر کے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟۔ ایک اور صاحب کمال سالارپوری صاحب نے مولانا نصر اللہ خاں عزیز کے بارہ میں مضمون لکھتے ہوئے جماعت احمدیہ سے تائب ہونے والے کسی پولیس افسر کی کمال کی حکایت گھڑی ہے جو بقول ان کے ''صحابی تھے اور صحابیت کی پنشن پاتے تھے۔'' (صفحہ ۳۱) بے پر

کی اڑانا اسی کو کہتے ہیں۔ کیا کسی سے بیعت ہو جانا قابلِ پنشن ملازمت ہے؟ صالحیت اگر قابل پنشن ملازمت ہو تو ہم کہہ نہیں سکتے احمدیت کے باب میں ہم نے پہلی بار ایسی بات سنی ہے۔

درحیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید؟

مولانا کو اس بات پر بہت اعتراض ہے کہ ''پنجاب میں کمیونسٹ پارٹی زوروں پر تھی۔ اور ہندو مسلمان اور سکھ کمیونسٹ دیہات میں جلسے اور اجتماعات کر رہے تھے جہاں مرد عورتیں جوان اور ''جوانیاں'' کمیونسٹ اور کمیونسٹیاں'' خیموں اور چھولداریوں میں پرالی کے فرش پر اکٹھے اٹھتے بیٹھتے اور سوتے تھے اور اکٹھے اور اکیلے گھومتے تھے'' (صفحہ ۳۱۰) مگر مولانا یہ بات بھول گئے کہ خود ان کے کانگریسی والنٹیرز اسی روش پر قائم تھے اور لڑکے لڑکیاں مل کر سوراج کا کام کر رہے تھے۔ جوش صاحب نے کانگریس کی ایک ایسی ہی کانفرنس کا ذکر کیا ہے اور ایک والنٹیر لڑکی کے ساتھ معاشقہ لڑانے پر فخر بھی کیا ہے۔ مولانا کو کانگریس میں یہ قباحت کیوں نظر نہ آئی؟ تمہاری زلف میں آئی تو حسن کہلائی۔ وہ تیرگی جو مرے نامہ سیاہ میں ہے۔

مولانا کا تعلق جماعت اسلامی کی صحافت سے تھا اس لئے لامحالہ جماعت احمدیہ کی صحافت کا ذکر ناگزیر تھا۔ ہمیں تو اپنے مرحوم دوست روشن دین تنویر کا ذکر پڑھ کر خوشی ہوئی کہ ان کا ذکر کرتے ہوئے یہ جملہ حق بھی مولانا کے قلم سے نکل گیا کہ ''دین کا کام کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کو دنیا میں عملاً برپا کیا جائے نہ یہ کہ مسلمانوں کے ایمان و اسلام ہی کا انکار کر کے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا دائرہ تنگ کر دیا جائے یہ دین کی خدمت نہیں دین کو نقصان پہنچانا ہے'' (صفحہ ۱۳۵)۔ امید ہے مولانا نصر اللہ خاں عزیز کے اخلاف اس مسلک کی روشنی میں اپنے اس بزرگ کی پیروی کریں گے اور ان لوگوں سے متنبہ رہیں گے جو دوسروں کو اسلام کے دائرہ سے خارج کر کر کے اسلام کا دائرہ تنگ تر کرتے جا رہے ہیں۔ نکل جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے مستی میں۔ فقیہہِ مصلحت بیں سے وہ رند بادہ خوار اچھا۔

بلاکم وکاست

جناب مہدی علی صدیقی کی خودنوشت ''بلاکم وکاست'' کے عنوان سے شعبہ تصنیف و تالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی نے جنوری ۲۰۰۲ میں شائع کی ہے۔ جناب مہدی علی صدیقی حیدر آباد سول سروس کے آدمی تھے ہجرت کے بعد پاکستان میں مختلف انتظامی اور عدالتی عہدوں پر فائز رہے۔ وظیفہ یابی کے بعد اپنے بچوں کے پاس امریکہ میں آ گئے اور یہ خودنوشت یہیں مرتب ہوئی۔ جناب مہدی علی صدیقی نے خودنوشت بانوے برس کی عمر میں لکھی ہے اور ان کی یادداشت حیران کن حد تک صاف اور واضح ہے اور بلاکم وکاست کا عنوان بھی حسب حال لگتا ہے کہ صدیقی صاحب کو ہر بات پوری جزئیات کے ساتھ یاد ہے۔ خصوصاً علی گڑھ اور اس کے متعلقات پڑھنے والوں کے لئے بھی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔

برطانوی ہند کی ریاستوں میں سے حیدر آباد صرف ایک ریاست نہیں تھی ایک پورا تہذیبی رویہ تھا۔ از بسکہ اس مملکت آصفیہ میں آدھے سے زیادہ غیر مسلم لوگ آباد تھے مگر اس مملکت کا اجتماعی مزاج مغلیہ تہذیب کا آئینہ دار تھا مہاراجہ سر کشن پرشاد کے دربار کو تو مغلیہ دربار کا ثنیٰ سمجھا جاتا تھا۔ جہاں غیر مسلم رؤسا و امراء کا یہ مزاج ہو وہاں حکمران کے دربار کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ مگر شخصی حکومتوں میں جو انانیت راہ پا جاتی ہے وہ بھی حیدر آباد کے مزاج سے عیاں تھی۔ ایک سے زیادہ خودنوشتوں میں حیدر آباد کے تمدن کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

جناب مہدی علی صدیقی کے والد گرامی نامی گرامی وکیل تھے پھر سیشن جج مقرر ہوئے اور وظیفہ یابی تک اسی عہدے پر کام کرتے رہے۔ مہدی علی اسی ماحول میں پیدا ہوئے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی اور پھر حیدر آباد سول سروس میں چنے گئے۔ آپ ایک حد تک ''ملکی'' تھے اس لئے

ان کے ہاں عام عوام کے ساتھ میل جول کی دلچسپ تفصیلات ملتی ہیں۔ جناب مہدی علی نے نظام حیدر آباد کے مزاج کو سمجھنے کے لئے پاکستان میں حیدر آباد کے سابق ایجنٹ جنرل نواب مشتاق احمد خاں کی خودنوشت کے حوالہ سے نظام کے اورنگ زیب عالمگیر کے مزار پر سلام کے لئے حاضر ہونے کی روداد لکھی ہے۔ یہ روداد ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں مگر نظام کو سمجھنے کے لئے اسے دہرا رہے ہیں۔ بلا کم وکاست کے صفحہ تین پر نواب مشتاق احمد خاں کی روایت درج ہے مگر ہم ان کی وساطت سے حوالہ درج کرنے کی بجائے نواب مشتاق احمد خاں کا حوالہ درج کرتے ہیں۔

''اعلیٰ حضرت نظام کی تشریف آوری پر جو منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ مسلمانوں کی گذری ہوئی شان وشوکت کا دل ہلا دینے والا منظر تھا۔ میر عثمان علی خاں اپنے عمائدین سلطنت اور درباریوں کے ساتھ پورے درباری لباس میں تشریف لائے اور احاطہ کے دروازے پر رک گئے۔ ایک شاہی چوبدار نے جو مغلیہ دربار کا مخصوص لباس پہنے ہوئے تھا اورنگ زیب کی پائنتی کھڑا ہوا تھا (اس نے) بآواز بلند شاہی القاب پڑھنے شروع کئے ''محی الملت والدین اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ وغیرہ'' شاہی القاب ختم ہونے کے بعد جس انداز سے اس نے صاحب مزار سے نظام کی حاضری کی اجازت طلب کی وہ ہمارے لئے حیرت کا باعث تھی۔ اس نے یہ نہیں کہا والیء دکن سلام کے لئے حاضر ہے بلکہ یہ کہا ''عثمان علی خاں صوبہ دار دکن سلام کے لئے حاضر ہے''۔ ان الفاظ کو سن کر نظام ذرا سے توقف کے بعد درباریوں سمیت جلوس کی شکل میں آگے بڑھے جب مزار کے قریب پہنچے تو حیدر آبادی طریق سے جھک کر تسلیمات بجالائے اس کے بعد فاتحہ پڑھی پھر صدر دروازہ سے الٹے پاؤں واپس ہوئے'' (کاروان حیات۔ خودنوشت نواب مشتاق احمد خاں۔ صفحہ ۱۷)۔ یہ روداد ہماری کتاب ''پس نوشت اور پسِ پس نوشت'' کے صفحہ ۲۴۵ پر بھی درج ہے۔

جناب مہدی علی صدیقی کی طبیعت کو سمجھنے کے لئے ان کے والد کے کسی دوست کا یہ قول قول فیصل کا حکم رکھتا ہے کہ ''بچے کی روح بوڑھی ہوگئی ہے'' (بلا کم وکاست صفحہ ۹) اس کی وجہ یہ تھی ان کی والدہ اپنی علالت کے باعث ان سے دور مقیم تھیں اور ان کا زیادہ وقت اپنے والد گرامی کی صحبت میں گذرتا تھا پھر والدہ کا انتقال ہوگیا تو ''بڑھاپے'' کے قرائن اور بڑھ گئے۔ ان کی شخصیت

میں غور وخوض اور تدبر کے آثار بچپن ہی سے نظر آنے لگتے ہیں۔ اگر ان کی تعلیم حیدر آباد سے دور علی گڑھ میں نہ ہوتی تو یہ سنجیدگی ان کی راہ کی رکاوٹ بن جاتی۔ دینداری تو ان کے ورثہ میں ملی حالانکہ ان کے والد نماز فجر اکثر قضا کرتے تھے۔ خود ان اپنی عمر بھی دینداری میں بسر ہوئی مگر مولویانہ پن ان میں نہیں۔ پہلے دانشور ہیں جنہیں میں نے بھٹو صاحب کے دینی کارنامے یعنی احمدیوں کو دائرہ ءاسلام سے خارج کرنے کے فیصلہ کی فراست کو چیلنج کرتے دیکھا ہے۔ ''یہ سچ ہے کہ پاکستان کی دستوری اسمبلی میں قادیانیوں کے خلاف قرارداد پاس ہونے سے پیپلز پارٹی کی حکومت کو اسلام دوستی کا تمغہ تو مل گیا مگر اسلام کو کیا فائدہ پہنچا'' (صفحہ ۲۴۹)۔ عجیب بات ہے انہی دنوں جناب نصر اللہ خاں عزیز کی خودنوشت ''زندگانی کی گذرگاہوں میں'' بھی میرے زیر مطالعہ آئی ہے آپ نے بھی اس فیصلہ کے جواز کو معرض سوال میں لا کھڑا کیا ہے کہ ''دین کا کام کرنے کا مطلب یہ ہے اسلام کو عملاً دنیا میں برپا کیا جائے نہ یہ کہ مسلمانوں کے ایمان واسلام کا انکار کر کے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا دائرہ تنگ کر دیا جائے۔ یہ دین کی خدمت نہیں دین کو نقصان پہنچانا ہے'' (زندگانی کی گذرگاہوں میں صفحہ ۱۳۵)

حیدر آباد میں مجسٹریٹ تھے تو مسلم لیگ کے لئے گیارہ سو روپے چندہ حاصل کرنے کے لئے ایک بے قاعدگی کے مرتکب ہوئے آپ نے اس کا اعتراف کیا ہے ''جہاں تک یاد پڑتا ہے اسی ایک سرکاری بے ضابطگی کا مجھ سے ارتکاب ہوا اور یوں تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے کتنے گناہوں کا بوجھ میرے سر ہے'' (صفحہ ۸۸) ایسے خدا ترس لوگ ہماری انتظامیہ میں بہت ہوتے تو ہماری انتظامیہ کا یہ حال تو نہ ہوتا۔

ادب کے ساتھ ان کا تعلق عجیب ہے پشاور میں ٹریفک مجسٹریٹ تھے تو ن۔م۔ راشد اور احمد فراز ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی میں ان کے سامنے پیش کئے گئے۔ آپ نے انہیں مناسب تنبیہہ کے بعد چھوڑ دیا۔ (صفحہ ۱۴۷) مگر ادب سے یہ تعلق زندگی بھر ان کے ساتھ رہا۔ منٹو کے افسانے ''اوپر نیچے درمیان'' پر فحاشی کا مقدمہ بھی آپ ہی نے سنا اور منٹو کو پچیس روپے جرمانہ کی سزا دی۔ اس مقدمہ کی تفصیل منٹو نے بھی لکھی اور خود آپ نے اپنی خودنوشت میں (صفحہ ۱۶۳) پر درج کی ہے اور کتاب کے ضمیمہ میں شامل ہے بقول شخصے صدیقی صاحب کا ادب سے ادیبانہ

نہیں عدالتی تعلق رہا ہے۔ یوں تو اپنے دوستوں میں آپ نے مولانا ماہر القادری صاحب اور کراچی کے دوسرے ادبا شعرا کے ساتھ اپنے تعلقات کا ذکر کیا ہے مگر وہ ذکر محض تفریح طبع تک محدود ہے۔ خود شعر بھی کہے اور کلام کا معمولی سا چھینٹا کتاب کے آخر میں موجود ہے۔

اس خودنوشت کا مجموعی مزاج ایک خداترس منتظم کا ہے جو غلط بات کو غلط کہنے کا حوصلہ رکھتا ہے۔ ''بعض لوگوں کا خیال ہے (کشمیر کی) یہ جنگ اس کی ابتدائی منصوبہ بندی ابتدأ سب ان سول افسروں اور فوجیوں کی کارروائی تھی جو قادیانی تھے اور کشمیر میں اس مقام کی بازیابی کے خواہاں تھے جہاں بقول ان کے حضرت عیسیٰ دفن ہیں۔ مگر یہ کوئی قابل یقین بات معلوم نہیں ہوتی یہ بات ضرور کہی جاتی ہے مگر کوئی نہیں جانتا کہ اگر حضرت عیسیٰ کے مفروضہ مدفن پر قبضہ مقصود تھا تو اس سے کسی کو یا خود قادیانیوں کو کیا فائدہ پہنچتا؟'' (صفحہ ۲۱۰)۔

ایک واقعاتی غلطی بھی صدیقی صاحب سے سرزد ہوئی ہے۔ لکھتے ہیں لیاقت علی خاں کو'' کابینہ کے اندر ہی اپنے خلاف رجحان بلکہ ایک حد تک سازش کا اندازہ ہو چلا تھا۔ سننے میں تو یہ بھی آتا تھا کہ ظفر اللہ خاں کے خلاف بوجہ قادیانیت یہ عام خیال ہو گیا تھا کہ وہ اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کاونسل میں پاکستان کا مقدمہ ایک اچھے وکیل اور مقرر کی طرح پیش کر رہے ہیں مگر جوش اور جذبے کی کمی اور ان کے مقابل ہندوستان کے نمائندے وی کے کرشنا مینن کے اداکارانہ انداز اور اشک ریزی اور بعض وقت بیہوش ہو کر گرنے کی ترکیب اراکین کونسل کو زیادہ متاثر کر رہی ہیں''۔ (صفحہ ۱۷۲)۔ صدیقی صاحب بھول گئے کہ لیاقت علی خاں کے زمانہ میں سلامتی کونسل میں انڈیا کے نمائندے کرشنا مینن نہیں تھے۔ وہ تو صدر ایوب کے زمانہ میں یعنی ۱۹۶۲ یا ۱۹۶۳ میں سیکیورٹی کاؤنسل میں مقرر ہوئے جب صدر ایوب نے ظفر اللہ خاں کو عالمی عدالت انصاف سے پہلی بار فارغ ہونے کے بعد سلامتی کاؤنسل میں پاکستان کا مستقل مندوب مقرر کیا۔ کرشنا مینن کی بوالعجبیاں اس زمانہ کی ہیں۔ باقی سب کچھ تاریخ کا حصہ ہے۔

یہ خودنوشت اتنے باریک حروف میں چھپی ہے کہ عام آدمی کے لئے پڑھنا دشوار ہے۔ خدا جانے کراچی یونیورسٹی والوں پر ایسی باریک کتابت کا جنون کیوں سوار تھا؟

بلبلیں نواب کی

ہندوستان کی انڈین ایڈمنسٹریٹو سروس آئی اے ایس (یعنی پاکستان کی سی ایس پی سروس) کے ایک مسلمان افسر جناب موسیٰ رضا نے ''جو بیوروکریسی کے اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز رہے (اور) ہندوستانی گجرات کے مختلف اضلاع میں ڈپٹی کمشنر سے لے کر مرکزی حکومت کے سکرٹری تک رہے'' اپنی یادداشتیں لکھی ہیں مگر انہیں واقعاتی مضامین کی صورت میں قلمبند کیا ہے۔ جناب موسیٰ رضا نے یہ یادداشتیں کس زبان میں لکھی ہیں اس کا ذکر نہیں مگر ہمارے ہی ایک بیوروکریٹ شاہ محی الحق فاروقی نے جو حکومت پاکستان کے ریٹائرڈ جوائنٹ سکرٹری ہیں ان واقعاتی مضامین کا اردو ترجمہ کیا ہے جو فضلی سنز کراچی نے ''بلبلیں نواب کی'' کے عنوان سے ۱۹۹۸ میں پہلی بار شائع کیا ہے'' بلبلیں نواب کی'' ان کے ایک مضمون کا عنوان ہے جس میں آپ نے ایک بگڑے ہوئے نواب کی لڑنے والی بلبلوں کا ذکر کیا ہے۔ آپ اس نواب کے علاقہ میں اپنی ابتدائی سروس میں متعین رہے اور اس نواب کی مہمان داری سے متمتع ہوتے رہے۔

انڈین سول سروس کی بنیاد پر ہندوستان اور پاکستان نے جو انتظامی سروس قائم کی اس کا ڈھانچہ پرانی آئی سی ایس پر قائم تھا اور اس سروس کے لوگ اپنے آپ کو خدا کے بعد سب سے زیادہ مقتدر سمجھتے تھے۔ ہمارے ہاں ابتدائی دور کے آئی سی ایس افراد میں سے قدرت اللہ شہاب نے شہاب نامہ' الطاف گوہر نے گوہر گزشت' ہاشم رضا نے ہماری منزل کے عنوان سے اپنی خود نوشتیں لکھی ہیں جو ان کے آئی سی ایس والے رعونت بھرے دبدبہ کی آئینہ دار ہیں۔ ان کے بعد ہمارے سی ایس پی افسروں نے جن میں جناب منصور کاظم' جناب جیون خاں نے بھی اپنی خود

نوشتیں قلمبند کیں مگر ان میں کوئی رعونت یا فرعونیت نہیں بلکہ فروتنی اور خاکساری ہے۔ یہ افسران ساٹھ کے لگ بھگ کے زمانہ میں سول سروس میں آئے۔ جناب موسیٰ رضا کا زمانہ بھی کم وبیش یہی زمانہ ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ساٹھ کی دہائی کے بعد ہمارے انتظامی عہدوں پر مامور ہونے والے افسروں کے سر سے آئی سی ایس کا خمار بہت حد تک اتر چکا تھا۔ موسیٰ رضا صاحب کی سرگزشت کا لہجہ نہایت منکسرانہ اور اندازِ حکومت نہایت انسانی اور غریب پروری کا ہے۔

ان کی ان واقعاتی کہانیاں میں کچھ مافوق الفطرتی عناصر کا عمل دخل بھی ہے اور یہ شاید ہمارے افسروں کی سائیکی کا حصہ ہے۔ شہاب صاحب کی کنک کی کوٹھی والا واقعہ' جیون خاں کا مشرقی پاکستان کے ایک سب ڈویژن میں اپنے گھر کے ایک حصہ میں ''ان'' کے قیام کی دہشت' اور اب موسی رضا صاحب کا ایک تین دن پہلے کے مرے ہوئے انگریز میجر کو بلی کے ساتھ بلئیرڈ کھیلنے کا واقعہ (صفحہ۱۲) یا مندر کے بھوت کا ذکر (صفحہ ۱۳۶)۔ یہ سب چیزیں نا قابل تشریح ہیں مگر ہمارے جنوبی ایشیا کے سول افسران ان واقعات کو بیان کرنے میں اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ موسیٰ رضا صاحب نے تو اپنی والدہ محترمہ اور اپنی بیوی کی مافوق الفطرت عناصر کو بھانپ لینے کی تیز حسی کا بہت چرچا کیا ہے۔

جناب موسیٰ رضا نے اپنے تربیتی عرصہ کے دوران ایسے افسر کے ساتھ کام کیا ہے ''جس کے فیصلے وکیل لکھا کرتے تھے'' (بلبلیں نواب کی صفحہ ۳۰) ہمارے ہاں جیون خاں نے جیون دھارا میں ایک ایسی ہی شکایت کی تحقیقات کا ذکر کیا ہے جس میں فیصلے عدالت میں نہیں وکلا کے چیمبرز میں لکھے جاتے تھے (جیون دھارا صفحہ ۱۲۵)۔ ایسے افسران شاید جنوبی ایشیا کے ساتھ مختص ہیں۔ مگر ان کی یہ باتیں قابل تقلید ہیں کہ انتظامی معاملات میں کبھی قانون کا ناجائز استعمال نہیں کیا خود قانون کی خلاف ورزی نہیں کی۔ چیتے کا شکار کرنے گئے مگر شیر زد پر آ گیا محض اس لئے گولی نہیں چلائی کہ حکومتی پالیسی کی رو سے شیر حکومت کی حفاظت میں تھا اور اس کی نسل معدوم ہو رہی تھی (صفحہ ۹۷)۔

اس کتاب میں ہمیں جو کام کی باتیں ملیں ان میں حکومت کے وزرا اور گورنرز کی سادگی کا

رویہ تھا۔ گورنر ایک آشرم کے دورے پر آئے تو ان کے ماتحت عہدیدار تو اپنے طمطراق والے سرکٹ ہاؤسز میں ٹھہرے مگر گورنر اور ان کی بیگم نے ایسے آشرم میں دوراتیں قیام کیا جہاں غسل خانہ تک کی سہولتیں بھی موجود نہیں تھیں۔ (صفحہ ۵۴) اے کاش ہمارے گورنرز بھی ایسی ہی سادگی کا مظاہرہ کر سکیں۔

سورت شہر سیلاب کی زد میں آ گیا تو ہمہ تن عوام کی بھلائی کے کاموں میں مصروف ہو گئے اور بنک پانی میں ڈوب گئے اور مرکزی حکومت ان کی امداد کے لئے کرنسی نہ بھجوا سکی تو آپ نے اپنے رسک پر اسی لاکھ روپے کے کرنسی نوٹ چھپوا لئے تاکہ عوام کھانے پینے کی ضروریات کا سامان خرید سکیں۔ خدشہ صرف یہ تھا کہ کہیں سیلاب گذر جانے کے بعد جب اصلی کرنسی آ جائے گی تو لوگ اسی لاکھ سے زیادہ مالیت کے نوٹ تبدیل کرنے کے لئے نہ لے آئیں مگر لوگوں نے بھی اپنے حاکم کی لاج رکھی اور کسی نے ایسا لالچ نہ کیا۔ ہمارے ہاں کتنے ایسے دردمند افسر ہیں جو اتنا بڑا رسک لے سکیں؟

غرض یہ خودنوشت سبق آموز اور دلچسپ واقعات سے مملو سرگزشت ہے۔

فضائیہ میں گذرے ماہ وسال

پاک فضائیہ کے سابق چیف آف سٹاف ایئر مارشل ریٹائرڈ ظفر احمد چوہدری نے ''فضائیہ میں گذرے ماہ وسال'' کے عنوان سے اپنی زندگی کے ان برسوں کی روداد لکھی ہے جو فضائیہ میں بسر ہوئے۔ اگر چہ یہ روداد ان کی ساری زندگی کو محیط نہیں مگر اس میں ان کی شخصیت ان کی پسند ناپسند ان کے دوستوں ان کے بزرگوں کا ذکر خیر موجود ہے اور ان کے جاننے والوں کے لئے تو یہ کتاب اور ان کی انگریزی کی کتاب Mosaic of Memory مل کر ان کی مکمل خود نوشت بن جاتی ہیں۔ ظفر چوہدری دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں رائیل انڈین ایئر فورس میں چنے گئے اور پاکستان کے قیام پر پاکستان کی فضائیہ میں شامل ہوئے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں فضائیہ میں شامل ہوئے اور اپنی جوانی اس عظیم سروس کی خدمت مین صرف کر دی۔ صحراست کہ دریا ست تہ بال و پر ماست۔

ظفر چوہدری سے ہمارا تعارف اس وقت ہوا جب وہ سرگودھا میں ایئر کموڈور کی حیثیت سے بیس کمانڈر تھے پھر ہم نے اس دوست کو اس وقت بھی دیکھا جب وہ فضائیہ کے چیف آف سٹاف کی حیثیت سے ایئر ہاؤس پشاور میں مقیم تھے۔ وہی خلوص اور تپاک جو سرگودھا بیس کمانڈر کے گھر میں ہمیں ملتا تھا ایئر ہاؤس میں بھی ملتا رہا۔ پھر جب دو سال بعد ظفر چوہدری فضائیہ کی سربراہی سے سبک دوش ہو گئے۔ تو ہم ماڈل ٹاؤن لاہور میں ان کے ابا کے گھر ان سے ملنے کو گئے تو ظفر صاحب نے اپنی ''قلعہ معلیٰ والی انگریزی'' میں حسب عادت ومحاورہ رسماً نہیں خلوص سے پوچھا ''شاید آپ ایک پیالی چائے پینا تو پسند کریں گے؟'' ہم نے شرارت آمیز سنجیدگی سے

کہا ''شاید نہیں ہم یقیناً چائے پینا چاہیں گے۔'' ظفر صاحب ایک لمحہ کے لئے ہمارے اس خلاف محاورہ جواب سے ہکا بکا رہ گئے۔

ظفر صاحب کے بچپن کے گھر کا ماحول ایک سرکاری جوڈیشل افسر کے گھر کا ماحول تھا اور ان کی تعلیم بھی انگریزی سکولوں اور پھر گورنمنٹ کالج میں ہوئی تھی اس لئے ان کے ہاں ''بادشاہوں'' والی انگریزی کا دور دورہ تھا اور اسی بات کا شاخسانہ ہے کہ ظفر صاحب مدتوں پاکستان کی انگلش سپیکنگ سوسائٹی کے کرتا دھرتا بھی رہے۔ ایئر فورس کی ملازمت سونے پر سہاگا۔ مگر اس انگریزی دانی کے باوجود بے خود دہلوی جیسے استاد کے شاگرد رہے۔ یہ بے خود صاحب ہی کا فیضان لگتا ہے کہ ظفر صاحب نے اپنی لکھی ہوئی کتاب My Years in the PAF کا خود ہی اردو میں ترجمہ کیا اور نہایت بامحاورہ اور شستہ ورفتہ اردو میں کیا۔

یہ بات نہیں کہ ظفر صاحب سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئے ہوں گے۔ ایک متوسط درجہ کے سرکاری افسر کے گھر پیدا ہوئے اور ماشاءاللہ ان کے بہت سے بہن بھائی تھے۔ خوشحالی کا دور دورہ تو شاید نہیں تھا مگر ان کے خاندان نے اسلامی سادگی اور سادہ روی کی روش اختیار کئے رکھی۔ میرے محترم دوست شیخ منظور الٰہی مرحوم نے اپنی خودنوشت میں ان کے والد گرامی چوہدری بشیر احمد صاحب کا ایک واقعہ درج کر کے پرانے شریف اور وضع دار لوگوں کی وضع داری کی مثال دی ہے۔ لکھتے ہیں'' (ظفر چوہدری کے بڑے بھائی) انور احمد کاہلوں نے بتایا کہ دہلی میں قیام کے دوران انہوں نے اپنے ابا سے کہا کہ انہیں حساب کے مضمون میں ٹیوشن کی ضرورت ہو گی۔ ابا نے پوچھا استاد کو ٹیوشن کے لئے کتنا معاوضہ دینا ہو گا؟ میں نے کہا تیس روپے۔ کہنے لگے ابا نے ایک لحظہ کے لئے توقف کیا اور کہا بیٹا تمہاری پڑھائی کے لئے ٹیوشن ضروری ہے۔ میں تانگہ پر عدالت جاتا ہوں ایک روپیہ تانگے والے کو دیتا ہوں۔ تم ٹیوشن رکھ لو میں پیدل عدالت میں چلا جایا کروں گا'' (ہم کہاں کے دانا تھا۔ غیر مطبوعہ خودنوشت شیخ منظور الٰہی) اس ماحول میں پرورش پانے والا بچہ جب اپنے وقت کی مقتدر اور معزز سروس میں جانے لگتا ہے تو باپ نے جو نصیحت کی وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے'' اب تم گھر سے دور رہو گے جہاں تمہاری نشست و برخاست کا

نیا حلقہ ہوگا اس لئے تمہیں ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور امید ہے تم اس پر پورا دھیان دو گے۔ تمہیں اپنی آمدنی میں گذارا کرنا ہے خواہ اس میں کیسی ہی دشواری کیوں نہ پیش آئے۔ قرض ہرگز ہرگز مت لینا۔۔۔ اور یہ صرف نہیں قرض لینا نہیں بلکہ کسی کو قرض دینا بھی نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے کبھی اس امید پر قرض نہ دو کہ رقم واپس مل جائے گی۔ اگر ایسا کیا تو مشکلوں میں پھنسو گے اور دوسروں سے اپنے تعلقات خراب بھی کر لو گے'' (فضائیہ میں میرے ماہ و سال'' صفحہ ۱۱)۔ ایک وضع دار سرکاری افسر کی یہ نصیحت بہتوں کے لئے مشعل راہ ہونی چاہیئے۔

فضائیہ میں شامل ہوئے اور ٹریننگ کے لئے انبالہ پہنچے تو ایک غیور مسلمان افسر انہیں اور ان کے ساتھیوں کو ایک بڑے کمرہ میں لے گیا جہاں ان کیڈٹوں کے نام درج تھے جنہوں نے شمشیرِ اعزازی حاصل کی تھی۔ کاکا خیل نامی وہ افسر کہنے لگے ''جب بھی نیا کورس آتا ہے وہ مسلمان لڑکوں کو جمع کر کے یہاں لاتے ہیں اور تلقین کرتے ہیں کہ وہ محنت کریں تا کہ کوئی مسلمان نام بھی یہاں لکھا جائے'' (صفحہ ۱۰) ظفر چوہدری لکھتے ہیں ''میرے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ اس غیور افسر کی دیرینہ خواہش اس طرح پوری ہوگی کہ کوئی پانچ ماہ بعد مجھے اعزازی شمشیر کا مستحق قرار دیا جائے گا اور میرا نام اس تختی پر لکھا جائے گا'' (صفحہ ایضاً)۔ ہمیں ظفر چوہدری کا یہ منکسرانہ لہجہ اور فروتنی کا انداز بہت اچھا لگا یہی بات ان کے وہ دوست کہتے جو ''پرنس ڈیوڈ بن کر ہر ایک سے اپنی فتوحات کی داد چاہتے رہتے تھے'' تو وہ دون کی لیتے۔ بہر حال ان کے ہاں ان کے بعض دوستوں جیسی انانیت نہیں ہے ورنہ دنیا کی بہترین فضائیہ کی سربراہی کے عہدے تک پہنچ جانے کے بعد ہم نے بہتوں کو بہتیرے نشوں میں سرشار ہوتے پایا ہے۔ اور تو اور ان کے ایک ماتحت ائیر کموڈور سجاد حیدر کی خودنوشت Flight of the Falcon انہی دنوں چھپ کر آئی ہے۔ یہ کتاب پڑھ کر لگتا ہے کہ سجاد حیدر کے علاوہ پی اے ایف میں کوئی فائیٹر پائلٹ تھا نہ کوئی جینیس! اور ۱۹۶۵ کی جنگ تو سوائے پشاور میں متعین ان کے لڑاکا سکواڈرن ۱۹ کے کسی نے لڑی ہی نہیں۔ ایسی انانیت سوائے شہاب نامہ کے ہمیں کسی اور کتاب میں نظر نہیں آئی۔ انہیں تو اپنی ''ناک'' سے آگے دکھائی ہی نہیں دیتا۔ شاید اسی لئے ان کے ساتھی انہیں ''نوزی'' کہتے تھے۔

سجاد حیدر تو ظفر صاحب سے اس لئے بھی ناخوش لگتے ہیں کہ جب وہ ان کے ملنے سرگودھا سٹیشن کمانڈر کے بنگلہ پر گئے تو گروپ کپٹن نے ''انہیں گھر کا بنا ہوا شربت زنجبیل پلایا'' (صفحہ ۱۹۴) آپ شاید کسی خاص ''شرابِ خانہ خراب'' کی توقع رکھتے ہوں گے اور سرگودھا میں ورود کے دوسرے دن ہی انہیں ادرک سے دو چار ہونا پڑا۔ یہ ناراضی ظفر صاحب کے چیف آف سٹاف ہونے تک جاری رہی۔

ظفر صاحب نے پاکستانی فضائیہ کے ۱۹۴۹۔۵۰ کے زمانہ کے کمانڈر انچیف ائیر وائس مارشل ایچر لے کا ایک واقعہ لکھا ہے۔ ایچر لے صاحب ۱۹۳۷ پر اپنے وطن انگلستان گئے ہوئے تھے ان دنوں ظفر صاحب یارک شائر میں برطانوی ائیر فورس کے ساتھ جیٹ جہازوں کی ٹریننگ لے رہے تھے۔ ایچر لے صاحب نے ''بجائے آرام یا تفریح کرنے کے ایک چھوٹی سی کار کرایہ پر لی اور اسے چلاتے ہوئے ہر اس جگہ پہنچے جہاں کوئی بھی پاکستانی فضائیہ کا افسر یا ائیر مین ٹریننگ کے لئے آیا ہوا تھا۔۔۔ چھٹی کا سارا مہینہ اس طرح گذارا اور بیسیوں جگہ جا کر ہر ایک فرد سے خود ملاقات کی اور معلوم کیا کہ وہ انگلستان میں قیام سے کتنا فائدہ اٹھا رہے ہیں'' (صفحہ ۷۸) اے کاش ان کے بعد آنے والے سربراہان بھی انہی کی سی لگن اور جذبہ سے سرشار ہوتے۔

ائیر فورس میں شمولیت سے قبل کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ ''۱۹۳۷ کی بات ہے۔۔۔ کہ ہمارے ایک عزیز نے یکا یک ٹھانی کہ وہ امپیریل ائیر ویز کے جہاز سے انگلستان کا سفر کریں گے یہ ہوائی سروس کئی جگہ رکتی ہوئی دہلی سے برنڈیزی (اٹلی) تک جاتی جہاں سے پیرس تک کا سفر بذریعہ ریل طے ہوتا اور پھر پیرس سے دوبارہ ہوائی جہاز میں جانا ہوتا'' (صفحہ ۷)۔ اتفاق یوں ہے کہ ہم نے ان کے اس ''عزیز'' کی خودنوشت پڑھ رکھی ہے لکھتے ہیں ''۱۹۳۴ میں میں نے دہلی سے لندن ہوائی جہاز سے سفر کرنے کا ارادہ کیا اس اثنا میں ہندوستان میں ٹرانس کانٹینٹل ائیر ویز کا اجراء ہو چکا تھا اس میں زیادہ حصہ امپیریل ائیر ویز کا تھا جو بی او اے سی کی پیش رو تھی''۔۔۔ ''میں دہلی سے انڈین ٹرانس کانٹینٹل ائیر ویز کے جہاز پر کراچی کے لئے روانہ ہوا یہ جہاز پہلے جودھپور ٹھہرتا تھا یہاں اترتے وقت پائیلٹ کے اندازے میں غلطی

کی وجہ سے جہاز کے نچلے حصہ کو نقصان پہنچا جس کی وجہ سے جہاز کی مرمت ضروری ہوئی۔ اور جہاز کراچی جانے کے قابل نہ رہا۔۔۔ دوسرے دن قبل دوپہر کراچی سے امپیریل ائیرویز کا جہاز جس پر ہمیں قاہرہ تک سفر کرنا تھا ہمیں لینے کے لئے جودھپور آ گیا۔ یہ ایک بھاری بھرکم ٹائپ کا جہاز تھا جس کی رفتار پچھتر میل فی گھنٹہ تھی'' (تحدیثِ نعمت صفحہ ۳۵۰)۔ وہ سو میل فی گھنٹے کی رفتار والا جہاز جودھپور ہی میں مرمت کروانے کے لئے رہ گیا۔ ہم نے غلط فہمی سے سمجھ لیا تھا کہ ظفر صاحب نے جہاز کا پہلا دیدار ۱۹۳۴ میں کیا ہوگا مگر ظفر صاحب نے اپنے خط میں ہماری اس غلطی پر ہمیں متنبہ کر دیا کہ انہوں نے جو واقعہ بیان کیا ہے وہ ۱۹۴۷ کا ہے۔ مگران کے بزرگ عزیز نے پہلا سفر ۱۹۳۴ میں کیا تھا۔ اندازہ لگایئے کہ اب ہوائی سفر کی رفتار کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔

چیف آف سٹاف ہونے سے قبل آپ کو شیخ مجیب الرحمن کی رہائی پر انہیں لندن چھوڑنے جانا پڑا جس کی خاصی دلچسپ روداد کتاب میں موجود ہے۔ پھر چیف آف سٹاف ہوئے تو بھٹو صاحب کے انداز حکومت کی جھلکیاں بھی لکھی ہوئی موجود ہیں کہ ان کا اپنے وزراء سے کیسا ''مشفقانہ'' سلوک تھا۔ ایک وزیر کسی اعلیٰ سطح کی میٹنگ میں دیر سے پہنچے''۔۔۔ دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور ایک وزیر دبے پاؤں داخل ہوئے۔ مسٹر بھٹو فوراً کھڑے ہو گئے اور انتہائی درشت لہجے میں چیخے ''تم دیر سے کیوں آئے ہو''؟ یہ صاحب وہیں رک گئے اور ڈرتے ڈرتے نہایت لجاجت سے جواب دیا ''جناب میرا ایکسی ڈنٹ ہو گیا تھا'' مسٹر بھٹو چنگھاڑے ''پھر تم اس میں مر کیوں نہ گئے؟ ایک لیٹ آئے ہو دوسرا جھوٹ بولتے ہو'' (صفحہ ۱۵۴) ایک خاصی بڑی میٹنگ کے دوران ایک وزیر مملکت سے بھٹو صاحب نے کہا ''میں نے سنا ہے تم نے کل فالکن (چھوٹا جیٹ جہاز) استعمال کیا تھا'' وزیر صاحب نے کہا ''جی ہاں بہت ضروری کام تھا اور پی آئی اے کی کوئی پرواز میسر نہیں تھی''۔ مسٹر بھٹو سختی سے بولے ''چند روز ہوئے گورنر پنجاب نے مجھ سے پوچھا تھا کیا وہ فالکن استعمال کر سکتا ہے میں نے اسے کہا ہرگز نہیں اور تم صرف آدھے وزیر ہو تم کیسے استعمال کر سکتے ہو'' (صفحہ ۱۵۵)۔ پی آئی اے کے سربراہ تھے تو پی آئی اے کے سابق سربراہ درانی صاحب کو گرفتار کر لیا گیا۔ بھٹو صاحب نے انہیں درانی صاحب کے خلاف تحقیقات کرنے کو کہا تو معذرت

کر دی کہ انہیں ایسے کام سے معاف رکھا جائے کیونکہ ''میں پی آئی اے کے حالات سے اچھی طرح واقف ہو چکا ہوں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو غلط اطلاعات ملی ہیں درانی صاحب میرے پیش رو ہیں اور میں نے ان سے ایسا سلوک کیا ہے جیسا کہ میں چاہتا ہوں میرا جانشین مجھ سے کرے میرا ان کے خلاف انکوائیری کرنا ہرگز مناسب نہیں۔'' (صفحہ ۱۶۰) اور بعد میں واقعی درانی صاحب تمام الزامات سے بری الذمہ ثابت ہوئے اور دوسرے مجرم پکڑے گئے۔ پی آئی اے کی سربراہی کے دوارن ہی انہیں فون پر جے اے رحیم صاحب کی طرف سے بعض افسروں کو ریٹائر کر دینے کے احکامات ملے مگر ظفر صاحب خود پنڈی پہنچ گئے اور وزیر سے بات کی معلوم ہوا وزیر صاحب نے ایسا کوئی فون کیا ہی نہیں تھا۔ اس کے بعد بھٹو صاحب نے بھی فون پر احکامات دینے کا سلسلہ بند کر دیا۔

فضائیہ سے ان کی روانگی اچانک ہوئی اور ایک اصولی معاملہ پر ہوئی۔ بھٹو صاحب کسی کورٹ مارشل کے فیصلہ میں ردوبدل کرنا چاہتے تھے۔ فضائی کے سربراہ کو ان سے اختلاف تھا۔ بھٹو صاحب کی سیاسی مجبوریاں ہونگی مگر فوج کی نگاہ میں تو اصول اصول ہی ہوتا ہے یا کوئی فیصلہ غلط ہوتا ہے یا صحیح ہوتا ہے اس کے بین بین کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ظفر صاحب نے اس اصول کی پاسداری میں فضائیہ سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ ریٹائر ہو گئے مگر سرکاری اعلان یہ ہوا ریٹائر کر دئے گئے ہیں۔ اور سیاست دانوں کے سرکاری آداب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ فراغت کے بعد ان کی کیا مصروفیات رہیں ان کا ذکر اس کتاب میں نہیں سوائے امریکہ کے ایک سفر کے جس میں ان کا بریف کیس چوری ہو گیا اور اس کی بازیابی بڑی مشکل سے ہوئی۔

یہ سرگزشت ایک مہربان دوست' فرض شناس افسر' اور ادب پسند ادب پرور شخص کی سرگزشت ہے جس میں کوئی ٹیڑھ یا چالاکی نہیں۔ اپنے حالات کو بلاکم و کاست بیان کرنے والا یہ دوست اپنی اعلیٰ خاندانی روایات کا امین ہے خدا کرے یہ روایات ان کی اولاد و اخلاف میں بھی قائم رہیں۔

✓

ایک دل ہزار داستان

''ایک دل ہزار داستان'' آغا اشرف کی سرگزشت ہے جو۱۹۸۹میں لاہور سے شائع ہوئی۔کوئی سوا پانچ سو صفحات کی یہ داستان لاہور کے ایک رئیس زادہ کی عیاشیوں' رنگ رلیوں اور بے راہ روی کی داستان ہے جو بہ قول خود'' دو ہزار سے زائد تصانیف کے مصنف ہیں'' (صفحہ ۵۲۷) اور جن کی زندگی'' گلوکاری' قلمکاری' صداکاری اور اداکاری'' (صفحہ۴۸۱) میں بسر ہوئی۔ ہمیں اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ ہم نے ان کی خودنوشت تلاش کرنے میں خاصا تردد کیا اور بڑی مشکل سے اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم ان آغا اشرف کو'' آداب عرض'' والا آغا اشرف سمجھتے رہے۔ریڈیو سے ان کی وابستگی کا تذکرہ اس غلط فہمی کے پیدا کرنے کا موجب ہوا۔ جب یہ ضخیم کتاب ہمیں پہنچی تو ہم نے بڑے شوق سے اسے پڑھنا شروع کیا اور ابتدا ہی میں ان کے اب وجد کا ذکر دیکھ کر اپنی غلط فہمی کا احساس ہو گیا۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ ہم اس سرگزشت کو بغیر پڑھے رد کر دیتے ہم نے یہ سرگزشت لفظ بہ لفظ پڑھی ہے اور اپنی اس محرومی پر نوحہ کناں ہیں کہ حیف اپنے وطن اور زبان کا دو ہزار سے زیادہ تصانیف کا ایک مصنف ہماری نگاہ سے اوجھل رہ گیا۔ کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کرتے!

''ایک دل ہزار داستان'' کا ذکر مشفق خواجہ کے ایک کالم میں ہماری نظر سے گذرا تھا۔اور خواجہ صاحب نے خاصی تفصیل سے اس سرگزشت کا جائزہ لیا تھا۔تب سے ہمیں اس سرگزشت کے حصول کا شوق تھا کیونکہ اس میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کی سرگزشت ''یادوں کی دنیا'' میں سے ان کے سفر پیرس کے باب میں پیرے کے پیرے آغا صاحب نے!

خود اپنے سفر نامہ کے طور پر درج کر لئے تھے۔ (صفحہ۳۲۱) مشفق خواجہ نے بڑا دلچسپ نتیجہ نکالا تھا کہ خدا معلوم ڈاکٹر یوسف حسین خاں اپنے بعد میں آنے والوں کے سفر نامے کس طرح ملاحظہ فرما لیا کرتے تھے؟ یہ تو ہم نے بھی اس کتاب کے مطالعہ کے دوران دیکھا کہ آغا صاحب میں اخذ و اکتساب کی بڑی صلاحیت ہے۔ جہاں تہاں جوش صاحب کے فقرے کے فقرے عبارت کی زینت ہیں کہیں کہیں حوالہ بھی دے دیتے ہیں ورنہ عبارت کی روانی میں دوسروں کی عبارتیں درج کرتے چلے جاتے ہیں جو اکثر مقامات پر پڑھنے والوں کو رکنے اور سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ یہ عبارت اس نے کہاں دیکھی تھی۔ بہر طور آغا صاحب کے بیان میں روانی ہے اور اس وقت وہ روانی دیکھنے کی ہوتی ہے جہاں خود ان کے والد محترم کا ذکر خیر ہو یا خود ان کی جوانی دیوانی کا تذکرہ ہو۔ جہاں ہم گئے داستان چھوڑ آئے کا مصرعہ ان کی سرگزشت پر صادق آتا ہے۔ذکر اس پری وش کا خود اس کی زبانی سنئے'' پیسے کی فراوانی تھی کسی چیز کی کمی نہ تھی پشتینی رئیس زادہ تھا گو ابھی بگڑا نہ تھا کوئے بتاں میں اپنی دولت صحت جوانی اور زندگی مٹھیاں بھر بھر کر ابھی لٹائی نہ تھی جو مجھے دیکھتا دوسری بار دیکھنے کی حسرت لئے پھرتا۔شہزادوں کے لباس میں سج دھج سے گھر سے نکلتا تو لوگ نظریں اٹھا اٹھا کر صناعیٔ قدرت کو دیکھتے۔ کئی دل خون ہو کر رہ جاتے۔ کئی پردہ نشینوں کو پسینے آنے لگتے بدن بھیگ جاتا چلمنیں سرکتیں پردے سرسراتے بند کھڑکیاں کھٹ کھٹ کھلنے لگتیں دبے دبے نقرئی قہقہوں کی جل ترنگ بجتے۔۔۔'' (صفحہ۲۴۰) ایسی نرگسیت کے عالم میں اگر انہیں جوش صاحب یاد آتے ہیں تو کوئی بے محل بات نہیں۔ پشتینی رئیس زادگی ان میں اور جوش صاحب میں مشترک ہے۔ وہ بھی اپنے دادا کے کارہائے نمایاں کے بیان میں غلو کرتے ہیں آغا صاحب ان سے کم نہیں۔ان کے والد گرامی کی جنسی فتوحات کا تذکرہ دیکھئے'' آغا ارشد حسین خاں پر شباب آیا تو واقعی ایک طوفان رنگ و بو اور ہنگامۂ ہاؤ ہو ساتھ لایا از حد کھوجنے' کریدنے' کھرچنے' ناپنے' تولنے' جانچنے' پرکھنے کے باوجود یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انہوں نے پہلی بار خود پی یا کسی نے انہیں پلائی۔۔۔ وہ لوگ جوان کے ہم جولی' ہم جلیس' ہم قدم' ہم نوا' ہم عصر' ہم سفر' ہم مشرب' ہم رنگ اور ہم نوالہ و ہم پیالہ رہے ہیرا منڈی میں ان کی عیاشی و تماش بینی کی داستانوں کے داستان گو

رہے ہیں'' (صفحہ ۴۴)۔۔۔۔''آغا صاحب کی رنگین مزاجی نے بڑے گل کھلائے کسی کو اپنے عشق میں تھئی تھئی نچایا اور کسی کے عشق میں خود تھئی تھئی ناچے۔۔۔باپ کی دولت دونوں ہاتھوں سے لٹانے لگے خوب گل چھرے اڑائے''۔(صفحہ ۴۵)

آغا اشرف دوسروں کے رنگ سخن پر ہی ہاتھ صاف نہیں کرتے دوسروں کے کئے ہوئے کام بھی اپنے ساتھ منسوب کر لیتے ہیں۔حمید نسیم نے اپنی خودنوشت ناممکن کی جستجو میں سائیں مرنا کے ساتھ اپنی پہلی اتفاقیہ ملاقات کا ذکر کیا ہے اور انہیں ریڈیو سٹیشن لے جا کر ان سے اکتارا سنوانے کا اہتمام کیا ہے مگر آغا صاحب کی روایت یہ ہے کہ ان کی سائیں مرنا سے ملاقات ہوئی آپ نے پوچھا ''کیا نام ہے تمہارا؟'' جواب دیا ''سائیں مرنا''۔ میں نے کہا ایسا ساز بجاتے ہوئے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔تم کوئی دیوتا ہو انسان کا روپ دھار کر آکاش سے اتر آئے ہو''۔ میں نے کہا ''تمہیں ریڈیو سٹیشن جانا چاہیئے۔'' سائیں مرنا نے کہا ''سنا ہے وہاں سفارش چلتی ہے ملنگ کو وہاں کون منہ لگائے گا'' میں نے کہا ''میں تمہیں ریڈیو سٹیشن لے چلوں گا''۔۔۔میں اسے ریڈیو سٹیشن لے گیا جہاں اس نے اپنے فن کے مظاہرے سے سب کو تصویر حیرت بنا دیا'' (صفحہ ۸۲)۔سائیں مرنا سے ان کا مکالمہ ہی ان کے ادعا کی تردید کر رہا ہے۔

غرض یہ سرگزشت ایک عیش پسند عیش کوش رئیس زادہ کی سرگزشت ہونے کے ناطے لاہور کے رئیس زادوں کی زندگی پر روشنی ڈالتی ہے اور ضمناً آغا صاحب نے لاہور کی کلچرل تاریخ بھی بیان کر دی ہے۔لاہور کے پرانے مقامات تکیے مزارات اکھاڑے جو کچھ انہیں یاد آتا گیا اس کے باب میں اپنے تاثرات ریکارڈ کرتے چلے گئے۔اس لئے پرانے لاہور کے بارہ میں ان کی معلومات پرانے لاہور کی تاریخ میں دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مفید ہوں گی۔

ان کی بھتیجی زبیدہ سلطانہ دختر خان احمد حسین خاں صاحب کی خودنوشت ''تماشا گاہِ عالم'' بھی حال ہی میں چھپی ہے اس میں بھی اس خاندان کا احوال موجود ہے۔مگر اس خودنوشت کا پیرایہ افسانوی ادب کا ہے۔

✓

تماشہ گاہِ عالم

''تماشہ گاہِ عالم'' محترمہ زبیدہ سلطانہ کی خودنوشت ہے جو آپ نے ۹۵ برس کی عمر میں رقم کی۔یہ خودنوشت لاہور کے ایک رئیس خاندان کے زوال کی داستان ہے۔محترمہ زبیدہ سلطانہ تیس کی دہائی کے مشہور ناول نگار اور ماہنامہ شباب اردو کے مدیر خان احمد حسین خاں کی دختر نیک اختر ہیں اور خود بھی اپنے قول کے مطابق کوئی دو سو کے قریب کتابوں کی مصنفہ ہیں۔زبیدہ سلطانہ کے نزدیک لاہور کے اس رئیس خاندان کا زوال اس وقت شروع ہو گیا جب خاندان کے سربراہ خان بہادر ڈاکٹر محمد حسین (مترجم گریز اناٹومی) رئیس اعظم و آنریری مجسٹریٹ و پروفیسر آف اناٹومی، کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور' نے اپنی چہیتی بیگم کی انگیخت پر بلا سوچے سمجھے اپنے بڑے بیٹے خان احمد حسین خان کو جائیداد سے عاق کر کے گھر سے نکال دیا۔خان بہادر صاحب نے بہت جائیداد بنائی تھی اور لاہور کے پرانے شہر میں بھاٹی دروازہ میں اس خاندان کی عالیشان حویلی تھی جسے شیش محل کہا جاتا تھا۔مگر خان بہادر صاحب اپنی اولاد کی تربیت سے اس حد تک غافل تھے کہ ان کی اولاد میں سے سوائے ایک خان احمد حسین خان کے اور کوئی پڑھ لکھ کر اعلیٰ سرکاری ملازمت تک نہ پہنچا۔دوسرے بیٹے ارشد حسین نے رئیسوں کی طرح رنگ رلیوں میں باپ کی جائیداد کو اس کی زندگی ہی میں اجاڑ کر رکھ دیا۔یہی ارشد حسین آغا ارشد کے نام سے اپنے فرزند آغا اشرف کی سرگزشت کے عیاش ہیرو کی حیثیت سے سامنے آئے۔یہ خاندان کسی طوائف الملوکی کی وجہ سے نہیں اجڑا خود اپنوں کی عیاشی اور بے راہ روی سے اپنے انجام کو پہنچا۔قاری یہ سوچ کر حیرت میں گم رہ جاتا ہے کہ خان بہادر صاحب جو ڈاکٹر تھے ایک معزز عہدے پر میڈیکل کالج کے استاد

تھے اولاد سے اس حد تک غافل اور بیوی سے اس حد تک مرعوب کیوں تھے کہ انہیں اپنے خاندان کی ڈوبتی ہوئی کشتی نظر نہ آئی ؟ حالانکہ زبیدہ سلطانہ کا کہنا ہے کہ ”خان بہادر صاحب انا کے معاملہ میں سخت تھے“ (تماشا گاہ عالم صفحہ ۱۹۰)

تماشا گاہ عالم افسانوی پیرائے میں لکھی گئی خودنوشت ہے جس میں زبیدہ سلطانہ اپنے حالات کو بھی راوی کی حیثیت سے روایت کیا ہے۔ ان کے ابا خان احمد حسین خان نے ابا کے گھر سے نکال دینے کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور پڑھ لکھ کر ججی کے عہدہ پر فائض ہوئے اور نیک نامی سے سروس پوری کی۔ اس وضع داری میں رشوت تو نہیں لی البتہ مہاجنوں سے قرض وام کر کے اپنی وضع داری نبھاتے رہے۔

اس خودنوشت میں عام قاری کے مطلب کی کوئی ایسی دلچسپ بات نہیں جو اسے اس سرگزشت کو پڑھنے پر مائل کرے صرف ان لوگوں کو اس میں دلچسپی ہوگی جو اس رئیس خاندان کے کسی نہ کسی فرد سے واقف ہوں یا ان سے کوئی تعلقِ رکھتے ہوں۔

ہمیں تو یہ بات خوش آئی کہ احمد حسین خان کے پڑھنے کے لئے جو استاد گھر میں ملازم رکھے گئے انہوں نے محلّہ کے ایک غریب بچے کو بھی اس رئیس زادہ کے ساتھ تعلیم میں شریک کرلیا اور بچے کے والدین نے بخوشی اس کو اپنے گھر میں پڑھنے کی اجازت دی۔ وہ بچہ بعد کو مشہور عالم بنا اور ڈاکٹر پروفیسر محمد شفیع کہلایا۔ (صفحہ ۲۱)

خان احمد حسین جالندھر میں جج رہے وہیں ان کی واقفیت حفیظ جالندھری سے ہوئی۔ شباب اردو کے زمانہ میں حفیظ لاہور آئے تو خان صاحب نے ”انہیں ساٹھ روپے کی ملازمت دی دفتر کے ملحقہ کمرے میں قیام وطعام کی سہولت مہیا کر دی۔ انہیں اپنے ساتھ مشاعروں میں لے جاتے جہاں وہ اپنا اصلاح شدہ کلام ترنم سے پڑھتے۔۔۔ اور کچھ عرصہ بعد جب حفیظ نے سوسائٹی میں اپنا مقام بنالیا تو نہ صرف شباب اردو کی ملازمت چھوڑ دی بلکہ حق نمک اس طرح ادا کیا کہ ہر جگہ ان کی مذمت اور برائی کیا کرتے۔۔۔ شورش کاشمیری نے کچھ ایسی بات حفیظ کے بارہ میں لکھی تھی کہ احمد حسین خان صاحب نے اس کے ہاتھ سے طبلہ سارنگی چھڑوا کر قلم تھمادیا“ تھا (صفحہ ۳۲۴)۔

اس خاندان کے آغا ارشد اور ان کے صاحبزادے آغا اشرف کا ذکر ایک بار پھر اس خود نوشت کے اواخر میں ہے اور عبرت ناک ہے۔ ”ارشد حسین کا ایک ہی بیٹا تھا آغا اشرف وہ بھی تصنیف وتالیف سے شغف رکھتا تھا اس کے تین بچے تھے بڑا بیٹا ہیروئن کے نشے کا عادی تھا وہ اسی لعنت زدہ چیز کی لت میں عین عالم شباب میں مرگیا۔ خود آغا اشرف بیٹے کے بعد فوت ہوا ایک بیٹا اور ایک بیٹی کہیں لاہور ہی میں رہتے ہیں اور بڑی سقیم الحال زندگی گذار رہے ہیں۔۔ حیف کہ یہ عالم ہے اس ناعاقبت اندیش شخص کے پس ماندگان کا جو کبھی اشرفیوں میں کھیلتا تھا جو دولت کو گرد راہ کی طرح اڑاتا تھا اور ارباب نشاط کے ہاں شہزادہ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔۔۔ آہ یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے۔۔۔ کون کہتا ہے کہ انسان اپنے کئے کو خود اکیلا ہی بھگتا ہے آج وہ ارباب نشاط کا شہزادہ خان بہادر کا چھوٹا بیٹا ماں کا لاڈلا نور نظر آغا ”عثمان جاہ“ ارشد حسین آ کر دیکھے کہ اس کی اولاد کیسے بھگت رہی ہے“ (صفحہ ۵۷۵)۔

زبیدہ سلطانہ نے اسی بیان پر اپنی خودنوشت ختم کر دی ہے اس کے بعد کے صفحات میں ان کے بعض مضامین درج ہیں۔

✔

جہادِ زندگانی

مولوی فیروز الدین بانی فیروز سنز کی خودنوشت ''جہادِ زندگانی'' کے عنوان سے ان کے صاحبزادے عبدالحمید نے مرتب کر کے ۱۹۵۹ میں فیروز سنز سے ہی شائع کی۔ پونے چار سو صفحات کی اس کتاب پر چار روپے کی قیمت درج ہے۔ اس زمانہ میں کتابوں کی قیمت کا یہی اصول رائج تھا کہ کتاب کی قیمت ایک روپیہ فی سو صفحہ مقرر کی جائے اور اب وہ زمانہ آ لگا ہے کہ کتابوں کی قیمت ایک روپیہ فی صفحہ کے تحت مقرر کی جاتی ہے سو صفحہ کی کتاب سو روپے میں۔ مولوی صاحب کثیر التصانیف مصنف تھے ان کا خیال ہے کہ ''میری تصانیف کا حجم پچاس ہزار صفحات کے لگ بھگ ہوگا'' (جہادِ زندگانی صفحہ ۷۵)۔

مولوی فیروز الدین نے اپنی خودنوشت لکھی نہیں بلکہ اپنے اخلاف کو لکھوائی ہے اور سعادت مند اولاد نے ان کی بزرگی کے احترام میں ان کے ارشادات کو باقاعدگی سے سنا اور لکھا ہے۔ یہ خودنوشت ایک اولوالعزم انسان کی داستان ہے جس نے معمولی سرمایہ سے اپنا اشاعت کتب کا کاروبار شروع کیا اور پھر اپنی زندگی میں اتنی ترقی کر لی کہ رفاہ عامہ کے بعض کاموں کے لئے وقف بھی بنا سکے۔ یہ خودنوشت بیسویں صدی کے برطانوی ہند کے ماحول میں مسلمانوں کے احوال کی عمدہ تصویر کشی ہے۔ اس زمانہ میں پنجاب میں تین پبلشر بہت مشہور تھے گلاب سنگھ اینڈ سنز میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز اور فیروز سنز۔ تینوں نے اپنے کاروبار کا آغاز تعلیمی کتابوں کی اشاعت سے شروع کیا اور تینوں میں صحت مندانہ مقابلہ جاری رہا۔ مولوی فیروز الدین کے جغرافیائی گلوب نے ان کی ترقی کے راستے کھول دیئے پھر ان کی لغت فیروز اللغات کے دو حصے چھپے مولوی صاحب

کا ترجمہ قرآن بھی ان کے لئے برکت کا موجب ہوا۔ کشف المحجوب کی پہلی پہلی اشاعت کا شرف بھی انہیں حاصل ہوا۔ ظاہر ہے مسلمانوں کی دینی کتب کے سلسلہ میں انہیں تفوق رہا ہوگا مگر اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان میں اسلامی لٹریچر کی اشاعت کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ اور وقیع کام نول کشور والوں نے کیا۔

مولوی صاحب ایک عام دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے ان کے والد میاں جان محمد صاحب کے استاد مرزا اکرم بیگ کے پاس ایک جن بھی تحصیل علم کے لئے آتا تھا جس کا نام عبداللہ تھا ''ایک روز انہیں پیاس محسوس ہوئی تو انہوں نے کہا حسین شاہ کے کنویں کا ٹھنڈا پانی پلاؤ تو طبیعت کو سکون آئے لیکن لانا قدرے جلدی۔ عبداللہ نے جو استاد کا حکم سنا تو وہیں بیٹھے بیٹھے ہاتھ اٹھا کر ہاتھ بڑھایا اور اس کنویں سے پانی بھر کر مرزا صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا یہ دیکھ کر مرزا صاحب کے تو ہوش اڑ گئے انہوں نے عبداللہ سے کہا سچ سچ بتاؤ تم کون ہو یہ کام انسان کا نہیں۔ عبد اللہ نے کہا مولوی صاحب میں قوم جنات سے ہوں'' (صفحہ ۳۶)۔ اسی طرح ان کا کہنا ہے کہ ''والد صاحب کو کچھ دست غیب بھی تھا یعنی صبح جب وظیفہ سے فارغ ہوتے تو روزانہ ایک روپیہ مصلے کے نیچے سے مل جاتا'' (صفحہ ۳۷)۔ مگر ان کو اس بات کا احساس ہے کہ ''نئی نسل کرامات اولیا کی قائل نہیں'' (صفحہ ۱۵۹)

مولوی صاحب اپنے آپ کو صاحب اسلوب ادیب تصور کرتے تھے اس لئے اپنی مرتب کردہ یا لکھی ہوئی درسی کتب دوسروں کو دکھاتے نہیں تھے۔ کسی نے کہا کہ آپ کسی کو دکھاتے کیوں نہیں تو فرمایا ''بہت کم لوگ نئی طرز پیدا کر سکتے ہیں میں اس لئے نہیں دکھاتا کہ وہ میری طرز چرا لیں گے'' (صفحہ ۵۸)۔ بہر حال رفتہ رفتہ ان کی درسی کتب محکمہ تعلیم میں رائج ہوتی چلی گئیں اور ان کے لئے کشائش کے دروازے کھلتے چلے گئے مگر ''اس زمانہ میں بھی ایک بار انہیں درسی کتابوں میں ایک لاکھ روپے کا نقصان بھی ہوا'' (صفحہ ٦٦)۔

مولوی صاحب مرشد کی تلاش میں بھٹکتے رہے مگر انہیں کوئی صاحب دل مرشد میسر نہ آیا مگر سچے خواب انہیں ضرور آتے رہے کئی لوگوں سے بیعت بھی ہوئے مگر دل کو سکون میسر نہ آیا۔ ایک

مرشد کے پاس گئے تو ان کا ایک مرید ان سے دعا کروانے کو حاضر تھا اس نے کہا میں مقروض ہوں میرے لئے دعا فرمائیں مرشد نے دعا فرمائی کہ "اے اللہ اس کے سارے قرض خواہ مرجائیں" (صفحہ ۱۶۰) دوسرے پیر ایسے تھے کہ "مجلس میں جس کے کان میں کچھ پھونک دیتے تھے وہ تڑپنے لگ جاتا تھا" (صفحہ ۱۶۴) ایک مجذوب انہیں ایسے بھی ملے جن کے بارہ میں لکھتے ہیں "ان کے ملنے والوں میں مولانا محمد حسین آزاد کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ آزاد کالج سے فارغ ہو کر سیدھے ان کے پاس چلے جاتے اور دیر تک بیٹھے رہتے ریٹائر ہونے کے بعد پروفیسر آزاد کو ان کی صحبت کا زیادہ موقعہ ملنے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پروفیسر آزاد بھی مجذوب ہو گئے" (صفحہ ۱۵۸)۔

ان کے صاحبزادے نے لکھا ہے کہ مولوی صاحب کو اپنی وفات سے قبل اپنی وفات کے بارہ میں خوابیں آنا شروع ہو گئی تھیں اور ان کی وفات ان کے مطابق ہی ہوئی مگر حیرت ہے کہ مولوی صاحب نے اپنی ترنگ میں جماعت احمدیہ کے بانی مرزا غلام احمد صاحب کے بارہ میں یہ کیوں لکھ دیا تھا کہ وہ لاہور میں آئے ہوئے تھے کہ موت نے انہیں آلیا کیا انہیں اپنی وفات کے بارہ میں کوئی خبر نہیں تھی؟ "اپنی موت سے اتنا بے خبر ہونا نہ صرف باعث تعجب ہے بلکہ باعث غور بھی ہے" (صفحہ ۴۳) موت کی کس کو خبر ہوتی ہے؟ قرآن کا واضح ارشاد ہے کہ کوئی جاندار یہ نہیں جانتا کہ وہ کب اور کہاں موت کا شکار ہو جائے گا۔ غالبًا اسی لئے ان کے صاحبزادے کو مولوی صاحب کی منذر خوابوں کا تفصیل سے ذکر کرنا پڑا۔ (صفحہ ۲۶) بعض اوقات سمجھدار اور پڑھے لکھے لوگ بھی تعصب کے زیر اثر ایسی ناشدنی باتیں لکھ جاتے ہیں۔

اپنی تدریسی کتب کی فروخت کے سلسلہ میں انہیں مختلف ریاستوں میں جانے کا موقعہ ملتا رہا۔ بھوپال، بہاولپور، کشمیر، فرید کوٹ وغیرہ ریاستوں میں ان کی شائع کردہ کتب پڑھائی جاتی تھیں۔ بہاولپور کے بارہ میں یہ بات پہلی بار پڑھنے میں آئی کہ "وہاں کے نواب اپنی بہنوں بیٹیوں کی شادی نہیں کرتے تھے بلکہ قلعہ دلاور میں ان کو ایسا بند کیا جاتا تھا کہ صرف ان کی لاشیں ہی باہر نکلتی تھیں" (صفحہ ۸۷)۔ ہمیں یہ بات پڑھ کر حیرت نہیں ہوئی کہ ہمارے ہاں جاگیردار تعلقہ دار اور زمیندار جائیدادوں کو بچانے کی خاطر بیٹیوں بہنوں کی شادیاں "قرآن" سے کر دیتے تھے اور

آج کل بھی ایسی باتیں ہو رہی ہیں۔ مگر ہمیں حیرت اس بات پر ہوئی کہ ہم نے ایک خودنوشت میں پڑھا ہے کہ ریاست بہاولپور کی ایک خاتون کا فسخ نکاح کا مقدمہ بہاولپور کی شرعی عدالت میں پیش ہوا۔ وکیل صفائی نے اپنے دلائل میں یہ دلیل پیش کی کہ "نواب صاحب بہاولپور کی پھوپی محترمہ کا نکاح خان عبدالحمید خان آف زیدہ سے ہوا تھا اور ان سے اولاد بھی ہوئی خان آف زیدہ بوقت نکاح احمدی تھے اس پر جج صاحب نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا کہ وہ ایسے ریمارک عدالت کی فائل پر نہیں لا سکتے کیونکہ اس میں اعلیٰ حضرت کی توہین ہوتی ہے۔" (تحدیثِ نعمت خودنوشت سر محمد ظفر اللہ خاں صفحہ ۱۹۷)۔ خدا معلوم مولوی صاحب کس نواب کے زمانہ کی بات کر رہے ہیں؟

ریاست کشمیر کے دورہ کے دوران ان کی ملاقات مولانا حکیم نورالدین صاحب مرقاۃ الیقین سے ہوئی۔ لکھتے ہیں "مولوی صاحب بڑے نیک انسان تھے شروع میں دو سو روپے ماہوار پر شاہی حکیم مقرر ہوئے مہاراجہ امر سنگھ کے زمانہ میں ان کی تنخواہ ایک ہزار روپیہ ہو گئی ان کا لباس اور طرز رہائش بالکل سادہ تھی ایک بار انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں تشریف لائے دوران گفتگو انہوں نے بتایا کہ میں حصول تعلیم کی غرض سے جب لکھنؤ پہنچا تو گذارے کی کوئی صورت نہ تھی ایک صاحب کے ہاں ڈیڑھ روپیہ ماہوار پر نوکری کر لی لیکن روٹی پکانا میرے بس کا روگ نہ تھا جوں توں کر کے پکائی تو وہ ایسی بے ڈھنگی تھی کہ میں خود شرمسار تھا خدا سے دعا مانگی کہ اللہ میاں کوئی اور سہارا بن جائے میری نیت علم حاصل کرنے کی ہے" (صفحہ ۸۳)۔ حکیم صاحب نے اس واقعہ کا ذکر اپنی خودنوشت مرقاۃ الیقین میں کیا ہے "حرفہ کے لئے میرے دماغ میں کوئی بناوٹ نہیں اپنی روٹی پکانے کے لئے ایک منطق سے کام لینے لگا چولہے میں آگ جلائی توا رکھا اور روٹی گول بنانے کی یہ ترکیب سوجھی کہ آٹے کو بہت پتلا گھول لیا اور ایک برتن کے ذریعہ اس گرم توے پر بلا گھی اور خشکے خوبصورت دائرہ کی طرح آٹا ڈال دیا جب اس کا نصف حصہ پک گیا تو پلٹنے کے لئے روٹی کو اٹھانے کی فضول کوششیں کیں ان کوششوں میں روٹی اوپر تک پک چکی تھی خیالی فلسفہ نے توے کو اتار کر آگ کے سامنے رکھوایا جب عمدہ طور پر اوپر کا حصہ پختہ نظر آیا تو چاقو سے اتارنے کی ٹھہری۔ مگر چاقو کے ذریعہ اترنے سے بھی اس نے انکار کیا اور مجھے دعا کی توفیق ملی۔

اس مکان سے باہر نکل کر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دعا مانگنے لگا اے کریم مولا ایک نادان کے کام سپرد کرنا اپنے بنائے ہوئے رزق کو ضائع کرنا ہے یہ کس لائق ہے جس کے سپرد روٹی پکانا کیا گیا'' (مرقاۃ الیقین فی حیاۃ نورالدین صفحہ ۶۹)۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام کیا کہ ان کے استاد کے ہاں ان کے کھانے کا انتظام ہو گیا اور حکیم صاحب اس مشقت سے بچ گئے۔

مولوی صاحب نے قرآن کریم کا اردو ترجمہ بھی کیا اور بڑی محنت سے شائع کیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے مولوی صاحب نے قرآن کے مختلف اردو تراجم کا ذکر کیا ہے سرسید کے ترجمہ قرآن کے بارہ میں مولوی نذیر احمد دہلوی کی یہ رائے بھی درج کی ہے جو انہوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں بیان کی کہ ''بعض مقامات کے تراجم میں انہوں نے اس قدر دلیری کی ہے کہ غالباً جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے وہ معنیٰ نہیں سمجھتے ہونگے جو انہوں نے بیان فرمائے ہیں'' (صفحہ ۷۰) حالانکہ مولوی نذیر احمد صاحب کا اپنا ترجمہ قرآن اتنا متنازعہ فیہ رہا کہ عوام نے مدتوں اسے قبول نہیں کیا۔ انہی مولوی نذیر احمد صاحب پر مولوی محرم علی چشتی نے ''سرسید کا نیچری بھانڈ'' کی پھبتی کہی تھی (صفحہ ۳۲۸)۔

اپنے زمانہ کے حالات میں بعض دلچسپ باتیں بھی لکھی گئی ہیں۔ ایچیسن کالج کی بنیاد رکھی گئی تو ''اس کی بنیاد میں پنجاب کے اخبارات بوتلوں میں بند کر کے چنے گئے ان میں پنجاب پنچ بھی شامل تھا'' (صفحہ ۲۱۰) ''ہندوستان میں ریل گاڑی شروع ہوئی تو اس کی رفتار بارہ میل فی گھنٹہ تھی اور اب چالیس پینتالیس میل فی گھنٹہ ہے'' (صفحہ ۲۰۸)

احوال الرجال کے سلسلہ میں سر عبدالقادر ڈاکٹر اقبال راجہ نریندر ناتھ سردار محمد حیات خاں اور ان کے صاحبزادہ سردار سکندر حیات خاں اور بے شمار مسلم اور غیر مسلم اکابر کا ذکر ہے مگر کوئی ایسی بات مولوی صاحب نے ان شخصیتوں کے بارہ میں نہیں لکھی جو قابل بیان ہو۔ سردار سکندر حیات کی وعدہ خلافیوں اور سر عبدالقادر کی دیانت داری کے واقعات ہیں اور یہ عام سی بات ہے۔ سر فضل حسین نے مسلمانوں کی جو خدمت کی اس کا تذکرہ ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اپنی خودنوشت ''جگر لخت لخت'' میں اپنے احراری ہونے کے ناطے سر فضل حسین کے جنازہ کے بارہ

میں لکھا تھا کہ ''سر فضل حسین کی میت دفن کے لئے لاہور سے بٹالہ لائی گئی۔۔۔ بٹالہ کی عام آبادی میں اس سانحہء ارتحال پر کوئی خاص ردعمل دیکھنے میں نہ آیا'' (جگر لخت لخت صفحہ ۱۱۶) مولوی فیروز الدین لکھتے ہیں ''سر فضل حسین کے جنازہ میں ہزاروں آدمی شامل تھے ان میں احراری بھی تھے مگر انہوں نے جنازہ نہ پڑھا'' (صفحہ ۲۹۷) آدمی کس کی بات باور کرے مولوی فیروز الدین صاحب کی جو اس وقت عاقل و بالغ آدمی تھے یا غلام حسین ذوالفقار کی جو اس وقت سکول کے بچے تھے؟

مولوی صاحب کے صاحب زادے ڈاکٹر عبدالوحید جنیوا گئے تو وہاں سر ہربرٹ ایمرسن (سابق گورنر پنجاب) سے ملتے رہے اور ''انہیں چائے پر بلاتے رہے کیونکہ ایک پنجابی باشندے کی طرف سے اس قسم کا اظہار تپاک ان کے لئے مفید تھا اور ان کی ہر دلعزیزی کا بڑا گواہ کہ جس صوبہ میں یہ حکومت کر آئے ہیں وہاں کے معززین سے ان کا کیسا اچھا سلوک رہا ہے'' (صفحہ ۲۰۱)۔ ان کے اچھے سلوک کی مثال تو اخبار انقلاب کے ایڈیٹر عبدالمجید سالک نے دی ہے سر ہربرٹ ایمرسن کو پنجاب کے لوگ مسجد شہید گنج کے سانحہ اور ان کی سکھ نوازی کی وجہ سے ''سر ہربرٹ امر سنگھ کہا کرتے تھے'' (سرگزشت مولانا عبدالمجید سالک صفحہ ۳۴۹)۔ یہ ایک ناکام صحافی اور ایک کامیاب صحافی کے آپس کے معاملات ہیں ہم ان میں دخل دینے والے کون؟ مگر سر ہربرٹ ایمرسن کو ہر دلعزیز گورنر وہی قرار دے سکتا ہے جس نے ان کی گورنری کے زمانہ میں ان سے مادی فوائد حاصل کئے ہوں۔ پنجاب کی تاریخ میں انہیں ایک ناکام اور متعصب گورنر شمار کیا جاتا ہے۔

غرض مولوی فیروز الدین صاحب کی خودنوشت جہاد زندگانی اپنی بعض انوکھی باتوں کے باوجود اپنے دور کی عمدہ تصویر کشی کرتی ہے اور مستقبل کے مؤرخوں کے لئے مفید مواد فراہم کرتی ہے۔

سفیر اور سفارت کاری

پاکستان کے ایک سابق سفارت کار ڈاکٹر سمیع اللہ قریشی نے اپنی خودنوشت ''سفیر اور سفارت کاری۔ ایک دور کی کہانی'' کے عنوان سے لکھی ہے جسے پیراماؤنٹ انٹرپرائز کراچی نے نومبر ۲۰۰۶ میں شائع کیا ہے۔ قریشی صاحب کی یہ کہانی ۱۹۴۷ سے 1987 تک کے دور کو محیط ہے۔ وہ پاکستان کی خارجہ سروس میں شامل ہونے والے اول اول سفارت کار تھے۔ علی گڑھ سے فلسفہ میں ایم اے کیا اور اپنی سفارتی تقرری کے دوران آٹووا کینیڈا سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کا تعلق آگرہ کے ایک ممتاز گھرانے سے تھا جو تحریک پاکستان کے دوران سرگرم رہا اور ہجرت کے بعد پاکستان آ گیا۔ قریشی صاحب نے پہلے پنجاب سول سروس میں کامیابی حاصل کی مگر پھر وزارت خارجہ میں چن لئے گئے۔ پی سی ایس کی ٹریننگ کے دوران ایک سول سرونٹ نواب فیض اللہ خاں خاکوانی تحصیلدار کے ساتھ منسلک کئے گئے جو ان کی تربیت کی طرف توجہ نہیں دیتے تھے جب قریشی صاحب نے اس عدم توجہی کا شکوہ کیا تو سردار صاحب کہنے لگے ''نوجوان میں تم پر اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا کیونکہ تمہارے ماتھے پر لکھا ہے کہ تم چند ہفتوں میں سمندر پار جارہے ہو۔'' (سفیر اور سفارت کاری ایک دور کی کہانی صفحہ ۴۶) اور واقعی چند ہفتوں کے بعد قریشی صاحب وزارت خارجہ میں تقرر کے بعد ۱۹۴۹ میں امریکہ میں تربیت کے لئے چلے گئے غالباً اس وقت سول سروس اکیڈمی وغیرہ وجود میں نہیں آئی ہونگی یا قریشی صاحب نے اپنی ملکی تربیت کا ذکر کرنا مناسب نہیں جانا۔

پاکستان آنے سے قبل سروجنی نائیڈو نے جو بہار کی گورنر بن کر جارہی تھیں انہیں کہا کہ

''پاکستان کیوں جارہے ہو۔ پاکستان چھ مہینے سے زیادہ نہیں چلے گا'' (صفحہ ۲۵)۔ یہ بات ہندو علی الاعلان کہا کرتے تھے مگر سروجنی نائیڈو جیسی دانشور کا یہ کہنا ہم نے پہلی بار سنا ہے۔

سفیر قریشی نے ملنساری اور مہمانداری اپنے بزرگوں سے ورثہ میں پائی ہے خود اپنی طبیعت کے لحاظ سے بھی دوستدار آدمی ہیں ''میں دوستدار آدمی ہوں دوستوں کے بغیر زندگی اجیرن لگتی ہے'' (صفحہ ۲۴۹) اس لئے آپ نے اپنی سفارتوں کے دوران میں اپنی بے محابہ دعوتوں کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہے۔ خوش قسمتی سے نواب امین الدین خاں لوہارو کی صاحبزادی ان کی شریک حیات بن گئیں اور انہیں نظام الملک طوسی کے اس فرمودہ پر عمل کرنے کا موقعہ مل گیا کہ ''اہم ترین خواتین کی خوشنودی میں رہنا امیروں وزیروں کے لئے ضروری ہوتا ہے'' (صفحہ viii) اور خود ان کے قول کے مطابق ''سفارت کاروں کی خواتین اس ٹیم کا جزو لاینفک ہوتی ہیں'' (ایضاً)۔ ان کی ڈپلومیسی یا سفارت کاری کی نیو ہی دوستی پر اٹھائی گئی ہے جہاں گئے ہیں دوست بنائے ہیں اور ان دوستوں نے بھی ان سے ہر موقعہ پر محبت کا سلوک روا رکھا ہے یہ الگ بات ہے کہ خود اپنے دفتر خارجہ میں ان کی دوستی کی قدر کرنے والے کم کم ہیں۔

یہ خودنوشت یادوں کی مکمل بازگشت کے عیب سے مملو ہے اور قریشی صاحب نے اپنے تقرر کی ہر جگہ اور ہر مقام کے بارہ میں اپنی چھوٹی بڑی تمام سرگرمیوں کا ریکارڈ بیان کر دیا ہے ایسی باتیں بھی معرض بیان میں آ گئی ہیں جو نہ بیان ہوتیں تو اس کتاب کے مجموعی تاثر پر کوئی برا اثر مرتب نہ ہوتا۔ مثلاً نائیجیریا یا دوسرے افریقین ممالک میں جن پرائیویٹ تنظیموں کے اجلاسوں میں جاتے رہے یا مسجدوں میں جمعہ کی نماز پڑھتے رہے یہ سب ان کے ذاتی افعال تھے اور ان کا ان کی سفارتی زندگی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ سفیر اور ان کی بیگم اگر اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ان کی سوشل تقریبوں میں گئے تو وہ ان کا فرض تھا اور انسان ہر فرض کی ادائیگی کا ذکر ریکارڈ نہیں کیا کرتا۔ ایسی غیر ضروری تفصیلات کی وجہ سے ان کی خودنوشت طویل تر ہو گئی۔ اپنی بیگم اور بیٹی کی سوشل تقریبات میں شرکت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا کیا ضرور تھا؟ کیا قاہرہ میں پاکستانی ملبوسات کی نمائش میں اپنی بیٹی ''ثمینہ قریشی کے ماڈل ہو کر سامنے آنے کا ذکر لابدی تھا؟'' (صفحہ ۴۵۰) میں مانتا ہوں کہ

سفارت کی ذمہ داریوں میں سفیر اور سفیر کے خاندان کی ذمہ داری اہم ہوتی ہے مگر اپنی خودنوشت میں ان کی ثقافتی سرگرمیوں کا بڑھا چڑھا کر ذکر کرنا ذوق سلیم پر گراں گذرتا ہے۔ ان کی سفارت کاری اور طول بیانی کا یہ انداز ان کے ساتھ رہا حتیٰ کہ ''انڈونیشیا سے واپس بھی آ گئے ہیں تو برسوں بعد سابق صدر سوئیکارنو کی جاپانی بیوی سری دیوی کی امریکی پریس میں برہنہ تصویریں چھپنے کا ذکر کر دیا ہے'' (صفحہ ۷۸۵) حالانکہ اس کا کوئی محل تھا نہ موقعہ۔ ساری کتاب کتابت کی غلطیوں سے حیرت انگیز طور پر مبرا ہے مگر آخری ملاقات کی رنگین تصویر آپ نے بڑے اہتمام سے شائع کی وہ صدر سوہارتو کی ہے اس پر سوئیکارنو لکھا ہوا ہے (صفحہ ۶۵۱) گویا کتابت کی اگلی پچھلی ساری کسر نکل گئی ہے۔

بااین ہمہ یہ خودنوشت زبان و بیان کے لحاظ سے اور اپنے مندرجات کے لحاظ سے ہمارے ایک اہم دور کی دستاویز ہے اور بعض ایسی باتیں سفیر صاحب نے بیان کی ہیں جو ہم نے کسی اور سفارت کار کے ہاں نہیں دیکھیں۔ حالانکہ ان کے دور کے کئی سفیروں نے اپنی خودنوشتیں لکھی ہیں اردو میں تو صرف ایک ہی خودنوشت ہماری نظر سے گذری ہے وہ سعد راشد الخیری صاحب کی ہے مگر وہ زبان و بیان کے لحاظ سے اور مندرجات کے اعتبار اس خودنوشت کی گرد کو بھی نہیں پہنچتی۔

آج کل لیاقت علی خاں کے دورہ امریکہ کو طرح طرح کے معانی پہنائے جا رہے ہیں اور یہ کہا جا رہا ہے کہ انہیں امریکہ کی دعوت قبول کرکے پہلے روس جانا چاہیئے تھا۔ ڈاکٹر سمیع اللہ قریشی کی یہ خودنوشت اس ادعا کی تردید کرتی ہے ان کا استدلال ہے کہ روس نے محض رسماً دعوت دی تھی جو ''لیاقت علی خاں نے ۷ جون ۱۹۴۹ کو قبول کر لی تھی اور ایک چھ رکنی وفد بھی نامزد کر دیا تھا جسے ان کے ساتھ دورہ پر جانا تھا۔ اس میں لفٹیننٹ کرنل صاحبزادہ یعقوب علی خاں کا نام بھی تھا۔۔۔ راجہ غضنفر علی خاں نے تہران سے لیاقت علی خاں کو جلد از جلد ماسکو جانے کا مشورہ دیا تھا''۔۔۔ اس کے بعد سوویٹ روس نے ٹال مٹول شروع کر دی۔ کہا گیا کہ لیاقت علی خاں ۱۵ اگست کو ماسکو آ ئیں۔ انہیں بتایا گیا کہ ۱۴ اگست قومی دن ہے اس کے قریب ترین تاریخ ۲۰ اگست مقرر کی جا سکتی ہے مگر روس نہ مانا اور کہا گیا دورہ اکتوبر نومبر تک ملتوی کر دیا جائے'' (صفحہ ۲۱۹ تا ۲۲۱ جستہ جستہ) اور آگے بھی یہ ٹال مٹول جاری رہی۔ اور باقی سب کچھ تاریخ کا حصہ ہے۔ ''روس کا رویہ

شروع سے ہی سرد مہری کا تھا'' (صفحہ ۵۸)

اس خودنوشت میں بہت دلچسپ باتیں بھی ہیں۔ ''زرخرید کالم نویسوں اور دانشوروں کا ذکر ہے'' (صفحہ ۱۳۰) ایوب کے اس نوٹ کا ذکر ہے جو آپ نے ایک سفیر کی رپورٹ پر لکھا تھا ''کیا اس سفیر کا دماغ سوکھ گیا ہے'' (صفحہ ۲۱۰) ہماری فوج نے ضیاء الحق کی سرکردگی میں ''فلسطینیوں سے اردن میں جو کچھ کیا تھا اس کا نوحہ ہے'' (صفحہ ۳۷۳) ''کراچی ائیر پورٹ پر نائیجیریا کے گورنر سٹیٹ بنک کے ساتھ بدسلوکی کا ذکر ہے'' (صفحہ ۲۳۹)

بھٹو کی پھانسی کے خلاف ایک معمر مصری کی اپیل کا چشم کشا ذکر ہے ''جس دن بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائی گئی اور یہ خبر مصر ریڈیو اور ٹی وی نے نشر کی میں نے تاریخ کی ایک اور ستم ظریفی دیکھی۔ میں اپنے دفتر سے نکل کر ہاتھ میں فائل لئے اپنی سوشل سکرٹری کے دفتر کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ ایک ضعیف العمر شخص نے جس کا چہرہ جانا پہچانا لگتا تھا لیکن اس کے چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں میری طرف بڑھا ''سفیر۔۔۔'' اور مجھے روکنا چاہا میں نے کہا جناب ایک منٹ۔۔۔ یہ کہہ کر اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھتا میری سفارت کے ایک مقامی پاکستانی اہل کار نے مجھے روکا ''جناب یہ جنرل نجیب ہیں''۔۔۔۔ ''وہ بھٹو کو پھانسی دے رہے ہیں یہ رہا میرا ٹیلیگرام جنرل ضیاء الحق کے نام تم اسے اپنے وائرلیس کے ذریعہ سے بھیج دو''۔۔۔ ''میں ان کے ساتھ باہر گاڑی تک آیا دروازہ کھول کر انہیں بٹھایا سلام کیا دروازہ بند کیا۔ جب ان کی گاڑی چل دی تو اس فوجی نے جو ہماری سفارت کی حفاظت کے لئے مامور تھا پوچھا یہ کون تھا؟ میں نے بتایا ''جنرل نجیب'' اس نے اپنے کندھے اٹھاتے (اچکاتے) ہوئے کہا ''ہیں وہ کون ہے؟'' (صفحہ ۴۸۱)۔

انڈونیشیا جانے لگے ہیں تو بھٹو فیم کرنل رفیع الدین ان سے ملنے آئے وہ ان دنوں آئی ایس آئی میں تھے اور انڈونیشیا سے واپس آئے تھے ''مجھ سے سٹاف نے کہا رفیع الدین سفارت میں سٹاف سے کہا کرتے تھے تم جانتے ہو میں کون ہوں اس چھڑی سے میں نے بھٹو کو پیٹا ہے'' ۔۔۔ آپ نے کرنل رفیع الدین کا ذکر ضیاء الحق سے کیا تو صدر نے کہا ''اوہ رفیع الدین! اس کا نوٹس نہ لو'' (صفحہ ۵۸۵)

کچھ اچھے لوگوں کا ذکر بھی ہے۔ چونڈہ کے محاذ کے ہیرو (بریگیڈیئر جو اس وقت لفٹیننٹ کرنل تھے بعد میں لفٹیننٹ جنرل ہوئے) عبدالعلی ملک ان کے دوست رہے (صفحہ ۱۷۹ مکرر ۲۰۷)۔ کرمی ٹولہ ایک محب وطن اور نواب آف ڈھاکہ کے خاندان کے ایک پاکستانی سفیر خرم خاں پنی کا ذکر کہ وہ بنگلہ دیش نہیں گئے اور پاکستان میں رہنے اور اپنی بڑی زمینداری کھو دینے کا فیصلہ کیا۔ (صفحہ ۳۵۷)۔ نائیجیریا میں جب بنگلہ دیش بنتے وقت کوئی پریس سفارت کا اخبار چھاپنے کو تیار نہیں تھا "اس وقت ایک محب وطن پاکستانی مولوی انوری نے جن کا اپنا (احمدی) کیمونٹی کا پریس تھا بغیر کسی کہے سنے اپنے آپ پیشکش کی کہ وہ ہمارا پرچہ چھاپ دیں گے چھاپنے کا خرچہ بھی نہیں لیں گے" (صفحہ ۳۰۴)۔ خود ان کا اپنا نمونہ کہ بلغراد میں اپنے سفارت خانہ کے جنگلے پر خود اپنے ساتھیوں کے ساتھ رنگ کر رہے تھے کہ ایک شخص نے ان سے کوئی بات پوچھی اور ان کا جواب سن کر کہا کہا "بطور ایک رنگساز کے تم بہت اچھی انگریزی بولتے ہو" (صفحہ ۵۴۳)

غرض ایسی دلچسپ باتوں کی وجہ سے سفیر صاحب کی کتاب کا تجزیہ طویل ہو گیا مگر وہ ایمان افروز بات جس کا ذکر مجھے آغاز ہی میں کرنا چاہیئے تھا مؤخر ہو گئی۔ جب آپ جاپان میں تھے تو پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں بین الاقوامی عدالت انصاف کے جج کی حیثیت میں ذاتی سفر پر ٹوکیو آئے۔ لکھتے ہیں "مجھے شاہنشاہ کے دفتر کی طرف سے فون آیا کہ شاہنشاہ اور ملکہ ان کو کھانے پر بلانا چاہتے ہیں" وجہ کیا تھی؟ وجہ وہ تقریر تھی جو پاکستان کے وزیر خارجہ نے سانفرنسسکو امن کانفرنس میں کی تھی۔ سفیر سمیع قریشی نے اس تاریخی تقریر کا اقتباس بھی درج کیا ہے "ظفر اللہ خاں نے کہا سوائے ایک تابندہ اور شاندار مثال کے جس نے عرصہ دراز تک مسلمانوں میں روایت قائم کر دی تھی تاریخ شاید ہی ایسی کوئی گواہی پیش کرتی ہو جس میں فاتح نے مفتوح سے بڑی فیاضی کے جذبہ کے تحت ایسا شاندار سلوک کیا ہو جس کی نہایت نمایاں مثال فتح مکہ تھی۔ جسے ہوئے اب تیرہ سو سال ہو گئے ہیں مگر اس کی چمک دمک آج تک ماند نہیں پڑی۔ صلح مکہ نے بیس سال کے خون کے پیاسے دشمنوں کو ایک دوسرے کا دوست اور برادری بنا دیا اس کے برعکس ہمیں جو صلح دی جاتی ہیں اس خرابیوں اور تباہیوں کا ایک سلسلہ پیدا ہوتا ہے۔ جس سے اس

قسم کی صلح کے بیج بوئے جاتے ہیں انہوں نے کہا جاپان سے صلح انصاف اور ملاپ پر ہو نہ کہ انتقام اور ستم پر انہوں نے پیش گوئی کی کہ مستقبل میں جاپان اہم کردار ادا کرے گا چونکہ جاپان کے ڈھانچے میں دوررس سیاسی اور سوشل اصلاحات کی گئی ہیں۔ جس سے ایک تابندہ مستقبل کی توقع ہوتی ہے اور جو جاپان کو دوسری صلح پسند قوموں میں برابری کی بنیاد پر اپنی جگہ بنانے کا اہل بناتی ہیں" (صفحہ ۵۵۱)۔ اگر جاپان کے شاہنشاہ اپنی تمام تر روایات کو بالائے طاق رکھ کر سر ظفر اللہ کو کھانے پر بلانے اور ان کا شکریہ ادا کرنے کی خواہش رکھتے تھے تو یہ امر پاکستانیوں کے لئے فخر کا باعث ہونا چاہیئے۔ سر ظفر اللہ نے تو اپنی انگریزی خود نوشت سرونٹ آف گاڈ میں اپنی روایتی کسر نفسی سے اس کا ذکر سرسری کیا ہے۔ "سان فرانسسکو کانفرنس میں پاکستان محض اپنے سفیر کو بھیجنا چاہتا تھا مگر پنڈت نہرو نے سان فرانسسکو میں جو تقریر کی اس کے پیش نظر لیاقت علی خاں نے وزیر خارجہ سے کہا کہ وہ بنفس نفیس جائیں اور پاکستان کا موقف بیان کریں۔ چنانچہ وزیر خارجہ نے فتح مکہ کی مثال کو مدنظر رکھتے ہوئے جاپان کے ساتھ تعلقات استوار کرنے پر زور دیا" (سرونٹ آف گاڈ صفحہ ۱۷۵)۔ مزید برآں پاکستان نے جاپان سے تاوان جنگ وصول کرنے سے بھی انکار کر دیا حالانکہ ہندوستان نے ایک معتد بہ رقم جاپان سے تاوان جنگ کے طور پر قبول کی تھی اور اس میں پانچواں حصہ پاکستان کا تھا۔

انسانوں اور قوموں کے دل محبت اور دوستی سے جیتے جاتے ہیں اور سفیر ڈاکٹر سمیع اللہ قریشی کی یہ خود نوشت اس کا عمدہ نمونہ ہے۔ امید ہے مستقبل کے مؤرخ کے لئے اس کے مندرجات مفید رہنمائی کا باعث ہوں گے۔ مصنف نے اپنی سفارتی کامیابیوں اور کامرانیوں کو بڑی دیانت داری اور صاف دلی سے بیان کر دیا ہے اور یہ وصف ہمارے عام خود نوشت نگاروں میں الشاذ کالمعدوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے رفقاء کار کے بارہ میں بھی ان کا رویہ رواداری اور دوستی کا ہے اور یہ بات ہمارے بہت کم سفراء میں پائی جاتی ہے۔

یادوں کی دھنک

بریگیڈیئر ریٹائرڈ ظفر اقبال چوہدری نے ''یادوں کی دھنک'' کے عنوان سے ''اپنے تجربات، مشاہدات اور تاثرات پر مبنی کتاب لکھی ہے'' (یادوں کی دھنک صفحہ ۱۹) اور خود ان کے قول کے مطابق یہ کوئی سوانح عمری ہے نہ کوئی تاریخ کی کتاب۔ ظفر اقبال تحریک پاکستان میں سرگرم رہے اور آپ نے بڑی تفصیل سے اپنی سیاسی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کا نقصان انہیں یہ ہوا کہ جب پی ایم اے کے لئے چنے گئے تو ان کی پولیس رپورٹ ان کے حق میں نہیں تھی کیونکہ یہ متحدہ ہندوستان کی پولیس کے برے ریکارڈ میں تھے۔ بڑی تگ و دو سے ان کا ریکارڈ درست ہوا تو انہیں فوج میں کمیشن کا اہل قرار دیا گیا۔

بریگیڈیئر صاحب مشرقی پاکستان میں بھی رہے شاید اسی لئے انہیں جی ایچ کیو میں مشرقی پاکستان سے واپس آنے والے قیدیوں کی واپسی کے انتظامات کا سربراہ بنایا گیا۔ جنرل نیازی کے بارہ میں یہ پڑھ کر بہت حیرت ہوئی کہ جب وہ بریفنگ کے لئے ''جی ایچ کیو میں بلائے گئے تو اپنی کار پر مشرقی پاکستان کی کمان کا سرکاری جھنڈا لگا کر آئے''۔ (صفحہ ۲۸۳)۔ یعنی ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں ہتھیار ڈالنے کی سبکی کے باوجود ان کے دماغ میں کمان کا کیڑا رینگ رہا تھا۔ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو۔

جنرل ضیاء الحق نے اپنے طویل دور سربراہی میں پاکستان اور پاکستان کی فوج کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا وہ ظفر اقبال صاحب کی نظروں میں نہیں وہ تو ضیاء الحق کے دور کو فوج کی قلب ماہیت کا دور کہتے ہیں۔ آپ نے فوج کی اسلامائیزیشن کو مولانا مودودی کے فکر کی توسیع

قرار دیا ہے حتیٰ کہ قائداعظم پر یہ الزام بھی لگا دیا ہے کہ ''قائداعظم نے قیام پاکستان کے بعد مولانا مودودی کو دعوت دی تھی کہ وہ ریڈیو پر اپنے لیکچرز کے ذریعہ اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرہ قائم کرنے کے لئے پاکستانی عوام کی رہنمائی کریں'' (صفحہ ۱۴۳) قائداعظم کی قابل احترام ذات پر اس سے زیادہ گھناؤنا الزام لگانا ممکن ہی نہیں۔ انہوں نے ہرگز مولانا مودودی کو ریڈیو پر آنے کی دعوت نہیں دی تھی یہ کیا دھرا چوہدری محمد علی کا تھا جو حکومت کے سیکرٹری جنرل تھے۔ قائد کی ذات منافقت سے مبرا تھی وہ پاکستان کو دینیاتی مملکت بنانے کے مخالف تھے یہ ضیاء الحق کی ملک دشمنی تھی کہ اس نے پاکستان جیسی سیکولر اسلامی مملکت کو دینیاتی کٹھ ملائی مملکت میں بدلنے کی مذموم کوشش کی اور پاکستان آج تک اس کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔

ظفر اقبال صاحب نے اپنے والد صاحب کے ساتھ پیش آمدہ ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ وہ مانیکا صاحب کے گاؤں میں تعینات ہوئے تو انہیں مانیکا صاحب نے کھانے کی دعوت دی۔ آپ نے کہا میرا باورچی میرے ساتھ ہے اس لئے آپ کی مہمانداری کی ضرورت نہیں۔ رات کو سوئے تو ان کا گھوڑا چوری کروا دیا گیا۔ پولیس نے بتایا یہ آپ کے دعوت قبول نہ کرنے کی سزا ہے۔ چنانچہ بزرگوارم نے توبہ کر کے دعوت کھائی تو گھوڑا بازیاب ہوا۔ (صفحہ ۳۶) ایسی ہی ایک بات ان کے استادزادے جنرل راحت لطیف نے اپنی خودنوشت میں نواب کالا باغ کے بارہ میں لکھی تھی۔ یہ ہمارے نواب زادوں اور جاگیرداروں کی روایتیں تھیں اور وہ ایسی روایتوں کے خلاف چلنے کو اپنی ہتک شمار کرتے تھے۔

بریگیڈیئر صاحب نے جہاد کشمیر کے لئے فنڈ اکٹھا کرنے کے لئے مظفر گڑھ میں ایک مشاعرہ کروایا مگر کوئی شاعر بھی ''معاوضہ لئے بغیر شرکت پر رضامند نہ ہوا'' (صفحہ ۱۰۲) یہ شاید ان کے مرشد مولانا مودودی کے جہاد کشمیر کے بارہ میں فتویٰ کی وجہ سے ہوا ہوگا؟ ہمیں تو اپنے پرانے دوست کشفی ملتانی کا ذکر خیر بہت خوش آیا آپ نے ان کی اس غزل کا حوالہ تو دیا ہے مگر بیت الغزل کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ رند بخشے گئے قیامت میں شیخ کہتا رہا حساب حساب!

اسی طرح ان کے ہاں اپنے ایک اور مرحوم دوست ڈاکٹر نصیر احمد ملہی عرف ''لارڈ ملہی''

کا ذکر پڑھ کر بھی خوشی ہوئی کہ لوگ ان کی خوبیوں کو یاد کرتے ہیں۔ (صفحہ ۴۷) لارڈ ملہی بدوملہی کے بہت بڑے زمیندار تھے۔ اسمبلی میں عورتوں کو ان کا حصہ دینے کی بحث تھی۔ کسی نے کہہ دیا کیا خود آپ نے اپنی بہنوں کو اپنی زمینوں میں مناسب شرعی حصہ دیا ہے؟ لارڈ صاحب نے کہا اس کا جواب اگلے سیشن میں دوں گا اور اگلے سیشن سے پہلے پہلے اپنی تمام جائیداد اور زمینوں کو شرعی وراثتی حصہ کے لحاظ سے بہنوں کے نام منتقل کروا دیا اور اسمبلی میں اعلان کر دیا کہ میں عمل کر چکا ہوں باقی لوگ بھی عمل کریں مگر کوئی ایسا نہ ہوا۔ لوگ تو بہنوں کو جائیداد نہ دینے کے لئے ان کی شادیاں قرآن سے کروا دیتے ہیں تاکہ جائیداد گھر کی گھر میں رہے۔ ہم تو لارڈ ملہی کی اس بات کی وجہ سے ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ۔ افسوس تم کو میرے سے صحبت نہیں رہی۔

بریگیڈیئر صاحب کو اپنے داماد اور اپنی بیوی کی حادثاتی موت کا سامنا کرنا پڑا (صفحہ ۲۴۰) مگر آپ نے بڑے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا ہے ان کے ہاں اتنے بڑے صدمہ پر کوئی جزع فزع نظر نہیں آئی اور یہ بڑی خوبی کی بات ہے۔

ان کی خودنوشت میں کوئی انانیت بھی نہیں۔ ایک سیدھے سادہ صاف دل مسلمان کی سرگزشت ہے اور اسی لئے دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ ان کے سیاسی تجزیے بھی عام آدمی کے تجزیے ہیں اس لئے ان سے کسی گہری سیاسی بصیرت کا تقاضا بھی نہیں کیا جانا چاہیے۔

معراج نامہ

پاکستان کے دیانت دار اور غریب مزاج نگران وزیر اعظم، سب سے بڑے صوبہ کے وزیر اعلیٰ، نیشنل اسمبلی کے سپیکر اور مرکزی وزیر ملک معراج خالد کی خودنوشت سوانح عمری ''معراج نامہ'' کے عنوان سے قیوم نظامی نے مرتب کی ہے۔ اس کا کچھ حصہ ملک صاحب کی اپنی تحریروں پر مشتمل ہے باقی حصہ کو مرتب نے ان کی تقریروں اور مضامین کے اقتباسات سے پر کر دیا ہے۔ اس طرح ملک معراج خالد کی زندگی آئینہ ہو کر سامنے آ گئی ہے۔ کتاب کے اواخر میں ملک صاحب کی وفات پر لکھے گئے مختلف لوگوں کے تاثرات بھی یکجا کر دئے گئے ہیں۔

ملک صاحب لاہور کے قریب ایک غریب زمیندار گھرانہ میں پیدا ہوئے ان کے باپ کی ملکیت کل چھ ایکڑ رقبہ کی زمین تھی۔ ان کے سارے سیاسی عروج و اقتدار کے دوران وہ زمین سوا چھ ایکڑ بھی نہیں ہوئی۔

زندگی کی ابتدا میں دودھ فروشی کر کے اپنا گذارا کرتے رہے اور اس کا ذکر انہیں ناگوار نہیں بہت مرغوب تھا۔ اس بات کا بھی کہ کالج میں بوٹ پہننا لازمی تھا اور میرے پاس بوٹوں کا ایک ہی جوڑا تھا جسے میں شہر میں پہن لیتا اور واپس گاؤں میں پہنچتے ہی اتار دیتا کہ خراب نہ ہو جائے۔ ہم نے یہ باتیں ملک صاحب سے خود سنیں تھیں اب مختلف لوگوں کی روایات کی صورت میں کتاب میں درج ہیں۔

سیاسی زندگی میں نمایاں ایوب خاں کے زوال کے وقت ہوئے۔ اس وقت آپ نے ''ضمیر کا بحران'' نامی پمفلٹ لکھا۔ گورنر موسیٰ نے حقارت سے کہا ''یہ دو ٹکے کا آدمی حکومت کا کیا

بگاڑ سکتا ہے؟'' (معراج نامہ صفحہ ۱۶) مگر وہی دو ٹکے کا آدمی پاکستان کے سب سے بڑے صوبے کا وزیر اعلیٰ بنا۔

بھٹو صاحب سے ان کی واقفیت ان کی ایفرو ایشیائی یکجہتی کی تنظیم کی وجہ سے ہوئی اور جب بھٹو صاحب نے اپنی نئی سیاسی پارٹی بنانا چاہی تو خود کہہ کر انہیں رکنیت کی دعوت دی۔ رکن بنے وزیر و وزیر اعلیٰ رہے مگر اپنے اصولوں پر نہ بھٹو صاحب سے سمجھوتا کیا نہ ان کی صاحبزادی بے نظیر کے ساتھ۔ اصولوں پر سودے بازی کرنا ان کے مسلک کے خلاف تھا۔ پیپلز پارٹی کے منشور میں ''اسلام ہمارا دین ہے'' کی شق ان کی وضع کردہ ہے (صفحہ ۵۲)۔

ملک معراج خالد دکھاوے کے غریب نہیں تھے حقیقتاً غریب اور غریب نواز و پرور تھے۔ ایک بار وزیر اعلیٰ تھے کہ سرکاری گاڑی انہیں لینے وقت پر نہ پہنچی تو رکشہ میں بیٹھ کر دفتر پہنچ گئے (صفحہ ۱۰۲) نگران وزیر اعظم تھے اور حسب عادت سرکاری پروٹوکول سے معرا اپنی پرانی گاڑی میں اپنے دفتر جا رہے تھے کہ پولیس نے ٹریفک روک دیا ان کی گاڑی بھی روک دی گئی کہ گورنر کا سرکاری قافلہ تزک و احتشام کے ساتھ گذر رہا تھا مگر وزیر اعظم کی گاڑی سڑک کے دیگر ٹریفک کے ہمراہ رکی ہوئی تھی۔ قائمقام صدر تھے کہ لاہور میں اپنے گھر کے قریب کیمسٹ کی دکان پر اپنی دوا لینے کو آ گئے۔ کسی شناسا نے پہچان کر کہا جناب آپ تو اس وقت صدر ہیں فرمایا مگر انسان بھی تو ہوں بیمار تھا دوا کی ضرورت تھی اس لئے پیدل آ گیا ہوں تو کون سی قیامت آ گئی ہے؟ کراچی میں ''عبدالستار ایدھی سے ملاقات کرنے کو گئے تو ان کے ساتھ ایک معمولی ہوٹل میں فٹ پاتھ پر بچھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ کر ناشتہ کیا'' (صفحہ ۳۷۵)

بنگلہ دیش کے قیام کے بعد جدہ کانفرنس کے شرکا کو پاکستان کے موقف سے آگاہ کرنے کو گئے۔ وہاں ''احسان الٰہی ظہیر نے شرکا کو بدظن کرنے کی کوشش کی'' (صفحہ ۹۶) ملک صاحب ذرا بددل نہ ہوئے احسان الٰہی ظہیر کو سمجھایا بجھایا اور اپنے موقف کا قائل کر لیا۔

ملک صاحب سے بھی ہمارا دوستانہ رہا اور انور عزیز صاحب سے بھی۔ جب انور عزیز پیپلز پارٹی میں واپس آنا چاہتے تھے تو ان کی ملک معراج خالد نے مخالفت کی (صفحہ ۱۱۹) حالانکہ

بھٹو صاحب ان کے پیپلز پارٹی میں لئے جانے کے حق میں تھے۔ فیصلہ تو بھٹو صاحب ہی کو کرنا تھا اور کر لیا۔ مگر ہم اس بات کے گواہ ہیں کہ انور عزیز اور ملک معراج خالد کے مابین کوئی دشمنی یا عناد پیدا نہ ہوا حالانکہ دونوں کو ایک دوسرے کے موقف کا علم تھا۔ سیاست میں ایسی شرافت ہم نے بہت کم دیکھی۔

بی بی بے نظیر واپس پاکستان آئیں تو پیپلز پارٹی کے بڑے ان کے ہم نوا نہیں تھے۔ وہ اقتدار میں بھی آئیں برطرف بھی ہوئیں ملک صاحب نے اپنے موقف میں کوئی لچک پیدا نہیں کی۔ اس پر بینظیر نے کوئی نہایت ہی نامناسب الزام ان پر عاید کیا اور کوئی فقرہ کہا جس پر ملک صاحب کا ردعمل تھا'' بے نظیر نے جھوٹا الزام لگا کر اللہ کے قہر کو آواز دی ہے'' (صفحہ ۱۶۴) اتفاق یوں ہے کہ بے نظیر کے ابا نے بھی دین کے معاملات میں دخل اندازی کر کے اللہ کے قہر کو آواز دی تھی بیٹی نے بھی یہی کیا اور دونوں الٰہی قہر کا نشانہ بنے۔ فاعتبرو یا اولی الابصار۔

ملک معراج خالد کا یہ معراج نامہ ان کی غریب مزاجی اور غریب پروری کی کہانیوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہمارے ہاں سیاست دان مرتے ہیں تو داستانیں چھوڑ جاتے ہیں ملک معراج خالد پہلا ایسا سیاست دان ہے جس نے داستانیں نہیں کہانیاں چھوڑی ہیں۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

مبالغہ نہ مغالطہ

ایک سابق سکرٹری قانون میاں محمد ارشد کی خودنوشت سوانح عمری ''مبالغہ نہ مغالطہ'' کے عنوان سے ۲۰۰۶ میں لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ میاں صاحب ریاست کپورتھلہ میں پیدا ہوئے ۱۹۴۲ مین گریجوایشن کی۔ قیام پاکستان کے وقت شملہ سکریٹریٹ میں کام کر رہے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد قانون کا امتحان پاس کرنے کے بعد خاصی بڑی عمر میں جوڈیشل سروس میں چنے گئے اور سیشن جج ہوئے بعد کو پنجاب کے سکرٹری قانون کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ میاں صاحب کی خود نوشت کی زبان بھی عام وکیلانہ زبان ہے جس میں کوئی ادبی چاشنی ہے نہ دلکشی مگر ان کی زندگی کے واقعات قاری کو دلچسپی سے لئے چلتے ہیں۔

میاں صاحب نے یہ خودنوشت بیاسی برس کی عمر میں لکھی ہے اور ماشاءاللہ چاق چوبند ہیں اور ذہنی طور پر مستعد۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اس خودنوشت میں بعض ''ناقابل یقین حالات اور واقعات درج کئے ہیں۔ کتاب کا یہ نام اس لئے رکھا ہے کہ میں نے نہ کسی مبالغے سے کام لیا ہے اور نہ ہی کسی مغالطے میں کوئی غلط بات بیان کی گئی ہے'' (پیش لفظ صفحہ ۱) مگر کتاب کا مجموعی مزاج ان کی اس بات کی تصدیق نہیں کرتا۔ کئی ایسی باتیں آپ نے لکھی ہیں جو محض سنی سنائی ہیں اور بیشتر ایسی باتیں بیان کی ہیں جن کے یہ خود گواہ نہیں اور ان باتوں کی تصدیق کا کوئی اور ذریعہ بھی نہیں۔ مثلاً آپ نے رفیق تارڑ پر الزام لگایا ہے کہ ''رفیق تارڑ نے نواز شریف کو سپریم کورٹ پر حملہ کا مشورہ دیا'' (صفحہ ۹۲) رفیق تارڑ کی فطرت سے بعید نہیں کہ انہوں نے ایسا مشورہ دیا ہو مگر ایک سکرٹری قانون کی زبان سے ایسی بات کا بغیر کسی ثبوت کے کہا جانا مناسب نہیں لگتا۔ پھر آپ نے

بھٹو صاحب کی حکومت کا تختہ الٹنے کا پس منظر بیان کرتے لکھا ہے چار جولائی کو ''شام کو کیبنٹ میٹنگ ہوئی اور ضیاء الحق کو تبدیل کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ اس وقت ڈیفنس سکرٹری غلام اسحٰق خاں تھے ان کو حکم دیا گیا یہ فوراً آرڈر جاری کر دئے جائیں اس وقت رات کے دس گیارہ بجے تھے ڈیفنس سکرٹری نے کہا کہ دیر زیادہ ہو گئی ہے کل صبح صبح آرڈر ہو جائیں گے بھٹو یا اس کے کسی وزیر کو یہ علم نہ تھا کہ اندرون خانہ وہ اپوزیشن سے ملا ہوا ہے اور اس کا رابطہ جنرل ضیاء الحق سے ہے لہذا کیبینٹ میٹنگ صبح کے انتظار میں ختم ہو گئی غلام اسحٰق خاں نے فوراً ضیاء الحق سے رابطہ کیا اور کہا now or never۔ اسی رات کارروائی کر لو ورنہ صبح تم تبدیل کر دئے جاؤ گے چنانچہ ضیاء الحق نے مناسب انتظام کر کے صبح تین چار بجے اسلام آباد پر قبضہ کر لیا'' (صفحہ ۱۴۵) ۔میاں صاحب اس وثوق سے یہ بات لکھ رہے ہیں جیسے آپ خود اس کیبینٹ میٹنگ میں موجود تھے؟ قانون سے شدھ بدھ رکھنے والا کوئی بھی شخص ان کی اس بات کو محض افواہ قرار دے گا۔ میاں صاحب کی ایسی بے پر کی اڑائی ہوئی باتوں سے ان کی کتاب کا توثق مجروح ہوا ہے۔

دوسری بات جو قاری کو کھٹکتی ہے وہ میاں صاحب کا واحد متکلم کا لہجہ ہے۔ اپنے استاد کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ ''پروفیسر بنسی لال ہمیں اے کورس اور آنرز پڑھاتا تھا'' (صفحہ ۱۲) یہی لہجہ وزیراعلیٰ کے لئے ہے ''خضر حیات خاں ٹوانہ جو پنجاب کا چیف منسٹر ہوتا تھا'' (صفحہ ۱۵)۔ چوہدری محمد علی بھی ان کی ''بے تکلفی'' سے نہیں بچے'' پاکستان کا نمائندہ چوہدری محمد علی تھا جو پہلے پاکستان بننے پر وزیر خزانہ ہوا پھر کچھ عرصہ کے لئے پاکستان کا وزیر اعظم بنا'' (صفحہ ۳۵)۔ تمہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے؟

اپنے رفقاء اور افسروں کے بارے میں بھی ان کا انداز یوں ہے جیسے ان کی اے سی آر لکھ رہے ہوں۔ ''سول جج ملک اقبال ڈبہ پیر مشہور تھے'' (صفحہ ۱۰۴ مکرر صفحہ ۱۱۲) ''سندھڑ صاحب cynic, dishonest اور شکی مزاج تھے'' (صفحہ ۱۱۱) ''جسٹس مولوی مشتاق گھٹیا اور vindictive تھے'' (صفحہ ۱۳۱) اور ''ان میں اعلیٰ جج بننے کی صلاحیت ہی نہ تھی'' (صفحہ ۱۳۵) ''چوہدری محمد صدیق چیف سکرٹری کو Cynic and miser ہونے کی وجہ سے ''چوڑا'' کہا

جاتا تھا'' (صفحہ ۱۶۹)۔ جسٹس کرم الٰہی چوہان کے بارے میں اور کچھ نہیں کہہ سکے تو یہ کہہ کر اپنے دل کا غبار نکالا کہ ''ان کے والد ایک وکیل کے منشی تھے'' (صفحہ ۱۴۷) یہ بات ہم انہیں بتائے دیتے ہیں کہ ان کے والد سر محمد ظفر اللہ خاں جیسے وکیل کے منشی تھے اور کسی جج کا باپ کسی وکیل کا منشی ہوتو اس کی قانونی قابلیت کم نہیں ہو جاتی۔

یہ جہاں دوسروں کی ذرا ذرا سے بات پر گرفت کرنے کے مرض میں مبتلا ہیں وہاں خود ان کے دوستوں کا بھی یہ حال ہے کہ ''رندھاوا صاحب اوپر کی آمدنی سے ہمیں اچھے ہوٹلوں میں چائے پلایا کرتے تھے'' (صفحہ ۱۱۶) اور یہ خود اپنے ملنے والوں کو رشوت دے کر کام کروانے کے طریقے بتایا کرتے تھے ''میں نے انہیں مشورہ دیا کہ صدر صاحب کے بہنوئی وزیر آباد میں ہیں انہیں کچھ دے دلا کر کام کروایا جائے ورنہ اپیل کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔۔۔۔۔ میں نے انہیں بتایا کہ اس کا لڑکا میاں جہانگیر پرویز جو ایڈیشنل سیشن جج قصور ہے وہ اپنے باپ تک لے جا سکتا ہے۔ میاں جہانگیر پرویز تک پہنچنے کے لئے میں نے اپنے دوست چوہدری محمد نسیم جو قصور میں سیشن جج تھے ان کے نام رقعہ دے دیا۔ چنانچہ وہ میاں جہانگیر پرویز تک پہنچ گئے اور ان کے ساتھ ان کے والد کو وزیر آباد میں جا ملے (معاملہ کے لئے) پچاس ہزار طے ہوئے'' (صفحہ ۱۶۱) اب حیران ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں؟ ایک جج دوسرے جج سے تیسرے جج کے ذریعہ رشوت دلوا رہا ہے؟ کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟ اگر ہماری جوڈیشری کا یہی حال تھا تو میاں صاحب اپنے آپ کو کس طرح پاک دامن ثابت کر سکیں گے؟

بھٹو سے انہیں بہت ہمدردی تھی اس لئے ان کے قتل کے بارہ میں وہی گھسی پٹی باتیں دہرائی ہیں جو ہمارے پریس میں ہر بزرجمہر دہراتا رہتا ہے۔ ججوں کے بارہ میں اور خاص طور سے جسٹس انوار الحق کے نصرت بھٹو کیس کے فیصلہ کے بارہ میں بہت لے دے آپ نے کی ہے مگر اس کا ثبوت ان کے پاس سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ ایک ملٹری کرنل نے جو ان کا رفیق کار تھا جسٹس انوار الحق کے فیصلہ کا وہ کاغذ دکھایا تھا جس پر جج صاحب اپنے ہاتھ سے ضیاء الحق کو آئینی ترامیم کرنے کا حق دیا تھا (صفحہ ۱۸۵)۔ یہ امر ہمارے نامور وکیل ایس ایم ظفر وثوق اور دلیل سے

بیان کر چکے ہیں میاں صاحب نے بغیر حوالہ کے ان کی خوشہ چینی کی ہے۔

ہاں ہمیں ان کی ایک بات بہت خوش آئی کہ مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جسٹس فیرز غلام علی نانا نے کسی کرنل کو جو کسی فوجی عدالت کا سربراہ تھا' توہین عدالت کے الزام میں عدالت میں طلب کر کے اس کو خوب جھاڑا تھا۔ (صفحہ ۴۷) اور یہ ایوب خاں کے مارشل لاء کے زمانہ کی بات ہے۔

غرض میاں محمد ارشد کی یہ خود نوشت بلند بانگ دعاوی کے باوجود ایک عامیانہ سی روداد حیات ہے جس میں سنی سنائی زیادہ ہے دیکھی اور تجربہ میں آئی ہوئی باتیں کم ہیں۔ بہرحال ہمیں خوشی ہے کہ ضعیف العمری میں بھی جج صاحب کے سارے reflexes ٹھیک کام کر رہے ہیں اور وہ توانا اور ٹانٹے ہیں۔ اللہ انہیں لمبی زندگی دے۔

ذوقِ پرواز

ملٹری کاؤنٹس سروس کے ایک ریٹائرڈ ڈپٹی کنٹرولر اور واپڈا کے ریٹائرڈ ڈائریکٹر فنانس جناب محمد صدیق (تہامی حافظ آبادی) کی خودنوشت سوانح عمری ''ذوقِ پرواز'' کے عنوان سے لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب پر سن اشاعت درج نہیں مگر محترمہ ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ کے دیباچہ پر ۲۰۰۳ کی تاریخ درج ہے۔ صاحب کتاب نے اپنا سفر محکمہ ڈاک کے ایک معمولی سے کلرک کی حیثیت سے شروع کیا اور اپنی محنت، دینداری اور دیانت داری کے بل بوتے پر اعلیٰ عہدوں تک پہنچ کر وظیفہ یاب ہوئے۔ طبیعت میں استغنا تھا اس لئے دنیاوی لالچ اور حرص کا شکار بھی نہیں ہوئے۔ استغنا کے سلسلہ میں آپ نے اپنے بچپن کے زمانہ کے ایک حافظ کا ذکر کیا ہے ''نابینا تھے اور سیر چشم۔ مسلمان بھائیوں کو قرآن پاک کی صورتیں یاد کرانے کے لئے ان کے گھروں اور دکانوں پر جاتے۔ ہر روز ایک آیت کا سبق دیتے۔۔۔ ایک بار ان کے سامنے ان کے ابا جان نے حافظ صاحب کی خدمت میں ایک آنہ پیش کیا۔ تو انہوں نے منع کر دیا اور کہنے لگے ابھی میرے پاس کچھ پیسے بچے ہوئے ہیں جب ختم ہو جائیں گے پھر اللہ بندوبست کر دے گا'' (ذوقِ پرواز صفحہ ۵۴)۔ ایسے ہی بزرگوں کے عملی نمونہ سے انسانوں میں دوررس تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔

صدیق صاحب نے اسی سال میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا جس سال ڈاکٹر عبدالسلام اول آئے تھے۔ ''اس سال ساری یونیورسٹی میں اول آنے والا لڑکا ہندو سکھ یا عیسائی طبقے سے نہیں تھا بلکہ عبدالسلام تھا جو بعد میں نوبل لاریٹ بنا۔ اس سال حافظ آباد کے ہندوؤں کو دوہرا غم نصیب ہوا۔ ایک تو یونیورسٹی میں اول آنے والا لڑکا مسلمان تھا دوسرے ضلع گوجرانوالہ کے لاتعداد سکولوں

میں بھی اول آنے والا لڑکا مسلمان نکلا (صفحہ ۴۳) میٹرک کے بعد اعلیٰ تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ ٹائپنگ سیکھی اور کلرکی کی چکی میں پسنے لگے۔

''ذوق پرواز'' کا عنوان آپ نے اپنی خودنوشت کے لئے اس لئے انتخاب کیا ہے کہ آپ نے اپنی ملازمت کے سلسلہ میں دردر کی خاک چھانی ہے۔ ابتدا میں اس کا عنوان ''ابنِ بطوطہ ثانی'' (صفحہ ۳۲۲) رکھنا چاہتے تھے اور بقول خود ''حکایت گو بھی تھے یادوں کا ذخیرہ بھی تھا اور باتوں کی کمی نہ تھی'' (صفحہ ۵۱۴) مگر ہمارے دوست پروفیسر احسان اکبر کے تعارفی شذرہ میں بیان کردہ قول کے مطابق ''داستان حیات جسے وہ اپنی ملازمت کی داستان کے طور پر پیش کر رہے ہیں محض ان کی نوکری کی روداد نہیں یہ ایک زندگی کا سفر ہے جس میں۔۔۔۔ سفید دھاگوں کے ساتھ سیاہ دھاگے بھی چلتے ہیں''۔ اور سیاہ دھاگوں کی ایسی بہت سی مثالیں متن کتاب میں مل جاتی ہیں۔ مثلاً آپ نے ایسی باتیں بھی لکھ دیں کہ ''جماعت اسلامی نے بے شمار قربانیاں دیں جن کی وجہ سے قرارداد مقاصد آئین کا حصہ بنی'' (صفحہ ۱۸۶) اے کاش ان کا تاریخ کا مطالعہ یک رخا نہ ہوتا۔ یہ جماعت اسلامی کی قربانیاں تھیں یا علمائے سو کی سازشیں؟ جن کی وجہ سے ایک اچھی خاصی مملکت خداداد دینیاتی ملا کریسی کا اکھاڑا بن گئی؟

آپ نے جس معاشرہ میں آنکھ کھولی اس میں غریب ارائیں عورتیں بازار میں سبزی بیچ کر اپنی روزی کماتی تھیں مگر ایک پہلوان نے انہیں محنت مزدوری کرنے سے روک دیا۔ صدیق صاحب اس اسلامی غیرت پر بہت خورسند ہوئے۔ ''یوں ایک مردحق آگاہ کی کوشش سے ایک قدیم معاشرتی برائی کا خاتمہ ہوا'' (صفحہ ۴۵)۔ کون سی معاشرتی برائی؟ روزی کمانا یا روزی کمانے میں اپنے مردوں کا ہاتھ بٹانا؟ درحقیقت یہ وہی عورتوں کے ساتھ ناانصافی ہے جو ہمارے نام نہاد دیندار لوگ اسلامی غیرت کے نام پر روا رکھتے چلے آئے ہیں۔ ہمارے ہاں دیہات کی رہنے والی اسی فیصد عورتیں اب بھی کھیتوں میں کام کرتی اور اپنا آذوقہ حاصل کرتی ہیں۔ حیرت ہے صدیق صاحب بیسویں صدی میں ایسی باتیں لکھ رہے ہیں۔

بعض خوب صورت باتیں بھی ان کے ہاں جہاں تہاں نظر آ جاتی ہیں۔ ان کے دادا کے

ایک دوست سائیں حسین شاہ کو ''مرزا مظہر جان جاناں والا آنکھ کا روگ بھی تھا کہ جمالیاتی ذوق کے خلاف کوئی بے ڈھنگی شے دیکھ کر قلبی تکلیف ہوتی تھی اور (حضرت خواجہ) نظام الدین اولیا والا کان کا روگ بھی تھا یعنی موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا'' (صفحہ ۵۷) خود آپ نے بھی آغاز جوانی میں اپنے دوستوں کے ساتھ ''مغنیہ کا گانا سنا'' (صفحہ ۱۲۸) تھا۔ بہ نظر ظاہر ان کے ہاں رواداری ملتی ہے غیر مسلم رفقاء کار کے تعاون اور مدد پر ان کی تعریف بھی کرتے ہیں۔۔۔۔ (صفحہ ۱۶۸) مگر کہیں نہ کہیں ان کے اندر کا ''مولوی'' باہر آ جاتا ہے۔ ہر موقعہ پر قرآن حکیم کا حوالہ دینے اور تشریح وتعبیر وتفسیر کرنے سے بھی انہیں دریغ نہیں۔ ''ضیاء الحق نے سرکاری خرچ پر لوگوں کو جو حج کروائے یہ انہیں ناجائز سمجھتے ہیں'' (صفحہ ۴۵۹) اس کا مطلب ہے سچی بات کہنا چاہیں تو کہہ بھی سکتے ہیں۔

حساب کتاب اور آڈٹ کے محکمہ سے ان کا تعلق ہے جو بیک وقت بدنام بھی ہے نیک نام بھی۔ اپنے ایک ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل کی جرأت کا واقعہ لکھتے ہیں کہ ایک بار سکندر مرزا سکرٹری دفاع نے ایم اے جی کی جواب طلبی کر لی۔ ایم اے جی نے جواب دیا ''ڈیفنس سکرٹری میری جواب طلبی کرنے کا مجاز نہیں میں منسٹری آف فنانس کے ماتحت ہوں وزارت دفاع کے ماتحت نہیں'' (صفحہ ۳۰۴) اسی طرح ایک بار آپ نے سی ان سی جنرل ایوب خاں کی ایک مالی بے ضابطگی پکڑی۔ ''سی ان سی کو سرکاری اور نجی استعمال کے لئے ایک شوفر ڈرون کار کی اجازت تھی۔۔۔ اس کے علاوہ انہوں نے کچھ شوفر ڈرون کاریں اپنے چھ بچوں کے لئے ڈین ٹورسٹس راولپنڈی سے تین ہزار روپے ماہوار فی کار کے حساب سے کرائے پر لے رکھی تھیں اس طرح اٹھارہ ہزار روپے کا ناجائز خرچہ سرکاری خزانہ سے ہو رہا تھا۔۔۔ آٹھ سالوں میں یہ رقم سترہ لاکھ روپے بن گئی تھی'' (صفحہ ۳۳۸)۔ جب انہوں نے کیس کو فارورڈ کرنے پر زور دیا تو ان کے سنیئر افسر نے یہ کہہ کر وہ کیس اپنے پاس رکھ لیا کہ تم نے اپنا فرض پورا کر دیا مگر یہ کیس میری دراز میں رہے گا آگے نہیں جائیگا۔ اور نہیں گیا۔ یہ تو ایوب خاں کی بات تھی ضیاء الحق کے ساتھ کام کرنے والے جنرل خالد محمود عارف نے گواہی دی تھی کہ ''صدر صاحب نے ذاتی اور سرکاری اخراجات میں شاید ہی کبھی امتیاز کیا ہو'' (ضیاء الحق کے ہمراہ۔ صفحہ ۱۷۳) گویا سارا خزانہ ان کا بیت المال تھا اور وہ اس پر

پورا جائز ناجائز تصرف روا رکھتے تھے۔ اسلام کے نام پر کیسے کیسے لوگ ہمارے حکمران رہے اور ان کی باقیات اب بھی ان کی اسلام پسندی کا ذکر کرتے نہیں تھکتی۔

ان کے ایک رفیق کار محمد حسن اپنے نام کے ساتھ احمدی لکھتے تھے۔ ایک جگہ تو آپ نے ان کا ذکر محمد حسن احمدی کر کے کیا مگر پھر انہیں خیال آیا کہ ان کی احمدی لکھنے کی لم بیان کر دینی چاہیئے۔ ایک صفحہ کے فٹ نوٹ میں لکھ دیا کہ ''احمدی اس زمانہ میں اتنے طاقتور اور دلیر تھے کہ اپنے نام کے ساتھ احمدی لکھتے تھے'' (فٹ نوٹ صفحہ ۲۵۸) اس میں طاقت ور ہونے کی کیا بات ہے؟ دلیری والی بات درست ہے اگر آپ خود اتنے دلیر ہوتے تو اپنے نام کے ساتھ جماعت اسلامی کے ساتھ وابستگی کا کوئی قرینہ ضرور بیان کرتے۔ دراصل ہمارے ہاں احمدی کے لفظ کے ساتھ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی چڑ ہے۔ اور تو اور ہندوستان کے ایک چیف جسٹس احمدی تھے۔ ہمارے چیف جسٹس جسٹس نسیم حسن شاہ نے ان سے بھی اپنے نام کے ساتھ احمدی لکھنے کا سبب پوچھ لیا اور اپنے قارئین کی تسلی کے لئے اپنی خود نوشت میں اس کا ذکر بھی فرما دیا کہ جسٹس احمدی، احمدی نہیں تھے احمد آباد کی نسبت سے اپنے کو احمدی لکھتے تھے۔ اور ایران کے محترم صدر جناب احمدی نژاد کے بارہ میں ایک دوست نے مجھ سے پوچھ ہی لیا تھا کہ کہیں جناب احمدی نژاد کسی احمدی خاندان سے تو تعلق نہیں رکھتے؟ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

اور اب ایک ہلکی پھلکی بات۔ آپ نے حسب عادت ایک روز اپنی بے پڑھی لکھی بیوی کے سامنے فارسی کا ایک شعر پڑھ دیا ''جاں نہاں در جسم تو در جاں نہاں۔ اے نہاں اندر نہاں اے جانِ جاں''۔ مجھ سے یہ شعر سن کر بیوی نے بے خیالی میں کہہ دیا اندر نہانا ہے تو اندر نہا لو اور نہا کر جلدی آؤ کہ ناشتہ تیار کروں'' (صفحہ ۳۷۳) امید ہے احسان اکبر کی نگاہ سے یہ شعر تو گذرا ہوگا اور آپ نے اس کے برمحل استعمال پر تہامی صاحب کو داد تو دی ہوگی۔

سوا پانچ سو صفحے کی یہ طول طویل خود نوشت پڑھنے میں دلچسپ ہے اور بعض مقامات پر سبق آموز بھی۔

✓

کچے دھاگے سے بندھی یادیں

''کچے دھاگے سے بندھی یادیں'' جناب توصیف چغتائی کی خودنوشت ہے جو ۲۰۰۵ میں کراچی سے شائع ہوئی۔ توصیف چغتائی کا تعلق علی گڑھ کے مغلوں سے ہے۔ بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بزرگوں کی چھوڑی ہوئی جائیداد خالصے لگ چکی تھی بھرا پرا ددھیال تھا خاندانی حویلی کب تک انہیں پناہ دئے رکھتی۔ بہر حال جوان ہوئے تو ۱۹۶۴ میں پاکستان سدھارے۔ افسانہ نگاری ڈرامہ نگاری اور ریڈیو سے وابستگی میں اپنا وقت گذارتے رہے۔ ایک آدھ فلم کی کہانی بھی لکھی۔ حیدرآباد اور کراچی ان کی تگ و دو کا محور رہے۔ اس لئے ان کی تخلیقی صلاحیتیں اور ان کی شہرت انہی دوشہروں تک محدود ہے۔

اپنے بچپن اور پرکھوں کے وقت کی تہذیب انہیں بہت کشش کرتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ زمینداروں کا رعب داب تقسیم کے بعد تک بھی قائم تھا۔ ان کے دھوبی کا بیٹا آئی اے ایس میں چنا گیا مگر ان کی دھلائی لے کر خود ان کے گھر آیا اور بتایا کہ ''وہ کلکٹر لگ گیا ہے۔'' (کچے دھاگے سے بندھی یادیں صفحہ ۱۸)۔ مگر انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے ایک عزیز پڑھ لکھ گئے تو ڈاکٹر ذاکر حسین نے نوکری کی سفارش کرنے کی بجائے کہا ''اسے پرچون کی دکان کھلوا دیں'' (صفحہ ۳۰) اس سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہاں ایک مسلمان مملکت کا سربراہ یعنی راشٹر پتی تو بن سکتا تھا پولیس میں بھرتی ہونا اس کے لئے ناممکن تھا۔

توصیف صاحب کی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی علی گڑھ کے نابغہء روزگار اساتذہ سے انہیں تلمذ کا موقع کم ملا مگر ان سے جان پہچان ضرور رہی اس لئے ان کا اسم شماری میں نام موجود ہے ان

سے استفادہ کا کوئی تاثر قاری پر پیدا نہیں ہوتا۔ کہنے کو ادیب ہیں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ہمیں یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ ایک کتاب کی اشاعت کے بعد لاہور کے پبلشرز سے اپنی کتاب بیچنے کو کہا تو انہوں نے ٹکا سا جواب دے دیا کہ ''لاہور پبلشرز ایسوسی ایشن کا فیصلہ ہے کہ کہ کراچی کی کتاب لاہور میں نہ بیچی جائے'' (صفحہ ۵۰)۔ ہم نے ایسی پابندی کی بات پہلی بار سنی ہے۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں بعض احباب کے خاکے درج کئے گئے ہیں جو اس بات کے گواہ ہیں کہ صاحب کتاب کو خاکہ نویسی کے فن سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ جن جن لوگوں سے ملے ہیں ان سے ملاقات کی روداد لکھ دی ہے اور بس۔ اس خودنوشت کی زبان بھی عام سی روزمرہ کی زبان ہے۔ جس میں کوئی ادبی چاشنی ہے نہ کوئی ادبی دل آویزی۔

✓

رودادِ قفس

۱۹۶۵ میں ہندوستان اور پاکستان کے مابین کشمیر کی جنگ ہوئی مگر ہندوستان میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے لئے لڑی گئی جنگ کے ایک محاذ کی کہانی مولانا حفیظ نعمانی معاون ایڈیٹر ہفت روزہ ندائے ملت نے روداد قفس کے عنوان سے نومبر ۲۰۰۲ میں شائع کی ہفت روزہ ندائے ملت مسلمانوں کا واحد پرچہ تھا جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے مسلم کے لفظ کے اخراج کے خلاف لکھ رہا تھا۔ ۱۹۶۵ میں ندائے ملت نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نمبر شائع کیا۔ اس پر پولیس حرکت میں آئی اور اخبار کو ضبط کرنے کے علاوہ اس کے ایڈیٹر معاون ایڈیٹر کو گرفتار کر لیا۔ یہ روداد قفس اسی قید و بند کی داستان ہے جس کا ذیلی عنوان ''کچھ آپ بیتی جگ بیتی ہے''۔

اس روداد قفس میں مولانا حفیظ نعمانی نے جیل کے حالات بڑی باریک بینی سے لکھے ہیں۔ اس سے پہلے ہمارے ہاں پاکستان میں بزرگ ادیب حمید اختر کی کتاب ''کال کوٹھری'' چھپ چکی ہے۔ چونکہ برصغیر میں انگریزوں کے بنائے ہوئے جیل مینوئل کے مطابق قیدیوں سے سلوک کیا جاتا تھا آزادی کے بعد بھی ان میں کوئی تبدیلی نہ ہندوستان میں آئی ہے نہ ہمارے ہاں پاکستان میں۔ یہ روداد پڑھتے ہوئے ہمیں حمید اختر یاد آتے رہے کہ انہوں نے کس ژرف نگاہی سے یہ کتاب لکھی تھی کہ پچاس برس کے بعد بھی ان میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ حمید اختر انسانوں کی بہبود کی سوچنے کے جرم میں قید تھے مولانا حفیظ نعمانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے لفظ مسلم نکالنے کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔

یہ کتاب مولانا حفیظ نعمانی اور ان کے والد گرامی کے حالات پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی۔

لکھنے والے نے فرض کر لیا ہے کہ ہر قاری ان کے اور ان کے قبلہ کے مقام و مرتبہ سے واقف ہے اور ندائے ملت کوئی ایسا پرچہ ہے جس سے آگاہ ہونا ہر قاری کا فرض ہے۔ یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ قید و بند سے رہا ہونے کے بعد جب انہوں نے ندائے ملت کے خسارہ کو پورا کرنے کے لئے چندہ کی اپیل کی تو بیس ہزار سے زیادہ روپیہ جمع ہو گیا اور انہیں عطیات روک دینے کی اپیل کرنا پڑی۔

✓

کاروانِ حیات

مؤرخ اسلام حضرت مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی خودنوشت سوانح حیات ''کاروانِ حیات'''' مع قاعدہ بغدادی سے صحیح بخاری تک'' کے عنوان سے نومبر۲۰۰۳ میں دہلی سے شائع ہوئی۔ مولانا اطہر مبارک پوری جید عالم اور دینی صحافت کے مانے ہوئے صحافی تھے اور ان کی عمر اسی دشت کی سیاحی میں بسر ہوئی۔ ابتدائیہ میں لکھتے ہیں ''خوداعتمادی اور خودسازی کی یہ طویل داستان ان عزیز طلباء کی تشجیع وتشویق اور ہمت افزائی کے لئے لکھی گئی ہے جو بہترین ذہن و دماغ لے کر دارالعلوموں اور جامعات کی لق ودق اور شاندار عمارتوں میں جاتے ہیں تاکہ وہاں کے بہترین تعلیمی وتربیتی نظام کے ماتحت لائق وفائق اساتذہ کی توجہ سے علم حاصل کریں مگر عام طور پر ان کو اپنے مقاصد میں ناکام ہونے کے ساتھ اپنی نالائقی اور بدنامی کی سند ملتی ہے کیونکہ ان مدرسوں کے ذمہ داروں کی وجہ سے تعلیم وتربیت کا معیار حددرجہ ناقص بلکہ علم کش ہوتا ہے اور وہ لوگ سارا الزام طلبہ کے سر رکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور اگر کچھ طلبہ اپنے طور پر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے'' (کاروانِ حیات صفحہ۱۹)۔ خود مولانا کی اپنی تعلیم کسی بڑے دارالعلوم میں نہیں ہوئی اور آپ نے جو کچھ حاصل کیا اپنی محنت کے بل بوتے پر حاصل کیا۔

مولانا کو کتابیں اور مخطوطات جمع کرنے کا از حد شوق تھا اور اپنے ذوق کی کتابیں جمع کرتے رہتے تھے بلکہ اپنے معمولی گذارہ میں سے بھی کتابیں خریدنے پر کچھ نہ کچھ ضرور خرچ کرتے تھے اس وجہ سے ان کے ہاں نایاب کتب کا خزانہ جمع ہو گیا تھا۔

مولانا کا یہ بھی کہنا ہے کہ ''میرا حافظہ بچپن میں بہت قوی تھا چھ ماہ اور سال بھر کی عمر کے

کئی واقعات اب تک یاد ہیں'' (صفحہ۲۲) یہ بات پہلی بار کسی خودنوشت میں پڑھنے میں آئی۔ اتنے بچپن کی باتیں حدیثِ متواتر کے طور پر سنتے رہنے سے یاد رہتی ہیں ان کا حافظہ کے قوی ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ قرۃ العین حیدر نے ''ڈھائی برس کی عمر کی باتیں یاد ہونے'' کا دعویٰ کیا تھا (کار جہاں دراز ہے صفحہ۲۸۸)۔ قاضی صاحب اپنے ادعا میں ان سے بھی دو برس آگے نکل گئے۔

صحافت میں اخبار ''زمزم'' لاہور سے اپنے سفر کا آغاز ۱۹۴۷ میں کیا حالانکہ آپ کا خیال تھا کہ ''صحافت طوائفوں کا پیشہ ہے'' (صفحہ۱۲۴)۔ زمزم نیشنلسٹ اخبار تھا۔ اس ہنگامی دور میں آپ نے ایک مضمون لکھا ''جس میں محمد علی جناح کے بارہ میں بعض سخت ترین جملے آ گئے جس پر بڑا ہنگامہ ہوا'' (صفحہ۸۲)۔ اسی طرح امرتسر کے سفر میں ایک دیہاتی سے ان کا سامنا ہوا اس نے انہیں مولوی صورت دیکھ کر ایک حدیث پر بات شروع کر دی۔ وہ قادیانی نکلا مولانا کا ردعمل یہ ہوا ''باطل مذہب والے جاہلوں کو صرف پھنساتے ہی نہیں بلکہ ان کو اپنا مبلغ بھی بنا دیتے ہیں'' (صفحہ ۲۷) اے کاش مولانا اس جاہل دیہاتی کی تشفی کر دیتے اور اس کی غلط فہمی دور کر دیتے۔ مگر مولانا تو اس زمانہ میں ہر ایک کو ٹوکنے کی عادت میں مبتلا تھے ''ایک مسجد میں نماز پڑھنے گیا وہاں ایک صاحب کوٹ پتلون میں جلدی جلدی نماز پڑھ رہے تھے رکوع وسجود بھی ٹھیک سے نہیں کرتے تھے میں نے ان کو ٹوک دیا اس پر وہ مجھ پر برس پڑے اور مولویوں کو بہت سخت سست سنایا میں اپنی اجنبیت اور بے زبانی پر خاموش سنتا رہا'' (صفحہ۲۷)۔ حالانکہ آپ نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ عام زندگی میں آپ ''تالیف ومصلحت سے کام لیتے تھے'' (صفحہ۱۲۷)۔ بے زبانی اس لئے کہ مولانا پہلی بار پنجاب گئے تھے اور انہیں وہاں کا لہجہ اجنبی معلوم دیتا تھا۔ یہ تک ہوا کہ ''مولانا نورالحسن بخاری مجھ سے لکھوا رہے تھے انہوں نے اپنے ملتانی لہجہ میں ''عجب وریاء'' کا جملہ استعمال کیا۔ میں اس کو بالکل نہیں سمجھ سکا اور جوں کا توں ''اُج بریا'' لکھ دیا'' (صفحہ۲۷)۔

لاہور میں مولانا آزاد سے ان کی ملاقات کا ذکر یادگار ہے۔ لکھتے ہیں ''فلیٹیز ہوٹل میں جو لوگ ان سے ملنے گئے ان میں ہیجڑوں کا ایک نمائندہ بھی تھا جو اپنے حقوق کے سلسلہ میں بات

چیت کرنے آیا تھا'' (صفحہ ۸۳)۔ ایک نئی بات ہمیں مولانا کی خودنوشت سے معلوم ہوئی کہ 'مولانا تاجور نجیب آبادی شنکر دیال کالج لاہور کے پروفیسر تھے'' (صفحہ ۸۸)۔ یا تو دیال سنگھ کالج کا نام شنکر دیال کالج تھا یا مولانا کو تسامح ہوا ہے۔ کوشش بسیار سے آخر ایک لاہور کے پرانے جاننے والے ملے انہوں نے بتایا کہ مولانا کو یقیناً تسامح ہوا ہے۔ دیال سنگھ کالج کا نام ابتدا ہی سے دیال سنگھ کالج تھا اور یہ کالج اور اس کے ساتھ دوسرے دو تین ادارے دیال سنگھ ٹرسٹ کے زیر اہتمام چلتے تھے۔

البتہ مولانا کی یہ بات کسی تسامح کا نتیجہ نہیں کہ ''مجلس احرار اسلام کے دفتر کے اوپر کی منزل پر انجمن اصلاح چار سو بیساں کا دفتر تھا'' (صفحہ ۹۰) اور اسی انجمن اصلاح چار سو بیساں کے ایک صدر اسمبلی کے الیکشن میں چنے گئے تھے اور ''مسلم لیگ میں شامل ہو کر عزت مآب وزیر محمد کہلانے لگے'' (لاہور کا جوذکر کیا۔۔۔۔آپ بیتی جگ بیتی از گوپال متل صفحہ ۱۱۲)۔

مولانا نے متبحر عالم مولانا عبدالعزیز میمنی کے بارہ میں لکھا ہے کہ ''مولانا میں تعلّی بہت تھی کہتے تھے مجھے عربی کے دو لاکھ شعر یاد ہیں'' (صفحہ ۱۵۱)۔ یہ بات تعلّی کی نہیں اس بات کی گواہی دینے والے ان کے شاگرد ہی نہیں دنیا بھر کے مستشرقین ہیں۔ خود اپنا حال یہ ہے کہ مولانا نے اپنے مناقب میں مولانا صبغۃ اللہ مدراسی کا قول درج کیا ہے کہ ''وہ مجھے ابوذر غفاری سے تشبیہہ دیتے تھے'' (صفحہ ۱۷۳) ابوذر غفاری جیسی صفات کے حامل شخص کو دوسروں پر بے جا تنقید زیب نہیں دیتی۔

مولانا کی اس خودنوشت میں بے شمار رجال کا ذکر ہے جو صرف اسماء الرجال کی فہرست معلوم دیتا ہے اے کاش ان کے ہاں علماء کے علمی کارناموں کا زیادہ ذکراذکار ہوتا۔

✓

آشرم

بہار یونیورسٹی کے ایک سابق وائس چانسلر جناب شکیل الرحمٰن' کی خودنوشت ''آشرم'' کے عنوان سے موڈرن پبلشنگ ہاؤس دریا گنج دہلی سے مارچ ۱۹۹۲ میں شائع ہوئی۔ شکیل الرحمٰن کا کہنا ہے کہ ''اس کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ وہ اپنی آنکھوں کے اندر رہے اپنے وجود کے آشرم میں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ زندگی کے سفر میں اس نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ زندگی میں رہتے ہوئے بھی زندگی کرنے والوں سے الگ ہے اسی طرح جس طرح امام تسبیح میں ہوتا ہے مگر شمار میں نہیں ہوتا'' (آشرم صفحہ ۱۱)۔ اس خودنوشت کا یہی اسلوب ہے جس کی وجہ سے ان کی زندگی کے وہ کوائف جن کا بیان پڑھنے والوں کو لکھنے والے کے وجود اور حالات سے آگاہی دیتا ہے اس خودنوشت میں موجود نہیں۔ خودنوشت لکھنے کا ایک بڑا محرک یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا اپنے تجربات حیات کو اس طرح معرض بیان میں لاتا چلا جائے کہ اس کو نہ جاننے والا بھی اس کے حالات اس کے رجحانات ومیلانات اس کی کامیابیوں ناکامیوں اس کے خیالات ونظریات سے آگاہ ہوتا چلا جائے۔ جاننے والے تو اسے جانتے ہیں ایک ایسا قاری جو اس کو نہیں جانتا اس پر اپنی شخصیت کا انکشاف کرنا خودنوشت لکھنے والے کا اولیں محرک ہوتا ہے اور ہونا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں یہ خودنوشت ایک انتہائی محدود و مجمل سرگزشت ہے ناخوشگوار اجمال تو اس میں نہیں ہے مگر تفصیلات ایسی ہیں جن کا بیان لکھنے والے کو تو مرغوب رہا ہے قاری کے لئے کسی دلچسپی یا کشش کا باعث نہیں بنتا۔ اس خودنوشت کا آغاز اپنے وطن کے سفرِ بازگشت سے ہوتا ہے۔ اپنے وطن مالوف پہنچتے ہی اس کی یادیں اس کے بچپن جوانی کے ماحول کو زندہ کر کے اس کے سامنے لے آتے ہیں۔ اس کی

آبائی حویلی ماں باپ عزیز رشتہ دار لواحقین کے ساتھ ساتھ درختوں پرندوں اور مناظر فطرت سے اس کا لگاؤ قاری کو کشش ضرور کرتا ہے مگر یہ باتیں بار بار بیان ہوتی اور اپنی کشش کھو بیٹھتی ہیں۔

ان کے ابا اپنے وقت کے مانے ہوئے وکیل تھے گھر میں خوش حالی کا دور دورہ تھا پہلے ماں کا انتقال ہؤا پھر باپ اٹھ گئے شکیل الرحمن نے اپنی آنکھوں سے اپنے اثاثے بٹتے اور تقسیم ہوتے دیکھے اس سے ان کے ذہن کو ایسا دھچکا لگا کہ انہیں دنیا والوں سے یک گونہ بے اعتنائی ہو گئی۔ تنہائی میں رہنا انہیں اچھا لگنے لگا۔ ان کے سوچنے سمجھنے کی حس بیدار ہو گئی۔ اپنی اس قبل از وقت سوچ کی عادت کی بدولت یہ کچھ زیادہ ہی تنہائی پسند بن گئے لگتے ہیں اور یہ عادت ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

بچپن میں اساتذہ بھی ایسے ملے جن سے استفادہ کم کیا مار پیٹ زیادہ وصول کی۔ ان کے ایک ''استاد تو ایسے تھے کہ اتنا پیٹتے اتنا پیٹتے کہ خود بیہوش ہو جاتے'' (صفحہ ۹۳) سکولوں کالجوں کی تعلیم کی زیادہ تفصیل آپ نے بیان ہی نہیں کی البتہ اپنے زمانہ کے جید ادبا اور شعرا کا ذکر ان کے ہاں ساتھ ساتھ چلتا ہے کیونکہ ان کے ایک چچا مشاعروں کے شوقین تھے۔ ایم اے کرنے کا ذکر تو ہے پٹنہ یونیورسٹی کے اساتذہ میں سے کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر سید اختر احمد اورینوی کا ذکر ہے کہ اردو اور فارسی کا شعبہ علیحدہ ہو گیا تو اختر اورینوی شعبہ اردو کے صدر بنے اور ''شعبہ اردو کی نئی تاریخ شروع ہوئی'' (صفحہ ۲۲۶) بہار میں اردو کی ترویج واشاعت میں ڈاکٹر سید اختر اورینوی کا جو مقام ہے اور بہار میں اردو ادب کی تاریخ کو محفوظ کرنے کا جو عظیم کام کیا ہے وہ اختر اورینوی ہی نے کیا ہے۔ ہمیں تو اس بات کی خوشی ہے کہ بہار کے ہی کسی شخص نے ان کی خدمات عظیم کا ذکر تو کیا ہے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ریسرچ کے سلسلہ میں مجھے پٹنہ یونیورسٹی کی لائبریری سے کچھ حوالے درکار تھے۔ اس زمانہ میں ہندوستان و پاکستان کے مابین کتابوں کی ترسیل کا سلسلہ منقطع تھا۔ میری اور میرے استاد پروفیسر سید وقار عظیم صاحب کی تحقیق کے مطابق مطلوبہ کتب پٹنہ یونیورسٹی لائبریری میں موجود تھیں مگر ان تک رسائی ایک مسئلہء عظیم تھا۔ میں نے ڈاکٹر اختر اورینوی صدر شعبہ اردو کو ایک خط لکھا اور درخواست کی کہ ان حوالوں کی دستیابی میں میری مدد

کریں۔ کہاں ایک یونیورسٹی کا صدر شعبہ کہاں ایک معمولی ریسرچ سکالر مگر ڈاکٹر صاحب نے بواپسی ڈاک جواب دیا کہ آپ کی مطلوبہ کتب یہاں موجود ہیں میں نے اپنے ریسرچ سکالرز میں سے دو سکالرز کے ذمہ لگا دیا ہے کہ وہ مطلوبہ حوالے نقل کر کے آپ کو بھیج دیں۔ وہ زمانہ فوٹو کاپی کا زمانہ نہیں تھا۔ میرے مطلوبہ حوالوں کی ضخامت کوئی چالیس صفحات کے قریب تھی۔ وہ حوالے ڈاکٹر صاحب کے تصدیق نامے کے ساتھ تین مہینہ کے عرصہ میں میرے پاس پہنچ گئے اور میرے تحقیقی کام میں بہت ممد ثابت ہوئے۔ استاذی المحترم پروفیسر وقار عظیم کو جب میں نے مطلوبہ حوالے دکھائے تو ان کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو آ گئے کہ ایک استاد نے کس طرح ایک ریسرچر کی مدد کی ہے۔ میرا ان سے کوئی تعارف نہیں تھا محض ایک ریسرچر کے استمداد پر اس طرح دل و جان سے اس کی مدد کرنا عظیم انسانوں کا کام ہوتا ہے۔ میری اختر اورینوی صاحب سے بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی۔ شکیل الرحمن صاحب نے ان کی شخصیت کے باب میں جو کچھ لکھا ہے اسے تشکر کے جذبات کے ساتھ درج کرتا ہوں۔ ''پروفیسر اختر اورینوی سے ملا۔ اختر صاحب سے اس کی پہلی ملاقات تھی۔ بہت اچھی گفتگو کرتے تھے بڑی صاف اور پیاری زبان تھی۔ لفظوں اور جملوں کا آہنگ متاثر کرتا تھا۔ کئی موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ ترقی پسند تحریک ترقی پسند شعرا مذاہب عالم اسلام وغیرہ۔ ترقی پسندوں کے مخالف تھے بہت تیز لہجے میں مخالفت کرتے تھے لیکن اظہار میں توازن قائم رہتا آواز بھی متاثر کرتی اور فصاحت و بلاغت بھی۔ مغربی تہذیب و تمدن پر سخت نکتہ چینی اور تنقید کرتے مسلمانوں کی تاریخ کی عظمت سے باخبر کرتے اسلام کی جمہوریت اور اللہ کے احکامات پر اس طرح اچانک باتیں کرنے لگے جیسے سامنے بیٹھے ہوئے کافر کو اسی وقت مسلمان بنانا چاہتے ہوں۔ بہت پیاری اور دلچسپ شخصیت تھی ان کی۔ جی چاہتا تھا وہ بولتے جائیں اور وہ سنتا جائے'' (صفحہ ۲۱۱۔۲۱۲)

اس خودنوشت کا آخری باب یعنی بتیسواں باب بھی پہلے باب کی طرح فلسفیانہ موشگافیوں کا باب ہے اور اسی باب پر اس خودنوشت کا اختتام ہو جاتا ہے۔ ''۱۹۵۳ میں اسے اچانک محسوس ہونے ہؤا کہ وہ انتہائی ارتقاعی روحانی تجربے حاصل کرنے لگا ہے ذہنی اور اخلاقی

حالت جیسے آہستہ آہستہ اوپر اٹھنے لگی ہو باطنی ارتعاشات کی شدت ایسی۔۔۔'' (صفحہ ۱۷۲)
مجھے یوں محسوس ہوتا ہے ان کی سرگزشت ان کے استاد جمیل مظہری صاحب کے اس شعر کی تصویر ہے۔ بہ قدرِ پیمانۂ تخیل غرور ہر سر میں ہے خودی کا۔ اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا۔

ان کی علمی اور ادبی فتوحات کا پتہ ان اشتہارات سے چلتا ہے جو اس کتاب کے اواخر میں درج ہیں ورنہ یہ خودنوشت ان کے کسی علمی کام پر روشنی نہیں ڈالتی اور یہ بڑا اسقم ہے۔ غالب کے کئی نسخے ان کے استاد نے انہیں نذر کئے تھے تو کم از کم غالب کے بارہ میں ان کی قابل قدر تصنیف ''مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات'' کا ذکر تو کہیں نہ کہیں آ جانا چاہئے تھا۔

✓

مرد آہن

ہمارے کتاب دوست اور ادب دوست کرمفرما عبدالوہاب خاں سلیم نے جو خودنوشتیں ہمیں امریکہ سے بھجوائیں ان میں ایک خودنوشت تھی ''مرد آہن'' اور لکھنے والے تھے جناب عبادت اللہ خاں۔ ہم نے کبھی عبادت اللہ خاں کا نام سنا تک نہیں تھا اس لئے ہم نے دو جلدوں کی اس ضخیم خودنوشت کو ایک طرف ڈال دیا کہ اہم خودنوشتیں پڑھنے کے بعد ان کی آہنی باتیں بھی سن لیں گے اتنی جلدی کیا پڑی ہے۔ پھر سرسری نظر میں اس کتاب میں دوسروں کے اشعار کی اسناد کم نظر آئیں کسی حق نواز اختر کے شعر سند کے طور پر نظر پڑے۔ یہ حق نواز اختر کا نام بھی ہمارے لئے اجنبی نام تھا۔ بارے اس اجنبی کی خودنوشت پڑھنا شروع کی تو اجنبیت کی گرد چھٹنا شروع ہوئی۔ ہم نے جائزہ لکھنے کے بعد حسبِ عادت حق نواز اختر صاحب کو بھیج دیا تا کہ انہیں اندازہ ہو جائے کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا۔ ان کا جواب آیا تو تو عقدہ کھلا کہ یہ خودنوشت حق نواز اختر صاحب کی اپنی لکھی ہوئی ہے، عبادت اللہ خاں صاحب نے فقط اسے مرتب کیا ہے اور اس حد تک مصنف پر حاوی ہو گئے ہیں کہ اصل حق نواز پس پردہ چلے گئے ہیں۔ بہر حال سٹیل مل کے انتظام و انصرام کی وجہ سے اس خودنوشت کا عنوان ''مرد آہن'' نہایت مناسب عنوان لگتا ہے۔ یوں وہ اپنی ذات وصفات کے حوالے سے بھی آہنی عزم واستقلال کے مالک ہیں۔ ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم۔ رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن۔

حق نواز اختر سرگودھا کے ایک غریب وغیور گھرانے میں پیدا ہوئے غربت میں تعلیم پائی۔ ہمارے پرانے دوست انور عزیز کے کلاس فیلو اور ہمارے بزرگ دوست پروفیسر غلام

جیلانی اصغر کے شاگرد رہے۔ اور اب جیلانی صاحب کا ذکر آ گیا ہے تو سرگودھے میں پیدا ہونے والی ایک ہنگامی حالت کا ذکر بھی کر دیں۔ ہم اتفاق سے اس روز سرگودھے میں حاضر تھے اور جیلانی صاحب کے ساتھ ان کے کلب روڈ والے گھر میں بیٹھے تھے۔ یکا یک گھر کے باہر ہنگامہ سا سنائی دیا۔ معلوم ہوا محکمہ ٹیلیفون والے ہیں اور جلدی جلدی افراتفری میں عارضی انتظام کر کے جیلانی صاحب کے گھر میں ٹیلیفون نصب کرنے کی سعی میں مصروف ہیں۔ جیلانی صاحب نے اپنے نئے گھر میں منتقل ہوتے وقت کوئی پانچ سال پہلے ٹیلیفون لگوانے کی درخواست محکمہ کو دی تھی جو سرد خانہ میں پڑی پڑی ٹھٹھر رہی تھی۔ اب اچانک ایک ٹیلیفون کے محکمہ کے افسر اندر آئے اور جیلانی صاحب کے ہاتھ میں ایک نیا نویلا ٹیلیفون ریسیور دے کر کہنے لگے ''سر سکرٹری مواصلات لائن پر ہیں ان سے بات کیجئے۔'' جیلانی صاحب جیلانی صاحب ہیں فرمانے لگے میں کسی سکرٹری مواصلات کو نہیں جانتا اور میں پرائے فون سے کسی پرائے آدمی سے بات نہیں کر سکتا۔ اس پر ٹیلیفون والے صاحب نے گھگھیا کر کہا سر سکرٹری مواصلات آپ کے پرانے شاگرد حق نواز اختر ہیں اور وہ فوری طور پر آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ جیلانی صاحب نے فون پر اپنے مخصوص انداز میں حق نواز اختر صاحب سے بات کی معلوم ہوا ان کا مجموعہ کلام چھپ چکا ہے اور وہ اس کی رونمائی کے لئے پروفیسر غلام جیلانی اصغر کو زحمت دینا چاہتے ہیں۔ خیر بات ہو گئی۔ مگر جیلانی صاحب کا دن کا چین اور رات کا آرام حرام ہو گیا سارا شہر ٹیلیفون کی درخواستیں لے کر ان کی کوٹھی کے گرد جمع ہو گیا۔ حق نواز اختر صاحب نے اپنے سکرٹری مواصلات ہونے کے زمانے کے کارناموں میں صرف یہ بیان کیا ہے کہ آپ کے زمانہ میں ''انڈر گراؤنڈ کیبلز کی بجائے فائبر آپٹک کا جدید نظام پاکستان میں رائج کیا گیا اور موبائل ٹیلیفون سسٹم پاکستان میں لایا گیا'' (مرد آہن جلد دوم صفحہ ۲۳۸) مگر ہم انہیں یاد دلائے دیتے ہیں کہ ان کے کارناموں میں اپنے استاد پروفیسر غلام جیلانی اصغر کو ٹیلیفون کنکشن دلا دینا بھی شامل ہے۔

حق نواز اختر صاحب نے پروفیسر غلام جیلانی اصغر صاحب کا تعارف یوں کروایا ہے کہ ''غلام جیلانی اصغر زمیندار کالج گجرات سے ۱۹۴۸ میں گورنمنٹ ڈی مانٹ مورنسی کالج سرگودھا

منتقل ہوئے۔ انگریزی کے استاد تھے مگر شاعری اردو میں کرتے تھے، میری شاعری کے محرک اور میری انگریزی زبان سے دلچسپی کا کریڈٹ بڑی حد تک ان کو جاتا ہے۔ اور سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کیونکہ وہ شکل سے کسی باغی قبیلہ کے سردار یا سندھ کے نامی گرامی ڈاکو لگتے تھے لہجہ خواہ وہ اردو بول رہے ہوں یا انگریزی ٹھیٹھ تلہ گنگ والا۔ شیکسپیئر پڑھاتے ہوئے بھی پنجابی زبان کے پنکچر لگا دیتے تھے مخلص مشفق اور میں تو کہوں گا دریا دل'' (صفحہ مرد آہن حصہ اول صفحہ ۶۰)۔ غلام جیلانی اصغر سرگودھا کے کسی ایک شخص کا نام نہیں سرگودھے کے ادارہ کا نام ہے۔ اختر صاحب خوش قسمت ہیں کہ انہیں ان جیسا استاد نصیب ہوا۔

عبادت اللہ خاں صاحب نے انگریزی میں ایم اے کیا۔ اسلامیہ کالج میں پروفیسر حمید احمد خاں کے رفیق کار بھی رہے۔ ہمت دیکھئے کہ غربت میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان پہنچ گئے اور وہاں سے ڈگری تو کیا لاتے ایک عدد انگریز رفیقہ حیات لے آئے۔ وہیں لندن میں پاکستانی سفارت خانہ میں کلرکی کے دوران سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا اور کسٹم سروس میں چنے گئے۔ ہوتے ہوتے اکنامک پول میں منتخب ہوئے اور سکرٹری کے مرتبہ تک پہنچ کر وظیفہ یاب ہوئے۔ پاکستان سٹیل مل کا مضبوط بنیادوں پر قیام ان کا سنہری کارنامہ ہے۔

قیام پاکستان سے قبل مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن میں کام کرتے رہے۔ سرگودھا خضر حیات خاں ٹوانہ کا مرکزی گھر تھا پھر بھی یونینسٹ پارٹی کی بجائے مسلم لیگ سے وابستہ رہے۔ جب ان کی تعلیم میں رکاوٹ پڑنے کا خدشہ ہوا تو نواب ممدوٹ سرگودھا آئے ہوئے تھے آپ نے فرمایا ''کوئی بات نہیں اس طالب علم کو ہم جناح ممدوٹ سکالرشپ دے کر پڑھائیں گے'' (صفحہ ۴۷) یہ بات جس طرح ہوا میں کہی گئی تھی اسی طرح وہ جناح ممدوٹ سکالرشپ ہوا میں اڑ گیا۔ تب ہمیں اندازہ ہوا کہ نواب ممدوٹ پرانے وعدہ خلاف ہیں۔ باؤنڈری کمشن کے سامنے مسلم لیگ کا کیس پیش کرنے کو قائد اعظم نے سر ظفر اللہ کو لاہور بھیجا اور یقین دہانی کروائی کہ سارا کیس لاہور مسلم لیگ نے تیار کر لیا ہوگا آگے سر ظفر اللہ کی خود نوشت سے اقتباس ''لندن میں کم سے کم عرصہ ٹھہرنے کے بعد میں کراچی ہوتا ہوا اپنے اندازے سے ایک دن پہلے لاہور پہنچ گیا۔ نواب صاحب ممدوٹ

اور بہت سے احباب سٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔۔۔نواب صاحب نے فرمایا کل ڈھائی بجے بعد دو پہر میرے مکان پر تمہاری ملاقات ہمارے وکلا کے ساتھ ہوگی۔۔۔میں بر وقت ممدوٹ ولا پہنچ گیا۔ وہاں بہت سے وکلا اصحاب موجود تھے۔۔۔۔میں نے وکلا صاحبان سے دریافت کیا کہ آپ میں سے کون کون صاحب اس کیس میں میرے رفیق کار ہیں؟ اس پر ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صاحب نے فرمایا کس کیس میں؟ میں نے کہا حد بندی کے کیس میں جس کے لئے میں حاضر ہوا ہوں۔خلیفہ شجاع الدین صاحب نے فرمایا ہمیں تو کسی کیس کا کوئی علم نہیں ہم سے تو صرف یہ کہا گیا تھا تم کیس کی پیروی کے لئے آئے ہو اور اس کمشن کے روبرو مسلم لیگ کا کیس تم پیش کرو گے۔اور تمہیں ملنے کے لئے ہمیں اس وقت یہاں آنے کی دعوت دی گئی ہے۔میں نے نواب صاحب کی طرف استفساراًدیکھا تو وہ صرف مسکرادئے۔۔۔میں نہایت سراسیمگی کی حالت میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وکلا صاحبان سے معذرت خواہ ہوا کہ وقت بہت کم ہے اور مجھے کیس کی تیاری کرنی ہے۔اس لئے رخصت چاہتا ہوں۔نواب صاحب میرے ساتھ ہی کمرے سے باہر آئے۔۔۔(میں نے کہا) کل صبح سے مجھے کچھ نہ کچھ لکھوانا ہوگا آپ یہ انتظام فرمائیں کہ دو اچھے ہوشیار تیز رفتار سٹینو گرافر میرے پاس پہنچ جائیں اور وہ کاغذ پنسل قلم دوات ٹائپ کی مشینیں وغیرہ تمام دفتری سامان لیتے آئیں تا کہ میں تحریری بیان لکھواسکوں نواب صاحب نے فرمایا تم فکر نہ کرو زود نویس اور سب دفتری سامان صبح سات بجے تمہاری قیام گاہ پر موجود ہوگا۔۔۔۔نواب صاحب کے موعود زود نویس بحث کے آخر تک ہمیں میسر نہ آئے نہ ہی نواب صاحب کی طرف سے ہمیں اطلاع ملی کہ وہ کیا ہوئے'' (تحدیث نعمت صفحہ ۳۱۵ تا ۸۱۵ جستہ جستہ) اس آڑے وقت میں خواجہ عبدالرحیم کمشنر راولپنڈی کام آئے جو مہاجرین کی بحالی کے کام کے سلسلہ میں لاہور میں مقیم تھے انہوں نے اپنے سٹینو گرافر اور مطلوبہ سامان سر ظفر اللہ کی خدمت میں حاضر کر دیا۔فجزاہم اللہ احسن الجزاء۔

کسٹم سروس میں تو رشوت کا دور دورہ رہتا ہے مگر خان صاحب اس سے بچے رہے۔ کھیوڑہ میں تھے کہ ان کے ایک افسر دورہ پر آئے۔آگے ان کی زبانی سنئے'' کہنے لگے تم پول میں سے اپنا حصہ کیوں نہیں لیتے ہو؟ میں حیران رہ گیا اور سمجھ میں نہیں آیا کیا کہوں۔ بڑی دیر کے بعد

ہکلاتے ہوئے کہا مجھے روپے پیسے کی ضرورت نہیں تنخواہ ہی میں گذارہ ہو جاتا ہے مجھے شرم آرہی تھی اور وہ بے باکی سے فرما رہے تھے نہیں نہیں روپے پیسے کی سب کو ضرورت ہوتی ہے۔تمہارے پاس اپنی گاڑی نہیں اچھی سی کار خرید لو'' میں نے کہا نہیں سر سرکاری جیپ کافی ہے اور مجھے ذاتی طور پر کہیں آنا جانا ہوتا نہیں۔۔۔اچھا تو تم نہیں مانو گے؟ پھر تو تمہارا حصہ بھی مجھے لینا پڑے گا'' (صفحہ ۱۷۱)۔اس دیانت داری کا نتیجہ کتاب کے آخر میں درج ہے ''ٹوٹل پونجی یا اثاثہ صرف ایک فلیٹ ہے جو کبھی وہ بیگم کے نام گفٹ کرتے ہیں اور بیگم بچیوں کو نوازنے کے لئے محفوظ رکھتی ہیں'' (صفحہ ۳۳۴)۔یہ اس شخص کے حالات ہیں جو پاکستان سٹیل مل کا چیئرمین رہا اور جس نے اپنے وقت میں کروڑوں روپے کے ٹھیکے لوگوں کو دئے۔

احوال الرجال کے سلسلہ میں آغا حسن عابدی کا ذکر۔'' آغا حسن عابدی سے ملاقات ہوئی تو وہ یو بی ایل کے صدر تھے۔اور بینک کے بونس شیئرز کے اجرا کے سلسلے میں مجھ سے ملے۔ میں نے ان کی درخواست رد کر دی کیونکہ میرے خیال میں ان کے بینک کے ریزرو اس وقت ناکافی تھے۔عابدی صاحب نے کافی دلائل دئے میں نہ مانا۔۔۔۔بعد میں ایڈوائزری کمیٹی نے بونس ایشوز کی اجازت دے دی۔عابدی صاحب پھر بھی میرا شکریہ ادا کرنے آئے۔۔۔آغا حسن عابدی کچھ سال بعد بی سی سی آئی کے صدر اور مختار کل تھے ایک صاحب کو کسی کام سے میں نے ان کے پاس بھیجا۔اور لکھا'' اگرچہ نامناسب ہے کہ ایک دو ملاقاتوں کی بنا پر آپ سے توقع رکھوں کہ میرے دوست کو ملازمت دے دیں گے''۔تو ان صاحب سے آغا صاحب کہنے لگے'' اختر صاحب کو کہہ دیجئے کہ میں ان کا شمار اپنے دوستوں میں کرتا ہوں'' (جلد اول صفحہ ۲۵۲)۔

اختر صاحب روس کے دورے پر گئے ایک واقعہ ان کی زبان سے سنئے۔''لینن گراڈ کی مسجد میں ایک عیسائی عورت بھی اپنے طریق سے عبادت کر رہی تھی'' (جلد دوم صفحہ ۵۲) اس سے ان کا ایمان تازہ ہوا مگر ہم سوچ رہے ہیں کہ آج ہمارے وطن میں اگر کوئی غیر مسلم کسی نام نہاد مسلمان کو کسی مسجد کے قریب بھی جاتا ہوا نظر آ جائے تو اس پر توہین رسالت کا مقدمہ قائم ہو جاتا ہے؟ ہم کس نبی کی امت تھے اور کن جھمیلوں میں پھنس گئے ہیں؟

اور اب محافظ اسلام ضیاء الحق کی آخری سفارش۔ ''جنرل ضیاء الحق سے میری آخری ملاقات ان کی وفات سے ایک دن قبل یعنی ١٦ اگست ١٩٨٨ کو ہوئی۔ اسی شام میں لاہور دورہ پر چلا گیا۔ دوسرے دن صبح کرنل عجائب کا فون آیا کہ صدر صاحب نے میرے ذمہ ایک کام لگایا ہے وہ کام یہ ہے کہ ایک صاحب کا ٹیلیفون کا بل بہت زیادہ ہے اور آپ کے محکمے نے نادہندگی میں اسے کاٹ دیا ہے۔ صدر صاحب کا حکم ہے کہ ایک تو بل کو صحیح کرنے کا حکم دیا جائے فون ریسٹور کیا جائے اور پچھلے بقایاجات آسان قسطوں میں وصول کئے جائیں۔ جب انہوں نے نام بتایا تو میں نے کہا وہ صاحب صدر مملکت کے حوالے سے مجھے مل چکے ہیں اور میں نے تینوں کام کر دئے ہیں۔ آپ جنرل صاحب کو بتا دیں۔۔۔۔ اسی شام جب میں لاہور سے واپس اسلام آباد پہنچا تو صدر ضیاء الحق اس دار فانی سے کوچ کر چکے تھے'' (جلد دوم صفحہ ٢٤٩)۔ آئی ایس آئی سے ان کی ایک جھڑپ۔ ''ایک دن آئی ایس آئی کے ایک کرنل صاحب مجھ سے فرمانے لگے ''اختر صاحب آپ کے متعلق ہماری اطلاع یہ ہے کہ فرانس میں ایک نمبرڈ اکاؤنٹ میں آپ نے کثیر زر مبادلہ جمع کروا رکھا ہے۔'' میں نے بہت سنجیدگی سے کہا ''مگر آپ کو یہ معلوم نہیں کہ پیرس میں میرا اولا بھی ہے اور ایک ریس کا گھوڑا بھی'' کہنے لگے ''سچ مچ''۔ میں نے عرض کیا ''جی ہاں اور یہ بھی کہ میرا اصلی نام پرنس کریم آغا خان ہے'' (صفحہ ١٦٩)۔ غرض اس ایماندار سول سرونٹ کی خودنوشت دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی اے کاش اختر صاحب اپنے اشعار کو سند کے طور پر درج کرنے سے اجتناب کرتے۔

✔

دھوپ چھاؤں

پاکستان کے نابیناؤں کی ایسوسی ایشن کی بانی صدر اور معذوروں کی بہبود کے عالمی اداروں کی روح رواں ڈاکٹر فاطمہ شاہ کی خودنوشت ''دھوپ چھاؤں'' کے عنوان سے عشبہ پبلشنگ انٹرنیشنل کراچی کی جانب سے ٢٠٠٦ میں پہلی بار چھپی۔ ڈاکٹر فاطمہ شاہ میڈیکل ڈاکٹر تھیں تقریباً جوانی میں اپنی بینائی کھو بیٹھیں مگر ہمت نہیں ہاری اور عمر بھر بیکار نہیں بیٹھیں بلکہ اپنے وجود کو نابیناؤں کی بہبود کے لئے وقت کئے رکھا۔ ان کا نام اس سماجی خدمت کی وجہ سے تابندہ رہے گا۔ نابینا ہونے کے بعد یک گونہ مایوسی کا شکار تھیں کہ ایک امریکی نابینا خاتون ڈاکٹر گرانٹ جو اکیلی دنیا کا سفر کر رہی تھیں ان سے ملنے ان کے گھر پہنچ گئیں (صفحہ ١٢٨) ان کی ہمت اور ولولہ سے بہت متاثر ہوئیں اور کمر ہمت باندھ لی۔ بیگم لیاقت علی خاں کی قائم کردہ تنظیم اپوا کے بانی ارکان میں سے تھیں اس سے انہیں بہت تقویت ملتی رہی۔

فاطمہ شاہ بھیرہ کے ایک علمی خاندان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد پروفیسر عبدالمجید قریشی علی گڑھ یونیورسٹی میں حساب کے پروفیسر رہے اور وہیں سے وظیفہ یاب ہوئے۔ ہجرت کے بعد آپ سرگودھا میں آباد ہوئے اور وہیں ایک مرتبہ ہمیں گورنمنٹ کالج سرگودھا میں آپ کی زیارت کا موقع نصیب ہوا۔ پرنسپل ڈاکٹر عابد احمد علی نے اپنے پرانے استاد اور علیگ برادری کے ایک محترم رکن کے اعزاز میں یہ تقریب منعقد کی تھی۔ پروفیسر قریشی اس وقت معمر تھے مگر ان کی باتیں کانوں میں رس گھولتی تھیں۔

فاطمہ شاہ علی گڑھ میں پلی بڑھیں۔ ان کی سہیلیوں اور ہم عصروں میں ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ

کی صاحبزادیاں اور علی گڑھ میں خواتین کے تعلیمی اداروں کے بانی مبانی پاپا عبداللہ کی دختران تھیں بیگم خورشید مرزا اور آمنہ مجید ملک سے ان کا عمر بھر ناطہ قائم رہا اور کراچی میں جب انہیں نابیناؤں کے لئے بریل کی تعلیم کا انتظام کرنے کی ضرورت پیش آئی تو آمنہ مجید ملک ہی ان کے کام آئیں اور اپنے کالج میں بریل کے کورسز کا اہتمام کیا۔

فاطمہ شاہ ڈاکٹر بنیں۔ گورکھپور میں مختصر سے قیام کے دوران ان کی ملاقات ان کے ہونے والے شوہر سید جواد سے ہوئی۔ مگر ماحول کی گھٹن کا اندازہ اس سے لگا۔ یۂ کہ کسی حویلی میں گئیں تو ''برآمدہ میں بیٹھے ہوئے ایک مرد نے انہیں دیکھ کر لاحول پڑھی اور منہ پر پردہ ڈال لیا'' (دھوپ چھاؤں صفحہ ۲۷)۔ اس گھٹن کے خلاف ردعمل کا اثر ان کی اگلی نسل تک چلا۔ ان کی صاحبزادی نے ایم اے میں داخلہ لیا اگلے روز گھر واپس آ کر اعلان کر دیا کہ ''ہم ایم اے نہیں کریں گے کیونکہ ہماری کلاس میں سب مرد ہیں اور داڑھی والے ہیں'' (صفحہ ۱۵۱)۔ اس کے برعکس ایک مرد کا ردعمل ہمیں بدرالدین الحافظ کی خودنوشت میں نظر آیا تھا جو ۲۰۰۲ میں دہلی سے چھپی تھی۔ جب آپ نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور انہیں معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ طالبات بھی شریک درس ہوں گی تو ان کا ردعمل تھا ''تب تو ایمان خطرہ میں ہے'' (''یادوں کی نگری'' خودنوشت بدرالدین الحافظ صفحہ ۱۵۹)۔ عورتوں کے خلاف یہ ردعمل دراصل بنیاد پرست علما کی جانب سے صرف ان کے حقوق کو غصب کرنے کی پرانی عادت کی وجہ سے تھا۔ مدتوں بعد جب فاطمہ شاہ کو ضیاء الحق نے اپنی مجلس شوریٰ کا رکن نامزد کیا تو شوریٰ میں بحث کے دوران مولانا شفیع اوکاڑوی سے ان کی جھڑپ ہو گئی۔ مولانا نے کسی حدیث کا حوالہ دے کر کہا تھا کہ ''عورت جس ملک کی سربراہی کرے گی اس میں تباہی آئے گی'' ڈاکٹر فاطمہ شاہ کھڑی ہو گئیں اور کہا ''چونکہ حدیث کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا اس لئے اس کی صداقت پر بحث نہیں کروں گی لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ جس شخص نے چودہ سو سال پہلے عورت کو مساوی حقوق دیئے اس کے متعلق اس قسم کی حدیث پر یقین کرنا مشکل لگتا ہے اور اتنا وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ پچھلے پینتیس برس میں جو تباہی اس ملک میں مردوں کے ہاتھوں ہوئی ہے وہ اگر عورت کوشش بھی کرتی تو نہ کر سکتی''۔۔۔ (صفحہ ۲۲۹) غرض

فاطمہ شاہ کی اولوالعزمی محض نابینا اور بے بصارت لوگوں کی خدمت تک محدود نہیں رہی بے بصیرت لوگ بھی ان سے متمتع ہوتے رہے۔

ڈاکٹر فاطمہ شاہ کے شوہر گورکھپور کے ایک سجادہ نشین تھے جنہیں رواج کے مطابق ''باہر نکلنے کی اجازت نہیں۔ عوام الناس ان کو صرف محرم کے دس دنوں کے دوران دیکھ سکتے ہیں جب وہ اپنے مخصوص صافے اور چوغے میں محرم کا جلوس لے کر ماتم کرتے ہوئے نکلتے ہیں'' (صفحہ ۲۵)

بیگم حمیدہ اختر حسین نے اپنی کتاب ''نایاب ہیں ہم'' میں ان کا ذکر بڑے انوکھے انداز میں کیا ہے ''میاں صاحب کے دادا کو کسی درویش نے بڑی جاگیر دے دی تھی اس شرط پر کہ وہ محرم کے دس دن عزاداری بڑے اہتمام کے ساتھ کریں گے جو میں نے ان کے ہاں دیکھا تھا ان کے ہاں آٹھ دس ہاتھی ہوتے تھے جو بڑے سجے بنے آگے آگے پھر چیتے اور شیروں کی کھالیں اوڑھے آدمی لوگ ہاتھوں کو زمین پر لٹکائے خوب دھوم دھڑ کا کرتے ہوئے مرثیہ پڑھتے کچھ زنجیروں کا ماتم کرتے ہوئے آگے آگے میاں صاحب اپنے خاصے لمبے بال لٹکائے ننگے پاؤں ہاتھ سے اوپری اوپری ماتم کرتے ہوئے کہ کہیں ہاتھ سینہ کو چھیل نہ جائے کہ وہ خود سنی خاندان سے تھے جگہ جگہ تمبو لگے ملتے جہاں بڑے بڑے روٹ (ایک طرح کی روغنی روٹی جن پر میوہ بھی لگا ہوتا) تبرک کی طرح ہر کسی کو دیا جاتا شربت اور پانی کی سبیلیں لوگوں کی پیاس بجھاتیں جگہ جگہ دہکتے ہوئے کوئلوں پر سے لوگ ننگے پاؤں بے دھڑک چل رہے ہوتے زنجیری ماتم کرنے والے خون کی پھوار برساتے ماتم کرتے گذر رہے ہوتے سجے بنے گھوڑے (دلدل) دکھائی دیتے۔ ہم ہاتھی پر ہودے پر بیٹھے یہ سب تماشا دیکھتے امام باڑہ میں داخل ہوتے بڑا زوردار ماتم ہوتا پھر میاں صاحب اپنی شاندار حویلی میں آ جاتے۔ دس منٹ کے اندر نہا دھو کر کرتا پاجامہ پہن ہم سب کے پاس آ کر بیٹھ جاتے زاہد بھائی ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے وہ بڑے ایکٹر بہروپیے ہیں وہ خوب ہنستے اور بتاتے کہ بھئی یہ سارے ٹھاٹ باٹ اور پیسے کی ریل پیل ہے نا وہ ایسے ہی تو نہیں ملی۔ ہم اس وقت تک گدی نشین رہ سکتے ہیں جب تک بزرگوار سے جو وعدہ کیا تھا اس پر قائم رہیں'' (نایاب ہیں ہم صفحہ ۱۳۰۔۱۳۱) اسی سجادہ نشینی کی وجہ سے وہ پاکستان بھی نہیں آئے۔ فاطمہ شاہ پاکستان

آئیں اور پھر یہیں کی ہو رہیں۔ کبھی کبھار ہندوستان چلی جاتیں یا بچیاں اپنے باپ سے ملنے کو گورکھپور ہو آتیں تا آنکہ جواد صاحب نے دوسری شادی کر لی اور ڈاکٹر فاطمہ شاہ سے ان کا تعلق برائے نام رہ گیا۔ اپنے بچوں کی پڑھائی اور تربیت ڈاکٹر صاحبہ نے خود ہی کی۔ ڈاکٹری کی ملازمت جو شوہر کے کہنے پر ترک کر دی تھی پھر پرائیویٹ طور پر شروع کر دی مگر وقت کے ساتھ ان کی آنکھیں جواب دے گئیں اور ان کی دنیا میں اندھیروں کا راج ہو گیا۔ اولاد نے اپنے باپ سے اتنا تعلق ضرور رکھا کہ بچوں کی شادیاں اپنے آبائی وطن میں جا کر کیں تا کہ اماں ابا دونوں شریک ہو سکیں۔

اس خودنوشت کا سب سے احسن پہلو ان کی خود احتسابی ہے۔ انہیں احساس ہے کہ ان کے شوہر نے تو ان کے ساتھ نباہنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کوتاہی انہی کی طرف سے ہوتی رہی اور یہ اپنے شوہر کے مزاج کے مطابق اپنے کو ڈھال نہ سکیں اور رفتہ رفتہ یہ رشتہ ٹوٹ گیا۔ کچھ وہ کھچے کھچے رہے کچھ ہم کھچے رہے۔ اس کشمکش میں ٹوٹ گیا رشتہ چاہ کا۔

مسوری میں ان کی رہائش کے دوران ایک بار ان کے ایک عزیز کے دوست افسر سیر کو آئے انہیں کسی ہوٹل میں جگہ نہ ملی تو سیوائے ہوٹل والوں نے ''ان کے لئے زمین پر گدے ڈال دئے۔ یہ افسران (مستقبل کے) ائیر کموڈور مقبول رب تھے اور پاکستان کے ہونے والے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خاں'' تھے۔ (صفحہ ۶۵) یہ وہی ائیر کموڈور مقبول رب تھے جنہیں سکندر مرزا نے سی ایم ایل اے ایوب خاں کو ڈھاکہ سے واپسی پر گرفتار کرنے کا حکم دیا تھا اور پھر خود گرفتار ہو گئے تھے۔

بصارت سے محروم ہو جانے کے بعد ذاتی زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا ذکر بھی بڑے مزے لے لے کر کیا گیا ہے مگر ناکامیوں حادثوں کا ذکر بھی اسی ولولے اور حوصلہ سے ہے۔ اپنے نواسے کی نو دریافت ''مذکر نوازی'' کی ضد کا ذکر بڑے مزے سے کیا ہے ''اس کی آیا کہنے لگی یہ لڑکا کہتا ہے مرغی نہیں کھائے گا مرغا کھائے گا گائے کا دودھ نہیں پئے گا سانڈ کا دودھ پیے گا اب مجھے بتائیے میں کیا کروں؟'' (صفحہ ۱۷۹)۔ یہی نواسے اپنے ماں باپ کے ہمراہ بڑی مشکل سے سقوط

مشرقی پاکستان کے بعد بچتے بچاتے واپس پہنچے۔

پاکستان کے حکمرانوں نے ان کی نابیناؤں کی بہبود کی کوششوں کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ ہندوستان میں اس ایسوسی ایشن کے اجلاس میں گئیں تو وہاں کے موجود وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی ان کے اجلاس میں آئے۔ یہاں بھٹو صاحب تک وعدوں کے باوجود ان کے کسی کام نہ آئے۔ ضیاء الحق البتہ ان پر مہربان رہا۔ اس کے دور میں ان کی نابیناؤں کی ایسوسی ایشن اور معذور افراد کی سرپرستی کے منصوبے کامیاب ہوئے۔ ڈاکٹر فاطمہ شاہ نے دنیا بھر کے دورے کئے اور نابینا افراد میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی عالمی کوششوں میں خوب حصہ لیا اس کی وجہ سے انہیں بہت سے عالمی ایوارڈ دئے گئے اے کاش پاکستان کی جانب سے کسی حسن کارکردگی کے انعام کا ذکر ہوتا تو ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا۔

ڈاکٹر فاطمہ شاہ کی ایک بات نے ہمیں بہت خورسند کیا۔ آپ غالب کو بہت پسند کرتی تھیں اور ''غالب کے شعروں کا تسبیح پرورد کرتی تھیں'' (صفحہ ۱۴۹) یہ غالب پرستی کی ایک نادر مثال ہے۔

ڈاکٹر فاطمہ شاہ نے اپنی آنکھوں کی بیماری کے سلسلہ میں ایک ڈاکٹر رونی ہالینڈ کا یہ واقعہ درج کیا ہے ''ان کی تشخیص تھی کہ بار بار اپریشن کرنے کی وجہ سے آنکھ میں کچھ ''لیژنز'' lesions پیدا ہو گئے ہیں جو بینائی میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔ یہ لیژنز تیز بخار کی کیفیت سے پگھل سکتے ہیں لہذا طے پایا کہ چھ چھ ہفتے کے وقفے سے مجھے ٹائیفائیڈ کے ٹیکے لگیں گے جن سے میرے جسم کا درجۂ حرارت ۱۰۶ ڈگری سے تجاوز کر جائے گا اس طرح آہستہ آہستہ وہ لیژنز پگھل جائیں گے'' (صفحہ ۱۲۷)۔ حیرت کی بات ہے کہ ہم نے لاہور کے مشہور حکیم شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی کے حالات میں مولانا چراغ حسرت کا ایک خاکہ دیکھا تھا جس میں حکیم صاحب نے بالکل ایسے ہی ایک مریض کا علاج ایسے ہی تیز بخار سے کیا تھا۔ حسرت لکھتے ہیں ''ایک دفعہ ایک نوجوان لڑکی کو ان کے پاس لایا گیا جو بصارت سے محروم تھی۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ لڑکی کو میعادی بخار ہو گیا تھا اس کے بعد اس کی بصارت زائل ہو گئی۔ حکیم صاحب نے نسخہ لکھ دیا اور کہا اس نسخہ کے استعمال سے اسے زور کا بخار ہو گا لیکن تشویش کی کوئی بات نہیں۔ اسے برابر یہ دوا پلاتے رہنا۔ وہ

کوئی مہینہ بھر بخار میں مبتلا رہی اور اسی زمانہ میں اس کی بصارت عود کر آئی۔ جب بخار اترا تو اس کی آنکھیں بھلی چنگی ہو چکی تھیں۔ بعض لوگوں نے اس علاج پر حیرت ظاہر کی تو انہوں نے فرمایا معمولی بات ہے لڑکی کو میعادی بخار ہوا معالج ناتجربہ کار تھا اس لئے ایسی دوائیں دیں کہ بخار اتر گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تپ اترنے کے وقت کچھ مواد فاسد آنکھوں کے اعصاب کے قریب تھا جسے خارج کرنے کی کوئی تدبیر نہیں کی گئی اور اس طرح آنکھیں ماؤف ہو گئیں۔ میں نے ایسی دوائیں دیں کہ مریضہ کو پھر بخار ہوا اور یہ مواد بخار کی حرارت سے پگھل کر آہستہ آہستہ خارج ہو گیا'' (مردم دیدہ۔ ''شفاء الملک مرحوم'' از چراغ حسن حسرت۔ صفحہ ۵۵)۔ ہمارے ہاں بھی کیسے کیسے حاذق اطباء موجود تھے۔ اس زمانہ میں لوگوں نے اس علاج کو حکیم صاحب کا ٹوٹکا سمجھا ہو گا مگر ڈاکٹر فاطمہ شاہ کی کتاب نے پچھتر برس قبل کی ایک طبی تشخیص کی تصدیق کر دی ہے۔

یہ خود نوشت ایک اولوالعزم اور باہمت خاتون کی خود نوشت ہے اور ان لوگوں کے لئے راہنما ہے جو اپنی جسمانی معذوریوں کے آگے سپر انداز ہو کر معاشرے پر بوجھ بن جاتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر فاطمہ شاہ حیات ہیں تو اللہ ان کی زندگی اور صحت میں برکت دے اور ان کے پیغام کا اجر و ثواب انہیں ملتا رہے۔ یہ ان کا صدقہء جاریہ ہے۔

میں نے اپنی سنت جاریہ کے مطابق یہ تبصرہ ڈاکٹر فاطمہ شاہ کے پبلشر کی معرفت ان کے ملاحظہ کے لئے بھیجا۔ آج ان کی صاحبزادی کی طرف سے اطلاع ملی کہ ڈاکٹر صاحبہ ۱۹۹۲ میں انتقال کر گئی تھیں اور اپنی اس کتاب کے چھپنے سے پہلے ہی راہیء ملک بقا ہو چکی تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور ان کے اعمال حسنہ کی جزا سے انہیں نوازے۔ آمین۔ ان کی صاحبزادی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے وہ نواسے جو گائے کا دودھ پینے کی بجائے سانڈ کا دودھ پینے کی ضد کیا کرتے تھے اب ماشاءاللہ سنگاپور میں ایک اہم تجارتی اگزیکٹو عہدے پر فائز ہیں۔

✓

۔۔۔اور میں پاکستان آ گیا

الحاج پروفیسر ڈاکٹر سید منظر حسین کاظمی کی سرگزشت ''۔۔۔اور میں پاکستان آ گیا'' کے عنوان سے ۲۰۰۵ میں کراچی سے چھپی۔ منظر حسین کاظمی صاحب ہمارے ہم پیشہ رفیق ہیں اور ہمارے پڑوس میں گورنمنٹ کالج جوہر آباد کے پرنسپل بھی رہے۔ پھر راولپنڈی ڈویژن کے ڈائریکٹر ایجوکیشن بھی رہے۔ مگر ہمارا ان سے ساتھ ہو سکا نہ آمنا سامنا ہوا کیونکہ ہمارے کالج کے قومیائے جانے تک یہ واپس کراچی جا چکے تھے۔

ہمیں تو ان کی خود نوشت کے عنوان نے چونکایا۔ کہ ''۔۔۔اور میں پاکستان آ گیا'' یہ عنوان پڑھتے ہی قاری کا ذہن اس طرف منعطف ہوتا ہے کہ یا تو انہیں اپنے پاکستان آ جانے پر تاسف ہے کہ میں کیوں پاکستان آ گیا؟ یا انہیں اس بات کا گھمنڈ ہے کہ میں نے پاکستان آ کر پاکستان پر بہت احسان کیا ہے۔ ورنہ ایک سیدھا سادہ آدمی تو اپنی خود نوشت کا ایسا عنوان رکھتے ہوئے دس مرتبہ سوچتا ہے کہ کہیں ان کی کتاب کا عنوان ہی کسی غلط فہمی کا موجب نہ بن جائے۔ اگر تو یہ تحریک پاکستان میں سرگرمی سے حصہ لے رہے ہوتے اور وہاں انہیں اپنا مستقبل مخدوش نظر آتا تو بھی یہ کہتے ہوئے بھلے لگتے تھے کہ ''اور میں پاکستان آ گیا'' مگر ایسی کوئی تہمت تو ان پر دھری نہیں جا سکتی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ انہیں اپنے آباواجداد کے چھوڑے ہوئے اس تعلقہ کی تہمت یاد آتی ہے جو ان کے کام نہ آیا اور دوسروں کے تصرف میں رہا اور وہ جائیداد بھی انہیں بہت پریشان کرتی ہے جو ''ان کے چچازاد بھائی نے انہیں اور ان کے بچوں کو مردہ دکھا کر اپنے نام منتقل کروا لی'' (اور میں پاکستان آ گیا۔ صفحہ ۸۴)۔ کاظمی صاحب نے حسرت کے ساتھ اپنی ہجرت کا ذکر کیا ہے کہ ''دولت کے انبار سے صرف ایک بکس ایک بستر اور ایک جھابی لے جانا پسند کیا'' (صفحہ ۱۵۰) حالانکہ خود

تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ دولت اُن کے خاندان سے نکل چکی تھی اور اُن کے والد گرامی ایک معمولی پولیس انسپکٹر تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم نے یہ خودنوشت کسی سیاسی کارکن کی خودنوشت سمجھ کر پڑھنا شروع کی تھی مگر ایک ایسے استاد کی سرگزشت نکلی جس کی سیاسی بصیرت محض کتابی ہے۔ سیاسی رہنماؤں اور حکمرانوں پر ان کے ارشادات ایک مبتدی مبصر کے افادات لگتے ہیں۔

ایک تو انہیں شہروں کی تاریخ بیان کرنے کا بہت شوق ہے۔ اپنے آبائی وطن کی تاریخ تو لکھی لکھنؤ کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے اور اب تو لکھنؤ کے بارہ میں اتنی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں کہ شاہان اودھ کے بارہ میں ہر چیز کھل کر سامنے آ گئی ہے مگر یہ اپنی لکیر پیٹتے چلے جاتے ہیں۔ کراچی کی تاریخ' حیدر آباد کی تاریخ' شکار پور کی تاریخ جو ہر آباد کی تاریخ اسلام آباد پنڈی کی تاریخ غرض اتنی تاریخیں ان کی خودنوشت کا حصہ ہیں کہ کم از کم میں تو پڑھتے ہوئے ان کی کتابی ''تاریخی معلومات'' کو نظر انداز کر کے آگے گذر گیا ہوں اور پھر اپنے ہم وطنوں دوستوں ساتھیوں سیاسی رہنماؤں بیوروکریٹوں کے سوانحی حالات۔ کیا یہ سب باتیں بیان کئے بغیر ان کی خودنوشت غیر مکمل رہ جاتی؟

البتہ ان کی خودنوشت میں دلچسپی کی چیز بعض جانی پہچانی شخصیات کا احوال ہے۔ ''خمار بارہ بنکوی ان کے ''دولہن بھائی'' ہیں'' (صفحہ ۸۶) ''ابن صفی اسرار ناروی یا طغرل فرغان کے نام سے شاعری کرتے تھے''۔۔۔ ''اور ڈاکخانہ میں اسلحہ کی تجدید کے کلرک کے مرتبہ پر فائز تھے'' (صفحہ ۱۰۲) مگر سب سے دلچسپ احوال تو ان کے ''عسکری ماموں کی بیٹی عالیہ امام کا ہے'' (صفحہ ۷۷) ڈاکٹر عالیہ امام نے اپنے گھرانے کا جو ذکر اپنی خودنوشت ''شاخ ہری اور پیلے پھول'' میں کیا ہے اس میں اہل خاندان (خاص طور سے عالیہ امام کی والدہ محترمہ) کی گائیکی کا ذکر بھی ہے اور خود اپنے گانے کے شوق کا بھی بڑی رغبت سے ذکر ہے۔ اے کاش کاظمی صاحب اپنے عسکری ماموں کے ''گھرانے'' کے اس پہلو پر بھی کچھ روشنی ڈالتے۔ (سخن ہائے ناگفتنی از مشفق خواجہ۔ مرتبہ مظفر علی سید صفحہ ۱۴۷)

ان کی اکثر معلومات یوں بھی نامکمل ہیں لکھتے ہیں ''لکھنؤ کے آئی ٹی کالج میں مس رعنا ان کے ساتھ تھیں'' (صفحہ ۱۰۹) آئی ٹی کالج کی تعلیم کے دوران وہ مس پنت تھیں۔ رعنا تو وہ لیاقت علی خاں سے شادی کے بعد بنیں۔ پھر آپ کبھی کہتے ہیں ''قائداعظم راجہ صاحب محمود آباد کے

کہنے پر لندن سے واپس آئے'' (صفحہ ۱۲۴) کبھی کہتے ہیں ''لیاقت علی خاں کے کہنے پر واپس تشریف لائے'' (صفحہ ۲۰۶) حالانکہ ان کے واپس آنے کے باب میں قرائن جماعت احمدیہ کی مسجد فضل لندن کے امام مولانا عبدالرحیم درد مرحوم کی جانب اشارہ کرتے ہیں جنہوں نے امام جماعت احمدیہ کی ہدایت پر محمد علی جناح کو سیاسی تقریروں کے لئے مسجد فضل لندن کا سٹیج مہیا کیا اور انہیں واپس انڈیا جا کر مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے کی ترغیب دیتے رہے۔ جناح صاحب نے برملا اعتراف کیا کہ ''امام صاحب کی تحریص و ترغیب نے میرے لئے واپس جانے کے سوا کوئی راہ فرار باقی نہیں چھوڑی'' ("Country's Founder persuaded to return to politics by London Imam". Feature written by Julia Lewis. The Mercury. Wednesday, August 19, 2009.)

یعنی لندن کے اخبارات کو امام مسجد فضل لندن کی سعیٔ مشکور اب تک یعنی ۲۰۰۹ تک یاد ہے مگر اپنے ابھی تک اس سے اغماض برتنے کو ہی قرینِ مصلحت جانتے ہیں۔ حسن اتفاق کہ میرے کالج کے زمانہ کے رفیق جماعت اور کالج میگزین کے سینیر ایڈیٹر مطیع اللہ درد نے ابھی دو تین مہینے قبل ہی یہ تراشہ مجھے بھیجا تھا اور میں نے اسے ایک طرف ڈال دیا تھا اب پروفیسر ڈاکٹر منظر حسین کاظمی کی تاریخ نوردی کا تجزیہ کرنے بیٹھا تو وہ حوالہ یاد آیا۔ داشتہ آید بکار۔ بہر حال تاریخ کے باب میں ڈاکٹر صاحب کا مطالعہ موثق نہیں۔

آغا حسن عابدی کا ذکر خیر بھی اس کتاب میں موجود ہے مگر وہی باتیں ہیں جو دوسرے لوگ ان کے باب میں کہہ چکے ہیں۔ البتہ اقبال کے بارہ میں نذر سجاد حیدر کی بات کچھ نئی اور عجیب لگتی ہے مگر وہ بات بھی ان کے تجربہ کی نہیں سنی سنائی ہے کہ۔ مسز نذر سجاد حیدر نے انہیں بتایا کہ ''اقبال کا کچھ عرصہ کا بچپنا ان کے ساتھ گذرا ہے جب ان کے والد باجی کے یہاں مقیم تھے۔ اس زمانہ میں آج جیسے تکلفات نہ تھے پیالوں میں سالن اور گوشت آیا میرے پیالے میں دو بوٹیاں تھیں اور اقبال کے پیالے میں صرف ایک بوٹی تھی اقبال نے اپنا پیالہ ہٹا دیا کہ وہ کھانا نہ کھائیں گے میں نے بوٹی نکال کر ان کے پیالے میں ڈال دی لیکن وہ نہ مانے'' (صفحہ ۱۲۲)۔ یہ درست

ہے کہ نذر سجاد حیدر کے ابا کچھ عرصہ تک سیالکوٹ چھاؤنی میں مقیم رہے مگر اقبال کے والد کا ان کے ہاں مقیم رہنے کا کوئی سوال نہ تھا۔اسی طرح ان کی دوسری بات کہ کسی مشاعرہ میں اقبال نے شعر پڑھا چونکہ نذر سجاد حیدر اس مشاعرہ میں بے پردہ شریک ہوئی تھیں وہ اقبال کے مصرعہ ''جذبہ شوق میں بے پردہ ہوئی جاتی ہے'' سے ناراض ہو کر مشاعرہ سے اٹھ گئیں۔یہ بات بعید از حقیقت ہے کیونکہ نذر سجاد حیدر شادی سے قبل سخت پردہ میں رہتی تھیں شادی کے بعد سجاد حیدر یلدرم نے انہیں پردہ ترک کرنے کی اجازت دی۔کاظمی صاحب کن زمانوں کی فرضی باتیں کر رہے ہیں؟

کاظمی صاحب اپنی شان میں لکھے گئے قصائد سے بہت خورسند ہوتے ہیں اور جہاں ان کا شاندار استقبال ہو، ہاں کا ذکر انہیں بہت مرغوب ہے۔حتیٰ کہ جوہر آباد کالج میں مشاعرہ کروایا تو اپنی نظامت کی توصیف میں اپنے کسی طالب علم کی لکھی ہوئی مبالغہ آمیز رپورٹ بھی خودنوشت میں درج کردی ہے۔راولپنڈی کے زمانہ کے ذکر میں ہمارے محترم دوست سید صفدر حسین کاظمی پر خواہ مخواہ کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی ہے حالانکہ وہ محکمہ تعلیم کے نیک نام ترین افسر تھے اور ہر حیثیت میں نیکنامی سے اپنا وقت گذارا۔نواب کالا باغ کی خوبیوں کا ذکر بھی ہے اور یہ مستحسن بات ہے کہ دوسروں پر گند ہی نہیں اچھالتے ان کی تعریف بھی کرتے ہیں۔مگر ''پڑھے لکھے ہونے کے باوجود سفلی عمل سے پنجہ آزمائی کرنے پر خوش ہیں'' (صفحہ ۳۳۸) اور اس کا ذکر اپنی خودنوشت میں کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

اپنے مرحوم رفیق کار اور مانے ہوئے مؤرخ پروفیسر اختر رضا کی ایک کتاب پر ان کے اٹھ جانے کے بعد ایک علمی اعتراض کر ڈالا ہے (صفحہ ۱۷۵) اگر ان کی زندگی میں وہ اعتراض کرتے تو وہ اس کا مسکت جواب دیتے۔وہ اعتراض تو ہم جیسے کم علم کو بھی بڑا بودا نظر آیا ہے۔

غرض پروفیسر ڈاکٹر منظر حسین کاظمی صاحب کی یہ خودنوشت ایک استاد کی سرگزشت ہونے کے باوجود قاری کے ذہن پر کوئی علمی تاثر مرتب نہیں کرتی۔اے کاش وہ سیاسی اور تاریخی تفصیلات میں اپنا وقت ضائع کرنے کی بجائے اپنے دور کے ادبی اور علمی رجحانات کا ذکر کرتے تو ان کی کتاب زیادہ موثق ہوتی۔

یاد ہے سب ذرا ذرا

جناب عبیدالرحمن ایڈووکیٹ کی خودنوشت ''یاد ہے سب ذرا ذرا'' شعبہ تصنیف و تالیف کراچی یونیورسٹی کی جانب سے مارچ ۲۰۰۳ میں شائع ہوئی۔جناب عبیدالرحمن سیتاپور کے رہنے والے تھے مگر ان کے دادا ابا لکھنؤ منتقل ہو گئے اس لئے ان کی پرورش اور تعلیم لکھنؤ ہی میں ہوئی۔بچپن اور لڑکپن میں تحریک پاکستان میں سرگرم رہے اور قیام پاکستان کے بعد ستمبر ۱۹۴۹ میں پاکستان آ گئے۔لاہور گورنمنٹ کالج سے بی اے کا امتحان پاس کیا اور پھر کراچی کو اپنا مستقر بنالیا یوڈی سی رہے تعلیم جاری رکھی قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد نامور وکلا کے ساتھ کام کرتے اور استقلال کے ساتھ اپنا مستقبل بنانے میں کوشاں رہے۔سیاسی میدان میں مادر ملت کے الیکشن میں دوسروں کے ساتھ کام کیا۔مسلم لیگ کے کارکن بھی رہے۔خواجہ ناظم الدین سے ان کا خاصہ گہرا رابطہ رہا اور ان کے اقتدار سے ہٹ جانے کے بعد رہا۔تحریک استقلال میں رہے مگر ''اصغر خاں کو کان کا کچا اور فیصلے کرنے میں متذبذب پایا'' (یاد ہے سب ذرا ذرا صفحہ ۲۶۳)۔ضیاء الحق کی اس مجلس شوریٰ میں شامل ہو گئے جسے لوگ باگ ''ابلیس کی مجلس شوریٰ کہتے تھے'' (تمنا بیتاب خود نوشت رشید امجد صفحہ ۳۳۵)۔

پاکستان نے ایٹمی دھماکہ کیا تو دنیا نے اس بم کو ازرہِ تحقیر و تخفیف اسلامی بم قرار دیا تو دنیا بھر کے دانشوروں نے اسلامی بم کی اصطلاح کو غیر مناسب اور غیر حقیقت پسندانہ قرار دیا کیونکہ تباہی کے ہتھیاروں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اس لئے پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کی تخفیف کے لئے مغربی معاندانہ پریس نے پاکستان کے بم کو اسلامی بم قرار دے کر دراصل اسلام کے خلاف اپنا

بغض نکالا۔ مگر عبیدالرحمٰن صاحب کی خودنوشت نے یہ مسئلہ حل کر دیا کہ یہ اسلام دشمن اصطلاح کسی غیر کی وضع کردہ نہیں تھی جناب عبیدالرحمٰن نے ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کے ایک اجلاس میں وضع فرمائی تھی اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردہء تست۔ اور اس پر انہیں فخر بھی ہے۔ ''اگر دنیا میں عیسائی بم' ہندو بم' کمیونسٹ بم' یہودی بم موجود ہے تو اگر اسلامی بم وجود میں آ جائے تو کون سی قیامت آ جائے گی کون سا آسمان گر پڑے گا'' (صفحہ ۲۸۱) پاکستان کا ایٹم بم پاکستان کے خلاف جارحیت کے سدباب کا سبب ہے اس کا اسلام سے کیا تعلق ہے؟ کیا یہ بم دیگر اسلامی ممالک کے خلاف جارحیت کو روک سکے گا؟ یا دیگر اسلامی ممالک اپنے دفاع کے لئے اس بم کی موجودگی پر انحصار کر سکیں گے؟ ایسی بچگانہ بات کسی غیر پختہ سیاسی ذہن سے ہی سرزد ہو سکتی ہے۔ ان کی اس ناپختہ بات نے ان کے ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ کا رکن نامزد ہونے کی صلاحیت کی تصدیق کر دی کیونکہ اس ابلیسی مجلس شوریٰ کے لئے ایسے ہی اسلامی دیوانوں کی ضرورت تھی۔

دلی والوں نے تو دلی کے دکانداروں، کرخنداروں کے محاوروں کا بہت چرچا کیا ہے۔ عبیدالرحمٰن خاں صاحب نے بھی لکھنؤ کے دکانداروں کی محاورہ پسندی کا ذکر کیا ہے۔ ''لوگوں میں نفاست' نزاکت کی حد تک' زبان کی ٹکسالی نثر میں نظم کا گمان عام دکاندار اور عامی اپنی گفتگو میں ایسے محاورے استعارے اور کنائے استعمال کرتے کہ بڑے بڑے عالم ادیب شاعر انگشت بدنداں رہ جائیں۔'' (صفحہ ۱۰) مگر ہمیں ان کی خودنوشت میں بچپن کی اس سنی ہوئی ٹکسالی زبان کا شمہ بھر بھی نظر نہیں آیا۔ کیا لکھنؤ کے لوگ لکھنؤ سے نکل جانے کے بعد لکھنوی زبان سے قطع تعلق کر لیتے ہیں؟ ہم نے ڈاکٹر آغا سہیل کی زبان پر بھی یہی اعتراض کیا تھا مگر ان سے بھی اس کے سوا کوئی جواب بن نہیں پڑا تھا کہ لاہور میں کوئی لکھنؤ کی زبان کیسے بولے؟ ہم نے کہا تھا اگر اشرف صبوحی دہلوی' حکیم حبیب اشعر دہلوی حکیم جمال سویدا کے اخلاف و احفاد لاہور میں اپنی دہلی کی زبان بول سکتے ہیں تو آپ کے لئے کون سی روک ہے؟ اور تو اور حکیم خلیق ابراہیم خلیق کی زبان کو بھی، کہ اطبائے جھوائی ٹولہ کے نمایاں فرد تھے، لکھنؤ کی ٹکسالی زبان سے دور کی نسبت بھی نہیں تھی۔

عبیدالرحمٰن صاحب نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب

''بہشتی ثمر'' سکول کے نصاب میں تھی مگر ہدایت یہ تھی کہ اساتذہ اس کے مندرجات کو سرِ عام کلاس میں بیان نہ کریں اور نہ ہی طلباء گھروں میں جا کر اپنی گھر کی خواتین سے ان مندرجات پر بحث کریں۔ (صفحہ ۳۱) ایک طالب علم نے ان مسائل کا ذکر گھر میں کر دیا تو مسئلہ کھڑا ہو گیا اور پڑھانے والے استاد کی جواب طلبی ہو گئی۔ سوال ہے کہ ایسے مسائل اگر نصاب کی کتاب میں موجود ہیں تو استاد انہیں کیسے نہ پڑھائے اور کیوں نہ پڑھائے؟ ہمارے ہاں مولانا کی یہی کتاب ''بہشتی زیور'' کے طور پر بچیوں کو جہیز میں دی جاتی تھی۔ ہمیں یاد ہے ایک وقیع ادبی مجلس میں کشور ناہید بڑے غصہ میں آئیں اور بہشتی زیور کے کچھ اقتباسات بآوازِ بلند حاضرین کے سامنے پڑھے اور پوچھا کہ کیا یہ کتاب عریاں نویسی کے زمرہ میں شمار نہیں ہوتی؟ مسائل کی تشریح و توضیح کے نام پر ہمارے علما جنسی تلذز کے عادی ہو گئے ہیں یہاں اردو کی کتابوں کی ایک دکان پر داخل ہوتے ہی پہلے شیلف میں جنسی مسائل پر شرح و بسط سے لکھی ہوئی کتابیں نمائش کی گئی ہیں اور نمایاں الفاظ ہیں کہ نوجوانوں کو غیر اسلامی جنسی رویوں سے بچانے کے لئے یہ اسلامی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔

نو دریافت نظریہء پاکستان کے مؤیدین بار بار ''پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ'' کے شعر کا حوالہ دیتے ہیں۔ عبیدالرحمٰن صاحب نے لکھنؤ کے کسی شاعر شعلہ ایسوانی صاحب کو اس شعر کا تخلیق کار کہا ہے (صفحہ ۵۴)۔ حالانکہ یہ شعر سیالکوٹ کے اصغر سودائی صاحب کا ہے اور اس باب میں بہت تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔ اصغر صاحب تو ابھی پچھلے پندرہ بیس برس تک حیات تھے۔

قائداعظم لکھنؤ تشریف لے گئے تو کسی نے اعتراض کیا کہ علما ایک مغرب زدہ آزاد خیال شخص کے پیچھے کیوں چل رہے ہیں؟ مولانا شبیر احمد عثمانی نے حکمت سے جواب دیا ''چند سال پہلے میں حج کے لئے بمبئی سے روانہ ہوا۔ جہاز ایک ہندو کمپنی کا تھا جہاز کا کپتان انگریز تھا اور جہاز کا دیگر عملہ ہندو یہودی عیسائی افراد پر مشتمل تھا میں نے سوچا اس مقدس سفر کے یہ وسائل ہیں۔ ۔۔۔ جب عرب کا ساحل قریب آیا ایک چھوٹی سی کشتی میں سوار ایک عرب جہاز کی طرف آیا۔۔۔ عرب نے جہاز کا کنٹرول سنبھال لیا اس کو اپنی رہنمائی میں سمندری پہاڑیوں اتھلی آبی گذرگاہوں سے بچاتا ہوا ساحل پر لنگر انداز کرا دیا۔ بالکل ہم یہی کر رہے ہیں ابھی تحریک جاری ہے جدوجہد کا

دور ہے اس وقت جس قیادت کی ضرورت ہے وہ قائداعظم میں موجود ہے منزل تک پہنچانے کے لئے ان سے بہتر کوئی متبادل قیادت نہیں منزل کے قریب ہم اپنا فرض ادا کریں گے'' (صفحہ ۴۹) اور منزل پر پہنچ کر اپنا فرض یوں ادا کیا کہ قرار داد مقاصد کو آئین کے ساتھ نتھی کر دیا اور ضیاء الحق نے اسے آئین کا حصہ بنا کر اچھی خاصی مملکت خداداد کو ایک تنگ نظر دینی ریاست بنا کر رکھ دیا۔

اس خودنوشت میں حبیب جالب کی نظم صدر ایوب زندہ باد کو ’صدر عیوب زندہ باد۔صدر عیوب زندہ باد‘ کو نئے ہجوں میں لکھ کر اسے نئی معنویت دے دی گئی ہے (صفحہ ۲۰۹)۔اسی طرح بھٹو صاحب کے اسلامی کارنامے کا ذکر ہے کہ بھٹو نے احمدیوں کے لاہوری اور ''امرتسری'' فرقوں کو ناٹ مسلم قرار دے کر بڑا اسلامی مسئلہ حل کر دیا۔ (صفحہ ۲۵۲) خدا جانے یہ صاحب کتاب کی بے نیازی ہے یا بے علمی کہ ایک بین الاقوامی طور پر جانے پہچانے اسلامی فرقہ میں امرتسری کی پخ لگا دی۔ پھر اسی قسم کی ایک واقعاتی غلطی پنجاب باؤنڈری کمشن کے سلسلہ میں ہے کہ ''جسٹس منیر پنجاب کی حد بندی کے لئے نامزد ہوئے'' (صفحہ ۹۱) پنجاب کی حد بندی کے لئے پورا کمشن تھا جس میں جسٹس منیر جسٹس دین محمد جسٹس مہاجن اور جسٹس تیجا سنگھ تھے۔ سیرل ریڈ کلف پنجاب اور بنگال دونوں کمشنوں کے صدر تھے اور ان کی حیثیت ایک امپائر کی تھی۔

غرضی چھوٹی موٹی فروگزاشتوں کے باجود عبید الرحمٰن صاحب کی خودنوشت تحریک پاکستان کے ایک نوجوان کارکن کی خودنوشت ہے جس نے پاکستان آکر کوئی نمایاں سیاسی خدمت سرانجام نہیں دی۔ تاہم خوشحال اور مطمئن زندگی ضرور گذاری۔ چوہدری خلیق الزمان کے بارہ میں جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ سر یامین خاں صاحب کی سرگزشت نامہ اعمال میں تفصیل و جزئیات سے بیان میں آچکا ہے جسے دہرانا محض طوالت کا باعث ہوتا۔

ان کی باتیں ہماری یادیں

کراچی الیکٹرک سپلائی کے ریٹائرڈ اسسٹنٹ چیف اکاونٹنٹ جناب ایس این خان کی خودنوشت ان کے ایک ہمزاد نے شہزاد نبی خاں کی خودنوشت کے طور پر مرتب کی ہے اور اسے ''ان کی باتیں ہماری یادیں'' کا عنوان دیا ہے۔ شہزاد نبی خاں اجمیر شریف میں پیدا ہوئے۔ اس لئے ۴۴۱ صفحات کی اس کتاب کے پہلے تیس صفحات حضرت خواجہ معین اجمیری رحمتہ اللہ علیہ کے احوال اوافکار اور اجمیر کی تاریخ پر مشتمل ہیں۔

شہزاد نبی خاں صاحب کی تعلیم اجمیر میں ہوئی صغر سنی ہی سے انہیں دین کی طرف رغبت تھی اور کم عمری ہی میں جماعت اسلامی کے قیام (۱۹۴۱ء) سے پہلے ۱۹۳۷ میں اپنی ایک طفلانہ جماعت اسلامی بنا چکے تھے۔ (ان کی باتیں ہماری یادیں صفحہ ۲۰) جب جماعت اسلامی کا باقاعدہ قیام ہو گیا تو جماعت کے مقاصد سے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے۔ سکول میں گروپ فوٹو کھنچوانا چاہا مگر ''مولانا مودودی نے اجازت نہیں دی'' (صفحہ ۳۵) اس رجحان سے ان کی طبیعت کے میلانات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں آکر بنک میں ملازمت کرنا چاہتے تھے مگر ان کی طبیعت نے انہیں باور کروایا کہ بنک کی ملازمت ایسے ہی ہے جیسے آدمی ''شراب خانہ میں حساب دان بن جائے'' (صفحہ ۶۳)

وجہ معاش کے لئے کے ای ایس سی میں ملازمت کی اور چالیس سال تک ملازمت کر کے سبک دوش ہوئے۔ جماعت اسلامی کے ساتھ گہرا رابطہ رکھا اور ان کے مقاصد میں ان کے ہم نوا رہے۔ مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو۔ ایک بار تبلیغی جماعت کے ساتھ تبلیغی سفر

پر بھی گئے مگر انہیں شبہ ہوا کہ ''تبلیغی جماعت کی جہاد کے بارہ میں ایک غیر اعلان شدہ پالیسی ہے کہ جہاد سے گریز کیا جائے'' (صفحہ ۱۲۴) اس لئے دوبارہ تبلیغی اجتماعات میں نہیں گئے۔

قائد اعظم کی وفات پر سر ظفر اللہ نے قائد اعظم کا جنازہ نہیں پڑھا تو جماعت اسلامی کی پالیسی کے مطابق یہی نتیجہ اخذ کیا کہ احمدی غیر احمدیوں کا جنازہ نہیں پڑھتے (صفحہ ۹۹)۔ حالانکہ قائد اعظم کا جنازہ نہ پڑھنے کی وجہ مولانا شبیر احمد عثمانی کی امامت تھی۔ مولانا جماعت احمدیہ پر تکفیر کا فتویٰ لگا چکے تھے اور جماعت احمدیہ کسی ایسے امام کی اقتدا میں نماز نہیں پڑھتی جس نے جماعت پر تکفیر کا فتویٰ لگایا ہو۔

تبلیغی جماعت کے دورہ کے دوران انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ تبلیغی جماعت والے قرآن کو ترجمہ کے بغیر سنانا مستحب جانتے ہیں اور ترجمہ والا قرآن حتی الوسع استعمال نہیں کرتے (صفحہ ۱۲۳)۔ اس کی وجہ ان کے نزدیک یہ ہے کہ تبلیغی جماعت فروعی اختلافات میں پڑنا نہیں چاہتی مگر ایس این خاں صاحب نے اس عمل پر العیاذ باللہ کہہ کر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ غرض ایس این خاں صاحب کی یہ ہمزاد کو لکھوائی ہوئی سرگزشت کوئی ایسی عمدہ زبان یا دلچسپ واقعات والی سرگزشت نہیں جو قاری کو متاثر کرے یا کوئی دیرپا اثر مرتب کرے۔

✓

قصہ بے سمت زندگی کا

عجیب اتفاق ہے کہ ہمیں بہار کے علاقہ کے جتنے باسیوں کی خودنوشتیں پڑھنے کا موقعہ ملا ان سب کو یک رخا محدود اور حد سے زیادہ ذاتی پایا۔ کلیم عاجز کی خودنوشت ''جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی'' ہو یا اویس احمد دوراں کی ''میری کہانی''، شکیل الرحمٰن کی ''آشرم'' ہو یا وہاب اشرفی صاحب کی ''قصہ بے سمت زندگی کا'' تمام خودنوشتیں فنی لحاظ سے ناقص اور مندرجات کے لحاظ سے نہایت بے کیف ہیں۔ اس کی وجہ سوائے اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ اس علاقہ کے لوگ باہر کے لوگوں سے میل جول رکھنے میں محتاط ہیں اس لئے ہر شخص اپنی ذات اور خاندان تک محدود ہے۔ کلیم عاجز کی خودنوشت پر لکھتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ ان کی خودنوشت ''بے حد ذاتی اور خاندانی حالات تک محدود ہے'' (پس نوشت اور پسِ پس نوشت صفحہ ۲۹۰) اب وہاب اشرفی صاحب کی خودنوشت ''قصہ بے سمت زندگی کا'' آئی ہے تو وہ حد سے زیادہ تنگ انگنائی میں محصور زندگی لگتی ہے۔ کون کون تھا کون کس سے بیاہا گیا کیوں بیاہا گیا؟ کس کے کتنے بچے تھے کیوں تھے کہاں تھے۔ غرض قاری اس خاندانی روزنامچہ سے بیزار کن حد تک اکتا جاتا ہے۔ خدا معلوم اس خطہ بہار کے ادب سے تعلق رکھنے والے اپنے حلقہ میں اس حد تک محدود کیوں ہو کر رہ جاتے ہیں؟

ادب کا استاد ہونے کے باوجود خودنوشت سوانح عمریوں کی تاریخ اور فن پر ان کا مطالعہ نہایت محدود ہے اور جو خودنوشتیں ان کے مطالعہ میں آئی ہیں وہ بھی معدودے چند ہیں۔ نقوش کا آپ بیتی نمبر بھی محض آپ نے دیکھا ہے مجھے تو یوں لگتا ہے اردو کی کوئی ڈھنگ کی خودنوشت ان کے مطالعہ میں آئی ہی نہیں۔ غالباً وہاج الدین علوی صاحب کے پی ایچ ڈی کے مقالہ کا بھی آپ

نے صرف نام ہی سنا ہے اسے دیکھا اور پڑھا نہیں۔

اپنے معاشرہ کی بیجا حد تک خود شناسی اور نمائشی رجحانات کا ذکر تو کلیم عاجز صاحب کے ہاں بھی تھا آپ نے ایک شخص کا ذکر کیا کہ بازار سے گذرتے ہوئے انہیں سگریٹ خریدنے کا ضرورت پیش آئی تو متذبذب تھے وجہ یہ کہ "کیا میں خود بازار میں جا کر سگریٹ خریدوں؟" (قصہ بے سمت زندگی کا۔ صفحہ ۲۶)

ادب سے اتنے تعلق کے باوجود احوال الرجال کے سلسلہ میں پٹنہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر اختر اورینوی اور ان کے برادر سید فضل احمد کا ذکر سرسری کیا سرسری تر ہے۔ (صفحہ ۹۶) شکیلہ اختر جیسی افسانہ نگار کا ذکر بھی ان کے برادر کے حوالہ سے صرف اتنا ہے کہ "وہ احمدی فرقہ سے تھے" (صفحہ ۱۷۰) حالانکہ اختر اورینوی کا سارا خاندان ہی احمدی خاندان تھا اور نقوش کے آپ بیتی نمبر میں ان کا یہ اعتراف موجود ہے۔ اپنے رفیق کار کلام حیدری کا ذکر کرنے بیٹھے ہیں تو ان کا اور ان کے سسر کا غیر ضروری اور طویل موازنہ شامل کر دیا ہے (صفحہ ۱۲۴) جس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ البتہ ان کے اس دوست کا ذکر دلچسپ ہے جو "انہیں بمبئی لے گئے اور ایک محفلِ رقص میں لے جا کر خود درمیاں سے اٹھ گئے کہ مجھے صبح حج کے مبارک سفر پر روانہ ہونا ہے" (صفحہ ۱۳۷)۔ ڈاکٹر قمر رئیس اور ڈاکٹر تنویر احمد علوی کا مناقب اور احسانات کا ذکر ہے مگر یہ بھی کہ عریاں گوئی اور جنسی موضوعات پر رواں ہوں تو انداز گل افشانیء گفتار دیکھنے کا ہوتا ہے" (صفحہ ۱۵۷)

بہار یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر شکیل الرحمن کی خودنوشت اس حد تک مجمل تھی کہ ان کی ذات کے بارہ میں کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا وہاب اشرفی صاحب نے ان کی شخصیت کے باب میں دو چار باتیں لکھ دی ہیں جو شکیل الرحمن کی خودنوشت کا حصہ ہونا چاہیئے تھیں "بزرگ دوست شکیل الرحمن یاد آ رہے ہیں۔ جمالیات اور ہندوستانی جمالیات پر مسلسل لکھتے رہتے ہیں۔ جموں کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے بہار اور متھلا یونیورسٹی کے بھی وائس چانسلر رہے مرکز میں وزیر صحت ہو گئے اور بھی کئی مناصب پر فائز رہے۔۔۔ اب وہ سائیں بابا ہو چکے ہیں" (صفحہ ۲۸۸)۔ ان کی اپنی خودنوشت آشرم کے اواخر میں درج تھا "وہ انتہائی ارتقاعی روحانی تجربات

حاصل کرنے لگا ہے" (آشرم صفحہ ۲۱۲) وہاب اشرفی صاحب کی خودنوشت نے ان کی باتوں کی تصدیق کر دی ہے کہ پروفیسر آل احمد سرور کی خودنوشت کے تجزیہ میں میں نے لکھا تھا کہ وہ خود اپنے ہی اشعار سند کے طور پر پیش کرنے کی کم ذوقی کرتے ہیں (خواب باقی ہیں۔ صفحہ ۹۲)۔ وہاب اشرفی صاحب کی خودنوشت نے اس کی تصدیق بھی کر دی ہے کہ آل احمد سرور صاحب سے ملاقات ہوئی "زیادہ تر اپنے ہی اشعار کے حوالے دیتے رہے" (صفحہ ۲۷۵)

وہاب صاحب نے سیاسی مناصب حاصل کرنے کے لئے جو سعیء نامشکور کی اس کا ذکر نہ کرتے تو بہتر تھا ایسی باتیں ان کے بلند استادانہ مرتبہ کے منافی تھیں۔

سفر جاری ہے

''سفر جاری ہے'' لاہور کے مشہور پبلشر ملک مقبول احمد مالک مقبول اکیڈمی لاہور کی خود نوشت ہے جو جنوری ۲۰۰۷ میں چھپی ہے۔ لاہور کے پبلشرز میں فیروز سنز کے مولوی فیروز الدین کی خود نوشت ''جہاد زندگانی'' چھپ چکی ہے اور میں اس کا جائزہ بھی لے چکا ہوں مگر مقبول احمد صاحب کی خود نوشت دو وجہ سے ان سے الگ لگتی ہے۔ ایک تو یوں کہ مولوی فیروز الدین خود اچھے خاصے صاحب طرز مصنف تھے اور ان کے دعویٰ کے مطابق ان کی تصنیفات کی مقدار پچاس ہزار صفحات کے لگ بھگ ہوگی (جہاد زندگانی صفحہ ۷۵) مگر ملک صاحب کا اپنا علمی مطالعہ نہ ہونے کے برابر ہے اور کتابوں کے مواد کے سلسلہ میں بھی دوسروں پر اعتماد کرتے ہیں خود کسی کتاب کے مالہٗ وماعلیہ کا محاکمہ کرنے کے اہل نہیں۔

ملک صاحب سیالکوٹ کے ایک معمولی سے گاؤں میں ایک متوسط زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے تعلیم بھی میٹرک اور جے وی تک ہوئی پھر سکول میں استاد ہو گئے مگر بلند پروازی کا شوق انہیں لے اڑا۔ ماں باپ کے خدمت گذار بچے تھے اس لئے ان کی دعائیں انہیں لے چلیں۔

ہمارے ہاں کے پبلشرز کو ایک آسان نسخہ دوسروں کی کتابیں بلا اجازت یا عدم کاپی رائٹ کی وجہ سے چھاپنے کا ہاتھ آیا ہوا ہے۔ آپ نے بھی سید علی بلگرامی کی فرانسیسی سے ترجمہ شدہ کتاب ''تمدن عرب'' چھاپی (صفحہ ۱۲۱) اور اس سے خوب نفع بھی کمایا اور پبلشرز حلقوں میں نمایاں بھی ہو گئے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب India Wins Freedom ۱۹۵۹ میں چھپی تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ رئیس احمد جعفری صاحب سے اس کا ترجمہ کروایا اور پاکستان میں اس کا ایڈیشن چھاپ دیا۔ کتاب میں کہیں مذکور نہیں کہ آیا اس کتاب کا کاپی رائٹ آپ نے حاصل کیا یا

نہیں کیا۔ ایک جگہ تو آپ نے مولانا رئیس احمد جعفری صاحب کے اس کارنامہ کا ذکر بھی کیا ہے کہ مولانا ان اعتراضوں کا جواب بھی دیتے گئے جو ''مولانا ابوالکلام آزاد نے پاکستان پر کئے تھے'' (صفحہ ۱۱۹) اول تو آزاد کی کتاب ایک تاریخی کتاب ہے جس کا موضوع تحریک آزادی ہے۔ اس کتاب کے مندرجات میں کوئی ایسا اعتراض موجود نہیں جو پاکستان پر وارد ہوتا ہو۔ انہیں مسلم لیگ اور مسلم لیگ کی قیادت سے اختلافات تھے سو ان کا ذکر انہوں نے کھل کر کیا ہے ان اعتراضات سے زیادہ سخت اعتراضات تو مولانا نے کانگریس کی قیادت پر کئے تھے اور غالباً اسی لئے اس کے بعض حصوں کی اشاعت تیس سال کے لئے مؤخر کر دی گئی تھی۔ مولانا آزاد کے مقابلہ پر مولانا رئیس احمد جعفری کی علمی یا تاریخی حیثیت کیا ہے کہ وہ مولانا کے اعتراضات کا جواب دیتے؟ اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ملک صاحب چونکہ مولانا رئیس احمد جعفری کے ناولوں کے پبلشر اور مداح تھے اس لئے ان کے تاریخی تبحر پر بھی رطب اللسان ہیں۔ پبلشر کی حیثیت سے تو کاروباری لحاظ سے کامیاب ہو گئے مگر علمی حلقوں میں اپنی دھاک نہ بٹھا سکے۔ کتاب کے آغاز میں جو ایک درجن نامور ادیبوں کے توصیفیے ہیں وہ بھی اس خود نوشت کا ادبی مرتبہ نہیں بڑھا سکے۔

ملک مقبول احمد صاحب نے نامور ادیب مولوی محمد اسماعیل پانی پتی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ طیبہ پر سب سے مستند کتاب ''سیرۃ ابن ہشام'' حاصل کی اور اس کو چھاپنے کا ارادہ کیا۔ کہیں سے ان کو بھنک پڑ گئی کہ مولوی محمد اسماعیل پانی پتی کا تعلق ایسی جماعت سے ہے جس سے ملک صاحب کو اختلاف ہے۔ اس لئے آپ نے سیرۃ ابن ہشام کے ساتھ ان کا لکھا ہوا وہ معرکۃ الآراء دیباچہ حذف کر دیا جو اس کتاب کے ساتھ برسوں سے منسلک چلا آ رہا تھا اور اہل علم سے اپنے علمی لب ولہجہ کی وجہ سے داد وتحسین حاصل کر رہا تھا۔ یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ''ان کا عقیدہ خطرہ میں پڑ گیا تھا'' (صفحہ ۱۲۳)۔ رحمۃ اللعالمین کے مناقب میں لکھے ہوئے دیباچہ سے ملک صاحب کا کون سا عقیدہ خطرہ میں تھا؟ ان کے اس رویہ سے صرف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خود ان کی علمی حیثیت ایسی نہ تھی کہ دیباچہ پڑھ کر کسی فیصلہ پر پہنچتے۔ کسی مشیر نے کھٹکا دیا اور آپ نے ''احسان الحق سلیمانی صاحب سے نیا ترجمہ کروایا اور وہی چھاپا'' (صفحہ ۱۲۶) اور مولوی اسماعیل پانی پتی صاحب کا نہ صرف دیباچہ رد کیا اردو کے نامور اور بے مثال مترجم مولوی عنایت اللہ دہلوی کا ترجمہ

بھی رد کر دیا۔ تعصب بھی انسان سے کیسے کیسے غیر علمی کام کرواتا ہے۔ حیدر آباد اور دہلی میں پچاس برس تک اس ترجمہ سے کسی کا ایمان خطرہ میں نہ پڑا خطرہ پیش آیا تو صرف پنجاب کے ایک متعصب پبلشر کو پیش آیا۔ حالانکہ انہی مولوی اسماعیل پانی پتی صاحب نے نقوش والوں کے لئے بے مثال علمی کام اسرانجام دئے اور حکومت پاکستان سے حسن کارکردگی کا انعام بھی پایا۔ سیرۃ ابن ہشام تو زندہ کتاب ہے مگر ان کے ''نامور'' مترجم کا نام کون جانتا ہے؟ علمی کتابوں کے ساتھ ایسی ناانصافی کرنے والے پبلشر بھی ہمارے ہاں موجود ہیں۔

سفر جاری ہے میں ان کے خاندان کے حالات ان کے حج کے سفر کی روداد اور اولاد و احفاد کی تصاویر شامل ہیں۔ ایک باب معاصر ادبا شعرا کے حالات زندگی کا ہے ساتھ میں ان کی تصاویر بھی ہیں۔ کتاب کے آخر میں ضمیمہ کے طور پر خطوط جمع کر دئے گئے ہیں جن کا زیادہ تر تعلق ان کی توصیف و تعریف سے ہے۔ کتاب کا وزن اور حجم تو بہت بڑھ گیا ہے اور ڈاکٹر جاوید اقبال کے ''اپنا گریباں چاک'' کی طرح یہ کتاب پڑھنے والوں پر بھاری پڑنے لگی ہے۔

ایک باب آپ نے ''وکھری ٹائپ کے لوگ'' کے عنوان سے رقم کیا ہے جس میں ایک ادیب' ایک شاعر' ایک کالم نگار' ایک سکالر' ایک پروفیسر اور ایک اپنے جیسے پبلشر کی ''دیانت و امانت'' کو موضوع بنایا ہے۔ ہمیں تو شاعر والی بات پسند آئی۔ اس شاعر کا کلام آپ نے ایک معروف شاعرہ کے دیباچہ کے ساتھ شائع کیا۔ کتاب چھپ گئی تو دیباچہ نگار مذکور نے خط لکھا کہ انہوں نے سرے سے وہ دیباچہ لکھا ہی نہیں۔ ہمیں مشفق خواجہ یاد آئے جنہوں نے لکھا تھا کہ ایک صاحب نے ان سے دیباچہ لکھوانے کی خواہش کی۔ خواجہ صاحب نے عدم فرصت کی بنا پر معذرت کی تو صاحب دیوان نے جیب سے لکھا لکھایا دیباچہ نکالا اور کہا مجھے علم تھا آپ عدیم الفرصت آدمی ہیں اس لئے میں دیباچہ لکھ کر لے آیا تھا آپ اس پر دستخط کر دیجئے۔ لکھتے ہیں وہ دیباچہ پڑھا تو صاحب دیوان نے اپنا موازنہ میر و غالب سے کیا ہوا تھا۔ خواجہ صاحب نے کہا میں تو اس دیباچہ پر دستخط نہیں کر سکتا۔ اطمینان سے فرمانے لگے کوئی بات نہیں۔ دستخط نہیں کر سکتے تو نشان انگوٹھا ہی لگا دیجئے۔ محترمہ دیباچہ نگار خاتون خوامخواہ ناراض ہو گئیں ہو سکتا ہے انہوں نے دیباچہ تو نہ لکھا ہو نشان انگوٹھا لگا دیا ہو۔

✓

کچھ لمحے میرے نصیبوں کے

محمد اعظم سبزواری صاحب کی تلخ و شیریں حادثات اور واقعات پر مبنی آپ بیتی ''کچھ لمحے میرے نصیبوں کے'' کے عنوان سے کراچی لائبریری پروموشن بیورو کراچی یونیورسٹی کیمپس کراچی کی جانب سے ۲۰۰۷ میں چھپی۔ سبزواری صاحب کینیڈا کے علاقہ نیوفاؤنڈلینڈ میں مقیم ہیں۔

چھٹپنے میں اپنے خاندان کے ہمراہ ہجرت کر کے کراچی آ گئے مگر ان کے ابا نے ہندوستان میں اپنی ملازمت کو ترک کرنا پسند نہ کیا۔ مہاجرت کا یہ عرصہ تنگدستی میں بسر ہوا۔ باپ کی عدم موجودگی اور حالات کی نامساعدت کی وجہ سے ان کے بڑے بھائی اور ان کی والدہ اور بہنوں کو رشتہء جان و تن کو برقرار رکھنے کے لئے بے پناہ محنت کرنا پڑی۔ سبزواری صاحب نے ان مصائب کا ذکر بڑے انوکھے انداز میں کیا ہے ''اگر کوئی فرشتہ میری ماں کا کردار ادا کرتا اور ماں کے تمام دکھ اور درد سہتے ہوئے ان تمام مظالم اور بے دردیوں سے بھرے تیروں کو ماں کی طرح چھپائے رکھتا تو وہ فرشتہ اس کردار پر چیخ اٹھتا اور توبہ کرتا اور اللہ میاں سے عرض کرتا کہ مجھے کبھی کسی کی ماں نہ بنانا'' (کچھ لمحے میرے نصیبوں کے۔ صفحہ ۱۷)۔ مگر کتاب میں آگے چل کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے مصائب کا زیادہ تر تعلق خود ان کے اپنوں کے رویہ سے ہے۔ والد انہیں بے سہارا چھوڑ کر ہندوستان ہی میں ٹک گئے اور آئے بھی تو آتے ہوئے سارا اندوختہ اپنی بہن کو دیتے آئے تو اس میں ''اللہ میاں'' کا کیا قصور تھا؟ اس خود نوشت میں ناشکرے پن کا احساس نمایاں تر ہے۔ اپنے دوسرے لاکھوں ہم وطنوں کی طرح محنت مزدوری کی مگر اسی وطن پاکستان نے انہیں تعلیم حاصل کرنے کے مواقع بھی تو فراہم کئے جس کے باب میں لکھتے ہیں ''بس اب میں پاکستان کبھی نہیں

آؤں گا اس ملک سے میرا کوئی تعلق نہیں رہا اس ملک نے صرف مصائب اور تکلیفیں دی ہیں۔۔۔ اسلام کا ڈھونگ رچا کر ملک تو بنالیا۔۔۔ بلاوجہ ہندوستان سے علیحدہ ہوئے'' (صفحہ۹۲)۔ پھر جوں جوں کتاب آگے بڑھتی ہے یہ واضح ہونا شروع ہوتا ہے کہ ان کے مصائب کے ذمہ دار خود ان کے ''حاسد اور بیوقوف رشتے دار تھے'' (صفحہ۱۴۲)۔

کینیڈا میں آ کر نئی زندگی بنانے کا عزم صمیم ان کے کام آیا اور اسی کے سہارے مشکلات و مصائب سے عہدہ برآ ہوتے چلے گئے اور نئے وطن میں یہ عہد کیا کہ ''اپنے آپ کو کمتر مہاجر تصور نہیں کروں گا'' (صفحہ۱۲۳) اور ''پاکستانی جن گندی عادتوں میں ملوث ہیں'' (صفحہ۱۳۷) ان سے بچوں گا۔ یہ عہد نو ان کے کام آیا اور اب اپنے خاندان کے ساتھ اپنے نئے وطن کے پرانے اور وفادار شہری ہیں۔ کینیڈا میں آنے کے بعد لمبے عرصہ تک بھائی اور خاندان سے منقطع رہے اور پھر بھائی کو آ کر تجدید ملاقات کرنا پڑی۔ الحمدللہ کہ اب اپنے اہل خاندان سے ان کے تعلقات اخوت ومحبت کے ہیں۔

یہ مختصر سی خودنوشت کہانی کاری کے انداز میں ہے جس کے باب میں ابتدا میں افسانہ ہونے کا گماں گذرتا ہے۔ زبان و بیان بھی کوئی ایسا صاف نہیں۔ کچھ غلطیاں جو بظاہر کتابت کی غلطیاں لگتی ہیں خراماں خراماں کی بجائے ''خرامہ خرامہ'' (صفحہ۷۷ بار دگر صفحہ۱۱۰) عبارت میں راہ پا جاتی ہیں۔ طباعت صاف ستھری اور کتابت خاصی دلنشیں ہے۔ کتاب کا مجموعی تاثر ایک ایسی خود نوشت کا ہے جس کا مصنف اپنے ماضی سے نہ صرف غیر مطمئن ہے بلکہ اپنے ملک و وطن سے بیزار کن حد تک متنفر ہے۔ خدا کرے نئے وطن کے ساتھ ان کی وفاداریاں تر و تازہ اور تازہ دم رہیں۔

✔

ہوک

پنجابی فلموں کے مشہور کہانی کار اور اداکار رحیم خان عرف ''سکے دار'' کی خودنوشت ''ہوک'' حکایات پبلشرز چوک صفانوالہ ٹمپل روڈ لاہور کی طرف سے ۲۰۰۳ میں شائع ہوئی۔ مصنف کا تعلق فلمی دنیا سے ہے اور یہ بات ہم پہلے ہی کہے دیتے ہیں اور کئی بار کہہ بھی چکے ہیں کہ یہ میدان ہمارے لئے اجنبی میدان ہے۔ اس لئے سکے دار کا نام بھی ہم نے پہلی بار اس خودنوشت کے حوالہ سے سنا اور پڑھا۔ سکے دار لاہور کے قریب ایک قصبہ نیاز بیگ میں پیدا ہوئے وہیں پرورش پائی۔ نیاز بیگ میں مسلمانوں غیر مسلموں کی مخلوط آبادی تھی مگر ۱۹۴۷ کی تقسیم کے بعد غیر مسلموں کے انخلاء نے اس قصبہ کی رونقیں چھین لیں کیونکہ سارا کاروبار ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا۔ رحیم خان بچپن میں یتیم ہو گئے اس لئے ان کی جائیداد دوسروں کے تصرف میں چلی گئی مگر ایک رحمدل طوائف نے جس نے انہیں گود لے لیا تھا کوشش اور خرچ کر کے ان کی جائیداد غاصبوں سے انہیں واپس دلوائی۔

بچپن کا کچھ عرصہ اس طوائف کے ساتھ لاہور کے اس علاقہ میں گذرا جسے بدنام علاقہ سمجھا جاتا ہے مگر وہاں پرورش پانے کے باوجود ان کے اندر کے انسان نے دم توڑ نہیں دیا۔

اس خودنوشت کا اسلوب احوال الرجال کا اسلوب ہے جس میں فقیر خاندان کے فقیر اعجاز الدین کا ذکر بھی ہے مگر فلمی دنیا سے متعلق لوگ زیادہ تر مذکور ہیں تنویر نقوی بے بی نور جہاں، نور جہاں کی بڑی بہن عیدن، اور فلمی دنیا کے بے شمار لوگ آتے اور اپنی ذرا سی جھلک دکھا جاتے ہیں سکے دار نے یہ خودنوشت محض اپنی تنہائیوں کا مداوا کرنے اور ماضی کو یاد کرنے کی کوشش میں لکھی ہے اس لئے زمانی یا مکانی ترتیب بھی اس میں نہیں بایں ہمہ لاہور کی سماجی اور معاشرتی زندگی کی تصویر کشی بڑی بھرپور ہے۔

بمبئی کے سفر پر گھر سے بھاگ کر روانہ ہوئے تو ساتھی رستہ میں چھوڑ گیا۔ واپسی پر ایک نیک آدمی سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ ہم یہ پڑھ کر حیران رہ گئے کہ اس زمانہ میں بھی شہادت کا کاروبار کرنے والے موجود تھے ان کی زبان سے ہی بات سنئے ''ایک سیاہ رنگ کا دیو قامت آدمی سامنے آ کھڑا ہوا۔ کہنے لگا آج کل یہاں سکھوں اور مسلمانوں میں ایک مسجد کا جھگڑا اچل رہا ہے۔ ہر روز ایک مسلمان مسجد میں اذان دینے جاتا ہے سکھ اس کو شہید کر دیتے ہیں میں تمہیں وہاں لئے چلتا ہوں باری باری تم کو شہید کروادوں گا تمہاری عاقبت سنور جائے گی'' (ہوک صفحہ ۶۷)۔ شہید ہونے کا پیغام سن کر ہم دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ تب اس نے ان سے سامان وغیرہ لے کر ان کی عاقبت سنوارنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

بے بی نور جہاں کی پہلی پہلی نعت کا ذکر ہے ''اشتہارات میں بے بی نور جہاں کا زندہ ناچ گانا لکھا تھا لوگ ہیرا منڈی کے سینما پر ٹوٹ پڑے۔ بے بی کے اسٹیج پر آنے سے پہلے ایک اونٹ سٹیج پر لایا گیا۔ اونٹ پر ایک باریش آدمی عربی لباس پہنے سوار تھا اونٹ کے بعد بے بی نور جہاں سٹیج پر آئی اس نے کالا لباس پہن رکھا تھا اور آنکھوں میں آنسو تھے گانا نعتیہ تھا

''سن لے شتر سوار
جب تو پہنچے کالی کملی والے کے دربار''

بے بی نور جہاں کے منہ سے روتی آنکھوں کے ساتھ نعتیہ کلام سن کر تماشائیوں کی آنکھیں نم ہو گئیں'' (صفحہ ۴۷)

سب سے دلچسپ واقعہ تو سندھ کا ہے جہاں یہ فقیر وحید الدین صاحب کے بھائی فقیر اعجاز الدین کے پاس گئے ہوئے تھے۔ تنویر نقوی کے گاؤں گئے تو ان کے بھائی نے بتایا کہ ''اس کا ایک طوطا مر گیا جسے اس نے بڑے اہتمام سے دفن کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہاں جانا ہوا تو معلوم ہوا کہ اس طوطے کی قبر پر پیر ستار شاہ کا عرس شریف ہو رہا ہے'' (صفحہ ۱۴۳)

غرض سکے دار کی یہ خود نوشت ایسے ہی مزیدار ٹوٹکوں کی وجہ سے پڑھنے کی چیز ہے۔ اگر چہ غیر پنجابی شاید اس میں مذکور پنجابی فقروں اور محاوروں سے زیادہ لطف اندوز نہ ہو سکیں۔

پرواز

ہندوستان کے قابلِ قدر اور قابلِ افتخار شہرہ ءآفاق مسلمان سائنسدان اور موجودہ صدر مملکت اے پی جے عبد الکلام کی خود نوشت ''پرواز'' کے نام سے بک ہوم بک سٹریٹ مزنگ روڈ لاہور نے ۲۰۰۶ میں شائع کی۔ یہ کتاب انگریزی میں لکھی گئی یا تامل میں اس کا کوئی ذکر نہیں مگر ترجمہ حبیب الرحمٰن چغتائی صاحب نے کیا ہے اور خوب کیا ہے۔ کسی سائنس دان کی سائنسی اصطلاحات اور سائنسی اداروں کے مخففات سے بھرپور کتاب کا اس سے بہتر ترجمہ ممکن نہیں تھا۔

جناب عبد الکلام کا پورا نام ''ابوالفاخر زین العابدین عبد الکلام ہے'' (پرواز صفحہ ۱۵۶) انگریزی مخففات میں اگر جے کا حرف ہے تو اس لئے ہے کہ ان کو سب لوگ مدراس کے عام لہجہ کے مطابق جین العابدین کہہ کر پکارتے تھے ان کے والد گرامی کا نام بھی زین العابدین ہے اور انہیں بھی کتاب میں کئی جگہ جین العابدین لکھا گیا ہے۔ ان کی یتیم بھتیجی جس کی شادی میں شرکت کو آپ نے اپنے کام کے انہماک میں نظر انداز کر رکھا تھا کا نام بھی ''زمیلہ'' لکھا ہے حالانکہ اس کا سیدھا سادہ نام جمیلہ ہے (صفحہ ۱۴۰) اور پی کا حرف ہے تو اس لئے کہ ف کو تامل لوگ پ سے بولتے ہیں جس طرح ترکی لوگ اللہ اکبر کی بجائے اللہ اچبر کہتے ہیں اور یہ ''اچبر'' کانوں کو بھلی لگتی ہے۔ یہ لہجوں کے کرشمے ہیں۔ انسانوں کے چھوٹے بڑے ہونے سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے سادہ طور اطوار والے منکسر المزاج صدر کی خود نوشت پڑھتے ہوئے ہمیں اپنے صدور کی خود نوشتیں یاد آ رہی ہیں۔ صدر ایوب خاں کی ''جس رزق میں آتی ہو پرواز میں کوتاہی'' اور حال ہی میں چھپنے والی صدر پرویز مشرف کی ''گولیوں کی زد میں'' کہاں یہ انسانیت کی سطح پر رہنے والا فروتنی کا مجسمہ اور کہاں ہمارے رعونت اور دبدبے سے پھٹتے ہوئے

زمین پر اکڑ اکڑ کر چلنے والے لوگ! صدر عبدالکلام کی خودنوشت ہانکے پکارے کہہ رہی ہے۔ الٰہی کون ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش۔ ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے۔ اے کاش ہمیں بھی کوئی ایسا ہی خدا کا بندہ مل جاتا۔ ہمیں تو جو "محسنِ" پاکستان "سائنسدان" میسر آیا ہے اس کا طمطراق اور تبختر ہی کسی جامہ میں نہیں سماتا۔ اے کاش اس کے محاسن پر رطب اللسان ہونے والے اس خودنوشت کو بنظرِ انصاف پڑھیں اور دو سائنسدانوں کا موازنہ کر کے سبق حاصل کریں۔

جناب عبدالکلام کی خواہش تھی کہ وہ پائیلٹ بنیں۔ پائیلٹ نہ بن سکے مگر راکٹ کی اڑان کا کارنامہ سرانجام دے لیا اسی لئے ان کی خودنوشت کا عنوان "پرواز" ہے۔ ارادوں کی بلندی اور مقصد کی سربلندی اس کتاب کا خلاصہ ہے۔ سب سے احسن بات یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے حتی الوسع انہوں نے اپنے ملکی وسائل سے کام لیا دوسرے ترقی یافتہ سائنسدانوں سے علمی استفادہ تو ضرور کیا ان کے دست نگر نہیں ہوئے۔ اگنی میزائل کے سلسلہ میں لکھتے ہیں "اگنی آواز سے بارہ گنا زیادہ تیزی سے فضا میں دوبارہ داخل ہو سکتا تھا ہمیں اس کا قطعی تجربہ نہیں تھا کہ اس غیر معمولی رفتار پر وہیکل کو کس طرح قابو رکھا جائے۔ ہمارے پاس کوئی ہوائی سرنگ نہیں تھی جو اس تجربہ کے لئے اتنی رفتار پیدا کر سکے۔ اگر ہم نے اس سلسلہ میں امریکہ سے امداد لی ہوتی (تو وہ نہ دیتا) اگر وہ رضامند ہو بھی جاتا تو اپنی ہوائی سرنگ کی قیمت ہمارے پورے بجٹ سے یقیناً زیادہ بتاتا۔ اب سوال یہ تھا اس نظام کو کس طرح شکست دی جائے ۔۔۔۔ ہم نے چار ہونہار سائنسدانوں کو ڈھونڈھ نکالا جنہوں نے چھ ماہ کے اندر (مطلوبہ) سوفٹ وئیر کو فروغ دیا یہ دنیا میں اپنی نوعیت کا واحد سوفٹ وئیر ہے۔۔۔ اس نوعیت کا سوفٹ وئیر ہمیں کسی ملک نے نہیں دیا تھا بلکہ ہم نے خود دیسی انداز میں (اسے) فروغ دیا تھا" (صفحہ ۱۶۴)۔ ایسی ہمت کو ہی ہمت مرداں مدد خدا کہا جاتا ہے۔ پھر انہیں اس بات پر بھی فخر ہے کہ "ہم نے ایک سال میں جو کام کیا یورپ والے اسی کام کے لئے تین سال لیا کرتے تھے" (صفحہ ۷۵)

ڈاکٹر عبدالکلام سائنسدان ہیں اور وہ بھی ہمارے ڈاکٹر عبدالسلام کی طرح اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ "سائنس خدا سے دور لے جانے کا رستہ نہیں" (صفحہ ۲۵)۔ ان کی خودنوشت مذہبی صحائف کے حوالوں سے بھری پڑی ہے اور ان حوالوں میں زبور، بائیبل، وید کے حوالے دئے

گئے ہیں حتیٰ کہ قرآن پاک کے حوالے بھی کثرت سے موجود ہیں۔ پندھرواں باب "مراقبہ" تو سورۃ واقعہ کی اس آیت کے حوالہ سے شروع ہوتا ہے کہ 'علیٰ اَن نُبدِّلَ اَمثالَکُم وَ نُنشِئَکُم فی ما لا تَعلَمُون۔ (القرآن سورۃ واقعہ ۵۶/۶۱)۔ (ترجمہ یوں درج ہے بدلے میں لے آئیں تمہاری طرح کے لوگ اور اٹھا کھڑا کریں تم کو وہاں جہاں تم نہیں جانتے)۔ ایک مسلمان سائنسدان کی اسلام سے گہری وابستگی کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

امریکہ میں ناسا NASA کے تعلیماتی دورہ پر گئے تو وہاں انہیں استقبالی دروازہ پر آویزاں ایک پینٹنگ نظر پڑی۔ غور سے دیکھا تو اس پینٹنگ میں انہیں جنوبی ایشیا کے چہرے نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ وہ پینٹنگ ٹیپو سلطان کے راکٹوں کی تصویر ہے جو اس نے انگریز فوج کے خلاف استعمال کئے تھے اس لئے ان کا یقین ہے کہ "ہندوستان نے جو راکٹ بنائے ہیں وہ در اصل ٹیپو سلطان شہید کے راکٹوں کی تجدید کا حکم رکھتے ہیں" (صفحہ ۵۵) اور ہندوستان میں اسلامی فکری بالادستی کا آئینہ۔

جرمن راکٹ سائنس دان فان براؤن نے امریکہ کا SATURN راکٹ ایجاد کیا تھا جس کے ذریعہ انسان چاند پر گیا تھا۔ فان براؤن سے ڈاکٹر عبدالکلام کی گہری دوستی اور عقیدت تھی۔ انہوں نے امریکیوں کے بارہ میں کہا کہ وہ "ہر غیر ملکی کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ NIH یعنی not invented here کے خبط میں مبتلا ہیں جس کی جڑیں بہت گہری ہیں اس لئے اگر تم راکٹ کا علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو خود اسے کرو" (صفحہ ۱۰۸) فان براؤن کی شخصیت کا ان پر بہت اثر تھا یہ خود بھی "بابائے راکٹ کی طرح منکسر المزاج ادراک پذیر اور حوصلہ افزائی کرنے والے تھے (صفحہ ۱۰۷) اپنی ہر کامیابی کا کریڈٹ اپنی ٹیم کو دیتے اور ناکامی ہوتی تو اس کی ذمہ داری حتی الوسع اپنے سر لیتے۔ پہلی بار راکٹ کو کامیابی سے داغا تو لکھا "سارا کریڈٹ اس شخص کو ملنا چاہیئے جس نے اس جانب کوشش کا آغاز کیا" (صفحہ ۱۲۱) ہمارے ہاں ایٹمی توانائی کی بنیاد رکھنے والے سائنس دان ڈاکٹر عبدالسلام کا نام لینا بھی گناہ ہے۔ ایٹمی پروگرام کو شروع کرنے اور اس کی بنیادوں کو مضبوط کرنے والے سیاست دان بھٹو کا نام لینا ممنوع ہے۔ سارا کریڈٹ اس سیاست دان کا ہے جس کے عہد نامسعود میں ایٹمی تجربہ کیا گیا اور ساری کامیابی اس شخص کی ہے

جسے ایٹمی سائنس کی الف ب کا پتہ نہیں تھا اس کام کو سرانجام دینے والے ایٹمی سائنس دان ثمر مبارکمند اور دوسرے جیسے محض گوشت پوست کے لوتھڑے تھے۔ جب ٹی وی پر اس فتح مندی کی خبر سنائی جارہی تھی تو ثمر مبارکمند اس متمرد شخص کے ساتھ بیٹھے تھے گویا اس کام سے ان کا کوئی تعلق اور واسطہ ہی نہ ہو۔ ادھر ڈاکٹر عبدالکلام کا حال یہ تھا کہ فرمارہے تھے ''راکٹ لانچنگ کا سارا کریڈٹ مجھے نہیں میرے ساتھیوں کو جاتا ہے'' (صفحہ ۵۱)۔

سائنسی تحقیقات کا سفر محض کامیابیوں کا ہی سفر نہیں ہوتا ناکامیاں بھی سدراہ بنتی رہتی ہیں۔ راکٹ لانچنگ میں ناکامی ہوئی تو خوب تضحیک و تمسخر کا نشانہ بھی بنے اخباروں نے کارٹون بنائے کالم نگاروں نے مضحکہ اڑایا مگر ناکامیاں کامیابیوں کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ ایک تجربہ ہؤا تو عین تجربہ کے وقت ان کے ایک ساتھی سائنس دان کے کسی عزیز کی وفات ہوگئی جو اس کو نہ بتائی گئی۔ تجربہ ناکام ہوگیا تو آپ نے اسے تسلی دی اور رخصت بھی عطا کی اس نے وعدہ کیا کہ وہ تین دن میں اپنے کام پر واپس آجائے گا تاکہ اگلا تجربہ کیا جاسکے۔ وہ واپس آگیا۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے'' کہ ایسے بہادر لوگوں کے سوانحی خاکے کبھی کسی تاریخی کتاب میں نہیں لکھے جائیں گے مگر یہی گمنام لوگ ہوتے ہیں جن کی مسلسل کوششوں کی بدولت نسلیں پروان چڑھتیں اور قومیں ترقی کرتی ہیں'' (صفحہ ۱۶۷)۔

تضحیک کا نشانہ بنے تو بھی حوصلہ نہیں ہارا بلکہ خود اپنے اوپر ہنسنے کا حوصلہ بھی ان میں ہے ایک کارٹون کا ذکر کرتے ہیں کہ ''سدھیر درنے کارٹون بنایا کہ ایک دکاندار ایک صنعت کار کو اس کی بنائی ہوئی چیز واپس کررہا ہے اور ساتھ میں کہہ رہا ہے یہ واپس لے جاؤ کہیں یہ بھی اگنی میزائل کی طرح واپس نہ آجائے''۔۔۔ اسی طرح ایک اور کارٹون والے نے اگنی میزائل کو IDBM یعنی intermittently delayed Ballistic Missile قرار دیا ایک کارٹون والے نے تو یہ مشورہ دیا تھا اب اگنی میزائل میں کوئی اور ایندھن استعمال کرنے کی بجائے اپنے ملک کا بنا ہؤا ''مکھن'' استعمال کرنا چاہیئے'' (صفحہ ۱۷۷) مگر ان تمام تر تضحیکات کے باوجود حوصلہ نہ چھوڑا اور اپنے استاد فان براؤن کی نصیحت پر قائم رہے کہ ''راکٹ کے علم کو پیشہ نہ بناؤ اپنا مذہب اور مشن بناؤ'' (صفحہ ۱۰۸)۔

جب کامیابی سے راکٹ چھوڑ چکے تو وزیراعظم اندرا گاندھی نے ملاقات کے لئے طلب کیا

۔ لکھتے ہیں ملاقات میں سب سے بڑی رکاوٹ میرا لباس تھا'' میں حسب عادت کپڑے اور سلیپر بے قاعدگی سے پہنے ہوئے تھا جو آداب مجلس کے کسی بھی معیار کے مطابق وزیراعظم سے ملاقات کے لئے مناسب لباس نہیں تھا۔ جب میں نے اپنے ساتھی پروفیسر دھون سے اس کے بارے میں بتایا تو انہوں نے کہا کہ میں اپنے لباس کے بارہ میں بالکل پریشان نہ ہوں تمہاری کامیابی نے تمہیں خوبصورتی سے ملبوس کردیا ہے'' (صفحہ ۱۲۱)۔ لباس سے ہمیں ہندوؤں کے رہنما گاندھی کی یاد آئی۔ وہ دوسری گول میز کانفرنس میں گئے تو حسب دستور ملک معظم نے مندوبین کو بکنگھم پیلس میں کھانے پر بلایا۔ گاندھی جی نے دعوت تو قبول کرلی مگر اپنے لباس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ آخر شاہ برطانیہ انہیں ان کے معمول کے لباس میں بقول چرچل ''نیم برہنہ فقیر کے لباس میں'' ملنے پر رضامند ہوگئے اور تمام تر رسوم و آداب و قواعد کو بالائے طاق رکھ دیا۔

Lord Templewood. نے اپنی خودنوشت Nine Troubled Year خودنوشت میں اس واقعہ کا ذکر بڑی حیرت سے کیا ہے۔

ان کے محسن بہنوئی کی وفات ہوئی تو اتنے بڑے عہدے پر ہوتے ہوئے بھی ''بسیں بدلتے بدلتے اپنے شہر پہنچے'' (صفحہ ۱۰۱) پھر جب کامیابی سے ہمکنار ہوئے تو اپنی بھتیجی (زمیلہ) جمیلہ کی شادی کے دن انہیں کسی اعلیٰ لیول کی اہم میٹنگ میں شریک ہونا تھا۔ آپ اس بھتیجی کے واحد گارڈین تھے مگر شادی کا معاملہ پس پشت ڈال دیا اور کام سے فارغ ہونے کے بعد ان کے کسی ساتھی نے حکام بالا کو بتایا کہ انہیں کس طرح اپنے فرائض کی ادائیگی میں اپنے شہر پہنچنا ہے۔ مدراس تک ہوائی جہاز میں گئے اور وہاں سے ائیرفورس کا ہیلی کاپٹر انہیں لے کر ان کی منزل مقصود تک پہنچا اس طرح اپنے فرض سے ادا ہوئے۔ ڈاکٹر عبدالکلام نے ایسا انتظام کرنے والوں کے لئے حد سے زیادہ ممنونیت کا اظہار کیا ہے۔ (صفحہ ۱۴۰) ہمارے ہاں تو ماشاء اللہ اعلیٰ ترین عدالتوں کے سربراہ اپنے لئے ایسی مراعات ببانگ دہل طلب کرتے ہیں جن کا انہیں استحقاق ہی نہیں ہوتا۔ کجا مانند مسلمانی؟

نیلسن منڈیلا کے ساتھ انہیں بھی ایک یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی ڈگری عطا کی۔ (صفحہ ۱۸۹) اسی طرح مدورائی کامراج یونیورسٹی میں کانووکیشن ایڈریس دینے گئے تو ''میں نے ہائی سکول کے استاد دورائی سولومن کے بارہ میں معلوم کیا جو اس وقت ریوریند تھے اور ان کی عمر اسی سال تھی۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ مدورائی کے مضافات میں رہتے ہیں میں نے ٹیکسی لی اور ان کے گھر کا پتہ لگانے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ ریورینڈ سولومن کو اس بات کا علم تھا کہ میں اس دن جلسہ تقسیم اسناد میں خطبہ دینے والا تھا مگر وہ وہاں نہیں جا سکتے تھے ہم وہاں کسی نہ کسی صورت میں پہنچ ہی گئے استاد شاگرد کی ایک مدت کے بعد ملاقات کا منظر بہت دلگداز تھا تامل ناڈو کے گورنر ڈاکٹر سی پی الیگزینڈر اس تقریب کے صدر تھے وہ یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوئے کہ ایک اتنے بزرگ استاد اپنے ایک دیرینہ شاگرد کو بھلا نہیں سکے۔ انہوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ڈائس پر تشریف لائیں'' (صفحہ ۱۸۸)

ڈاکٹر عبدالکلام کی خودنوشت میں یہ واقعہ پڑھ کر ہمیں دو باتیں یاد آ رہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ڈاکٹر عبدالسلام جب دہلی میں کانووکیشن ایڈریس دے رہے تھے تو ان کی نگاہ اپنے سکول کے ایک پرانے استاد پر پڑی جو سامعین میں دور کہیں بیٹھے تھے ڈاکٹر سلام سیدھے اپنے استاد کے پاس پہنچے۔ اپنا نوبل میڈل اتار کر ان کے گلے میں ڈال دیا اور انہیں وزیراعظم ہند کی موجودگی میں سٹیج پر لے آئے۔ دوسرا واقعہ ابھی حال ہی میں مرحوم ہونے والے پروفیسر کے کے عزیز نے پروفیسر سراج کے احوال میں لکھا ہے کہ ہندوستان کی وزارت خارجہ کے ایک بڑے افسر پاکستان کے سرکاری دورہ پر آنے والے تھے انہوں نے پاکستان میں اپنے ہم مرتبہ کو جوان کی طرح گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم اور نامور استاد پروفیسر سراج کے شاگرد تھے خط لکھا کہ وہ سرکاری فرائض کی انجام دہی کے بعد پروفیسر سراج سے ملاقات کرنا چاہیں گے اس لئے اس کی گنجائش ان کی مصروفیات میں رکھی جائے۔ پاکستانی بیوروکریٹ نے اپنے استاد پروفیسر سراج کو حکم نامہ لکھا کہ حکومت ہند کے اتنے بڑے افسر سرکاری دورہ پر اسلام آباد آ رہے ہیں وہ ان سے ملنے کے خواہشمند ہیں اس لئے از راہ کرم ان دنوں میں اسلام آباد میں موجود رہیے۔ پروفیسر سراج کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ آپ نے جواب دیا میں علیل ہوں اس لئے سفر کر سکتا ہوں نہ اسلام آباد میں موجود رہ سکتا ہوں اس لئے ملاقات سے قاصر ہوں۔ وہ افسر آئے۔ سرکاری مصروفیات کے بعد پروفیسر سراج سے ملاقات کے انتظام کا پوچھا تو ہمارے افسر نے پروفیسر سراج کا ''گستاخانہ'' خط ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ وہ صاحب سر پیٹ کر رہ گئے کہ بھلے آدمی میں نے کب کہا تھا کہ میرے محترم استاد کو زحمت دی جائے میں تو خود ان کی خدمت میں جہاں کہیں وہ پاکستان میں رہتے ہیں جا کر ملاقات کرنا چاہتا

ہوں۔ چنانچہ وہ پاکستانی بیوروکریٹ بادل ناخواستہ اپنے ہمکار کو لے کر لاہور آئے اور پروفیسر سراج کے دولت خانہ پر حاضر ہوئے۔ وہ ہندستانی افسر جب تک پروفیسر سراج کے کمرہ میں موجود رہا ان کے برابر کرسی پر بھی نہیں بیٹھا سارا وقت ان کے چرنوں میں بیٹھا رہا۔ اب تو زمانہ بدل گیا ہے زمانہ کی قدریں بھی بدل گئی ہیں۔ پروفیسر کے کے عزیز کی یہ نصیحت آب زر سے لکھنے کی ہے کہ ''جو قومیں اپنے عظیم آدمیوں کو فراموش کر دیتی ہیں ان میں رفتہ رفتہ عظیم آدمی پیدا ہونا ہی بند ہو جاتے ہیں''
(عظیم آدمیوں کی یاد میں۔ صفحہ ۸۴)

اب اس عظیم مسلمان سائنس دان کے رہن سہن کا بھی سن لیں ''دس فٹ لمبا بارہ فٹ چوڑا کمرہ۔ کرائے کا فرنیچر کتابیں اور کاغذات'' (صفحہ ۱۸۵) ''میں نے کچھ جمع نہیں کیا گھر بار نہ بیٹے نہ بیٹیاں'' اور اس عظیم شخص کی خودنوشت کا اختتام یوں ہے ''دوسروں کے لئے میں کوئی مثال قائم نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ کچھ نہ کچھ لوگ اس سے فیض حاصل کر سکتے ہیں۔ اور اس مطلق سکون کے توازن تک رسائی پا سکتے ہیں جو صرف فرشتوں کی زندگی ہی میں پایا جا سکتا ہے۔ توفیق الٰہی تمہاری میراث ہے میرے پردادا اول (ابول) میرے دادا پاکھر (فاخر) اور میرے باپ جین العابدین (زین العابدین) کا سلسلۂ نسب تو عبدالکلام پر ختم ہو سکتا ہے مگر اللہ کی رحمت کبھی ختم نہیں ہونے والی کیونکہ وہ لازوال ہے'' (صفحہ ۲۰۷)۔ اور قارئین اللہ تعالیٰ کی رحمت سے قوی امید رکھنے والے اس سادہ نیک دل مسلمان کو مملکت ہند کی صدارت کے عہدے پر فائز دیکھ رہے ہیں۔ **و تُعِزُّ مَن تشاءُ وَ تُزِلُّ مَن تَشاءُ بِیدکَ الخیر۔**

یہ خودنوشت ایسی ہے کہ ہمارے لوگوں کو سبقاً سبقاً پڑھنی چاہیے۔

ہم نے اس خودنوشت کا ہندوستان میں چھپنے والا اصل ایڈیشن دیکھا تو حیران رہ گئے۔ بک ہوم والوں نے اپنے ایڈیشن میں اتنی تحریف روا رکھی ہے کہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کیا پائیریٹ ایڈیشن چھاپنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے مندرجات میں تحریف کر دی جائے اور تصویریں جن سے کتاب کو توثق حاصل ہوتا ہے بالکل ہی غائب کر دی جائیں۔ اے کاش ہمارے بک ہوم والے ایسی بات سے مجتنب رہتے۔

✓

کیا دن تھے

ہندوستان کے پرانے کانگریسی مسلمان رہنما اور سابق وزیر قاضی جلیل عباسی کی خود نوشت ''کیا دن تھے'' دسمبر ۱۹۸۵ میں دہلی اور لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ قاضی جلیل عباسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق طالب علم تھے اور اس بات پر ہمیشہ مفتخر رہے کہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر یونیورسٹی سے نکالے گئے تھے۔ گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں۔

یہ خودنوشت ''ایک قدامت پرست زمین دار خاندان سے تعلق رکھنے والے نوجوان کی داستان آشفتہ سری ہے جس نے معاشرہ کی صالح اور صحت مند روایات کا لحاظ رکھتے ہوئے قدامت پرستی کی بیڑیوں کو کاٹنے اور اپنے حالات گردوپیش سے نبرد آزما ہونے کی کوشش کی'' (کیا دن تھے صفحہ ۱۳) زمینداری کا عالم بھی اتنا ہی تھا کہ ان کے والد صاحب کی تین چار سو بیگھہ زمین تھی اور ان کا خاندان بھرا پرا خاندان تھا، ماشاءاللہ چھ بھائی اور تین بہنیں تھیں اس لئے ایک متوسط معیشت سے ان کا تعلق تھا۔ زمین کا انتظام ان کے بھائی کرتے تھے اور بڑے بھائی کو ہمیشہ اپنے باپ کی جگہ ہی سمجھتے رہے کہ یہی ہمارے مسلمان اشرافیہ کا دستور زندگی تھا۔ گھر کا ماحول سیاسی نہیں تھا ان کے بڑے بھائی قاضی عدیل عباسی تحریک خلافت میں جیل میں چلے گئے تو ان کے دادا جان کا انتقال اس غم میں ہو گیا کہ ان کی اولاد جیل چلی گئی (صفحہ ۱۷)۔ قاضی جلیل بھی کٹر کانگریسی رہے اور ''پاکستان کو نفرت کے بیج کا پھل ہی سمجھتے رہے'' (صفحہ ۱۴۴)

اس کتاب کا دیباچہ علی سردار جعفری نے لکھا ہے کہ وہ ان کے صاحب سخن بھی تھے اور سیاسی ہمسفر بھی بلکہ ایک موقعہ پر قاضی صاحب کو دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے ہوئے تھے علی

سردار جعفری نے ''اپنا جیتا ہوا سونے کا تمغہ بیچ کر ان کی مدد کی'' (صفحہ ۶۲)

قاضی صاحب کی یہ خودنوشت ایک مخلص اور وفادار سیاسی کارکن کی خودنوشت ہے جس میں کوئی بڑائی یا تفاخر کی بات نہیں نہ پرایوں پر بدظنی کا کوئی شائبہ ہے۔ ان کا سیاسی کیریئر اپنے بڑے بھائی قاضی عدیل عباسی کے سائے میں شروع ہوا اور قدم قدم پر ان سے رہنمائی حاصل کرتے رہے وہ ایم ایل بھی رہے اور وزیر بھی رہے مگر ان کی طبیعت میں جوش اور ولولہ زیادہ ہی تھا پھر سیاسی تقریریں کرنے بھی انہیں شوق تھا علی سردار جعفری نے لکھا ہے کہ ایک بار تقریر کرتے کرتے بیہوش بھی ہو گئے (صفحہ ۱۰) یہ بیہوش ہونے کی روایت تو کانگریسی رہنماؤں کی پرانی روایت ہے۔ جناب مہدی علی صدیقی نے اپنی خودنوشت ''بلا کم وکاست'' میں لکھا ہے کہ ''کرشنا مینن یو این او میں تقریریں کرتے ہوئے بے ہوش ہو جاتے تھے اور اس کا سننے والوں پر بہت اثر پڑتا تھا'' (بلا کم وکاست صفحہ ۱۷۲)۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ہوتے ہوئے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے قیام میں رخنے ڈالتے رہے (صفحہ ۲۹) بلکہ اس کا سلسلہ دور تک چلا۔ کلکتہ میں بھی مسلم سٹوڈنٹس کے قیام کا خدشہ محسوس ہوا تو کرایہ مانگ تانگ کر وہاں بھی پہنچ گئے۔ مسلم لیگ کے خلاف ان کا بغض کوئی ڈھکا چھپا راز نہیں۔ علی گڑھ سے نکالے گئے تو ''دن بھر ہم لوگ کنستر لئے گھومتے رہتے کنستر کو الٹا کر کے میں اس پر کھڑا ہو جاتا اور تقریر کرتا۔۔۔ ہماری سٹول میٹنگ شروع ہو جاتی اس چھوٹے سے مجمع کو میں لاکھوں کا مجمع تصور کر کے گلا پھاڑ پھاڑ کر مسلم لیگ کے خلاف تقریر کرتا'' (صفحہ ۵۷) فرماتے ہیں ''مسلم لیگ نے ذہنوں کو اتنا مسموم کر رکھا تھا کہ اچھا خاصا مسلمان آسانی سے بہک جاتا تھا۔ جھوٹے پروپیگنڈے اس شدومد سے ہوتے تھے کہ لوگ جھوٹ کو آسانی سے سچ مان لیتے تھے مثلاً ایک جگہ میں نے مسٹر محمد علی جناح کی تصویر دکھا کر مسلمانوں کو سمجھانا چاہا کہ جناح صاحب کے داڑھی نہیں ہے اور وہ بالکل انگریز کی طرح رہتے ہیں ان کو نماز روزے سے کوئی سروکار نہیں ان کی بیوی پارسی ہے اور اس کے برعکس مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کی تصویر دکھا کر یہ ثابت کرنا چاہا کہ یہ ایک عالم دین ہیں اور اس وقت ہندوستان کے

علمائے دین میں ان کا ایک مقام ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ کلکتہ میں عید کی نماز کھلے میدان میں جہاں لاکھوں کا مجمع ہوتا ہے مولانا آزاد ہی پڑھاتے ہیں اس پر مجمع میں سے ایک مسلمان فوراً ہی کھڑا ہو گیا اور بولا صاحب جھوٹ کیوں بولتے ہو؟ توبہ توبہ مولانا جناح صاحب کے بارہ میں ایسی بات کہتے ہو۔ ان کے پیچھے میں نے خود نماز پڑھی ہے اور مسٹر ابوالکلام آزاد کی تصویر وہ ہے جو آپ جناح صاحب کی بتا رہے ہو آخر دھوکا کیوں دیتے ہو" میں اس کا منہ تکتا رہ گیا" (صفحہ ۱۳۲) جہاں تک داڑھی کی بات خود جناب قاضی جلیل عباسی کی جو تصویر اس کتاب میں شامل ہے اس میں ان کی بھی داڑھی نہیں ہے اور نماز روزہ کا معاملہ ان کا ذاتی معاملہ ہے اس کا ان کے سیاسی مسلک سے کوئی تعلق نہیں۔ خدا معلوم سیاسی اختلافات کو ہوا دیتے وقت لوگ بنیادی اخلاقی باتوں کو نظر انداز کیوں کر دیتے ہیں؟

شیخ عبداللہ ان کو اس لئے اچھے لگتے ہیں کہ انہوں نے "کشمیر کو پاکستان میں جانے سے روکا تھا" (صفحہ ۱۳۹) پاکستان کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں "ابھی جانے پاکستان کے کتنے ٹکڑے ہونگے؟" (صفحہ ۱۳۶) مگر قاضی صاحب کا انصاف انہیں یہ بات کے کہنے کی اجازت نہیں دیتا کہ ہندوستان کے صرف ٹکڑے ہی نہیں ہونگے اتنے حصے بخرے ہونگے کہ ان کی نسلیں ہی معدوم ہو جائیں گی۔

قاضی صاحب کانگریس کے ہی نہیں نہرو خاندان کے وفادار ہیں۔ جواہر لال نہرو کے بعد اندرا گاندھی پھر سنجے گاندھی اور پھر راجیو۔ ان کے نزدیک کانگریس اور ہندوستان محض کانگریس کا نہیں نہرو خاندان کا نام ہے۔

اس خودنوشت کی سب سے اچھی بات ان غریب سیاست دانوں کا ذکر خیر ہے جو اہم عہدوں پر فائز رہنے کے باوجود جب فارغ ہوئے تو غریب کے غریب ہی تھے کسی نے پھوٹی کوڑی تک جمع نہیں کی تھی۔ "ایک گورنر حافظ محمد ابراہیم کی قبر پر ان کے مرنے کے بعد کتے لوٹتے تھے کہ ان کے وارثوں کو اس کی قبر کو پختہ کروانے کی مقدرت نہیں تھی۔" ــــــ "بیمار ہوئے تو علاج کروانے کے لئے ان کے پاس پیسے نہیں تھے" (صفحہ ۱۶۱۔۱۶۲)۔

رفیع احمد قدوائی تو ان کے سیاسی مرشد تھے ان کی توصیف تو انہیں کرنا ہی تھی مگر باتیں کھری اور سچی ہیں "رفیع صاحب کا مکان کچا تھا جو بعد میں ان کے بھائی اور بھائی کے لڑکوں نے پختہ کروایا" (صفحہ ۱۵۵) "ان کا جنازہ مسولی آیا تو جنازہ کے آگے ایک آدمی پاگلوں کی سی حرکتیں کرتا تھا کبھی ہنستا تھا کبھی روتا تھا اور کہتا تھا واہ کیا شان سے آئے ہو۔ آج تو فوجی گاڑی اور توپ بندوق کلکٹر کمشنر چیف منسٹر منسٹر سب ساتھ ہیں اس سے پہلے تم سرکاری گاڑی پر بھی گاؤں نہیں آئے تھے" (صفحہ ۱۵۵)۔ کیا ہمارے ہاں بھی کسی وزیر کے جنازہ پر کسی نے ایسا نوحہ کیا ہو گا؟

ایک غریب کانگریسی ساتھی کے گھر جواہر لال نہرو ملنے کو آئے۔ وہ دروازہ پیٹتے رہے لیکن اس دوست کی بیوی نے دروازہ نہیں کھولا اس لئے کہ اس کے پاس ایک ہی ساری تھی اور وہ اس نے دھو کر سوکھنے کو ڈال رکھی تھی اور خود ایک چادر لپیٹے بیٹھی تھی بھلا وزیر اعظم کے لئے وہ دروازہ کیسے کھول دیتی؟ (صفحہ ۱۶۷)

"یہ ایک پر جوش اور شوریدہ سر نوجوان کی داستان ہے جو طالب علم کی حیثیت سے میدان سیاست میں کودا تھا اس کے سر میں صرف آزادیٔ وطن کا سودا تھا" (صفحہ ۲۱۸) اور آزادیٔ وطن کے بعد وطن نے اس کے جذبۂ حب وطن کی قدر کی وہ پارلیمنٹ کا ممبر بنا وزیر بھی رہا مگر وہی شوریدہ سر اور غریب مزاج سیاست دان رہا جسے اپنا نہیں اپنے وطن کا مفاد عزیز تر ہے۔ اس خود نوشت کا مزاج اپنے وطن سے محکم وفاداری ہے اور یہی چیز ایک سیاست دان کو کامیاب سیاست دان بناتی ہے۔

✓

بیتی کہانی

ریاست پٹودی کی نوابزادی شہر بانو بیگم دختر نواب اکبر علی خاں رئیس پٹودی کی خودنوشت ''بیتی کہانی'' کے عنوان سے القمرانٹر پرائزز اردو بازار لاہور نے ۲۰۰۶ میں شائع کی۔ اس خود نوشت کے مرتب کرنے اور اس کے تحشیہ وتعلیقہ پر کراچی یونیورسٹی نے ڈاکٹر معین الدین عقیل کو ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری تفویض کی ہے۔ مرتب کے قول کے مطابق یہ خودنوشت اردو کی اولیں نسوانی خودنوشت اور تاریخ پٹودی کا بنیادی ماخذ ہے۔

مصنفہ نے اس کتاب کے لکھنے کا سبب یوں بیان کیا ہے کہ ''۱۲ مئی ۱۸۸۵ کو ایک مس فلیچر کی مجھ سے ملاقات ہوئی۔'' (بیتی کہانی صفحہ ۴۲) پھر اس کتاب کے اواخر میں مس فلیچر کا کچھ ذرا سا احوال بھی لکھا ہے ''(انکی معالج ڈاکٹر تھورن نے) کہا کہ ایک مس فلیچر صاحبہ نامی تھوڑا عرصہ ہوا ولایت سے تشریف لائی ہیں اور بہت شریف اور خاندانی ہیں اور وہ بالکل اردو نہیں جانتیں اگر تم کہو تو میں ان کو تمہارے پاس لاؤں تم ان کو اردو بولنا سکھانا وہ تمہیں کتابیں پڑھائیں گی تمہاری دل لگی خوب ہو جائے گی۔ میں نے کہا بہت اچھا چنانچہ دوسرے روز مس تھورن صاحبہ آپ کو لے کر میرے مکان پر آئیں مجھے یاد ہے کہ ۲۱ مئی ۱۸۸۵ تھی جو پہلے پہل میرے مکان پر آئیں اسی روز سے میں آپ کو اردو سکھانے لگی اور آپ نے مجھ کو اردو کی پہلی کتاب شروع کرائی۔ کوئی آٹھ مہینے گذرے ہونگے کہ اس عرصہ میں آپ سے میں چاروں کتابیں اردو کی پڑھ چکی تھی'' (صفحہ ۱۲۷)

۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ''انگریزوں کی وفاداری کی وجہ سے ریاست پاٹودی کی جاگیر محفوظ رہی'' (صفحہ ۶۰) اس لئے یہ ریاست اور اس سے ملحقہ ریاستیں زمانہ کی

دست برد سے ایک حد تک محفوظ رہیں۔ شہر بانو بیگم ۱۸۴۸ میں پیدا ہوئیں۔ اور ابھی خوشی کے شادیانے بج رہے تھے کہ رئیس جھجر نواب عبدالرحمن خاں ان کے ہاں تشریف لائے بیٹی کی پیدائش کا سن کر بیٹی کو منگا یا دیکھا اور اسی وقت اپنے بیٹے محمد نور علی خاں سے ان کی نسبت طے کردی۔ اسی دن منگنی کی رسم بھی بڑے کروفر سے ہوئی (صفحہ ۴۹) اور جب یہ ''پانچ برس کی ہوئیں تو نواب صاحب نے شادی کا پیغام میرے ابا جان کو بھیجا دونوں طرف سے بیاہ کی تیاریاں ہونے لگیں بھلا نواب صاحب کا تو کہنا کیا وہ تو بارہ محال کے مالک تھے انہوں نے تو ڈھائی لاکھ روپے اس شادی میں لگا دئے'' (صفحہ ایضاً) ''میں نگوڑی پانچ برس کی جان بھلا مجھ کو کیا خبر کہ نکاح کس کو کہتے ہیں اور شادی کیا چیز ہے'' (صفحہ ۵۰)۔

غرض یہ خودنوشت امرا کے چاؤ چونچلوں کی منہ بولتی تصویر ہے۔ جہاں اس دور کے رسوم و رواج کا ذکراذکار ہے وہاں مسلمان رؤسا کی بے محابا فضول خرچیوں کا رونا بھی ہے۔ بیاہ کر جھجر چلی گئیں واپس ہوئیں تو ''نہیں معلوم کس کم بخت کل جنی کا ٹوکا لگ گیا اور کسی چڑیل کی بدنظر اثر کرگئی کہ سارے عیش اور کھیل کود کی کسر نکل گئی۔ نواں برس کیا شروع ہوا کہ ایک آفت کا گولا ٹوٹ پڑا'' (صفحہ ۵۳) اس کے بعد ۱۸۵۷ کے حالات ہیں کہ اس خاندان پر کیا بیتی۔ ''ریاست کی فوج نے جب جھوٹی کمک آنے کی خبر سنی تو سب مردانگی بھول گئے اور ایسے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا کیا پیادہ کیا سوار کوئی بھی نہ ٹھہرا۔۔۔۔ ابا جان فیل خانہ سے ہاتھی منگوا کر جھجر کی طرف روانہ ہوئے'' (صفحہ ۵۶) دہلی کی فتح کی خبر آئی تو انگریزوں نے ان کے سسر نواب جھجر کو پھانسی کی سزا دے دی ریاست ضبط ہوئی اور اہل وعیال جلاوطن کئے گئے۔ ان کے شوہر کو بھی لدھیانہ جانے کا حکم ملا۔ اس کے بعد باقی زندگی ان کی کبھی لودھیانہ اور کبھی دہلی میں بسر ہوئی۔ وثیقہ بند ہوگیا تو خرچ کے لالے پڑ گئے۔ ایک وفادار ایوب بیگ نے آخر وقت تک ان کا ساتھ دیا۔ ان کے شوہر تو آخر نواب زادے تھے نوابانہ سرگرمیوں یعنی جوئے میں ایسے پڑے کہ کھک ہو گئے۔ دو وقت کی روٹی کو محتاج ہو گئے۔ دہلی سے شوہر کے بلاوے پر لدھیانے پہنچیں تو گھر کا حال عبرت انگیز طور سے بیان کیا ہے ''گھر کو جو دیکھتی ہوں تو عجب حال ہے جیسے کوئی لوٹ کر لے گیا۔

مکان کے صحن میں کیا دیکھتی ہوں کہ گھوڑے بندھے ہوئے ہیں ہر طرف کوڑے کرکٹ کے انبار لگے ہوئے ہیں کوٹھڑی کے آگے ایک پلنگ بچھا ہے اور اس پر ایک میلی کچیلی مٹی کے رنگ کی چادر کسی ہوئی ہے جس کے دیکھنے سے گھن آتی ہے اس کے آگے ایک تخت بچھا ہے اسپر ایک میلا چیکٹ دستر خوان کا چیتھڑا پڑا ہے۔ اس میں دو تین روٹیاں بیسنی خشک لپٹی دھری ہیں میں نے جانا کسی ماما اصیل کی روٹی رکھی ہے اور ایک کونے میں فتیل سوز رکھا ہے۔۔۔ جل کر میں نے کہا یہ تخت پر کس کا چیتھڑا پڑا ہے اسے تو اٹھاؤ۔ ماما نے جواب دیا ''بیوی یہ تو سلامتی سے میاں کا کھانا دھرا ہے خدا رکھے ابھی کھانا کھانے بیٹھے تھے کہ اتنے میں آپ کی سواری آئی'' (صفحہ ۱۰۶)

اس کے بعد ان کی غربت اور عسرت کا دور شروع ہوتا ہے بیتی کہانی ہر ورق پر عبرت ناک ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ نواب زادی جو ایک امیرانہ ماحول میں پیدا ہوئی تھی غربت کی چکی میں پسنے لگتی ہے۔ ایوب بیگ نامی وفادار خادم نے ساتھ نہ دیا ہوتا تو در در کی خاک چھانتی پھرتیں۔ بیتی کہانی کا خاتمہ بھی یوں ہے ''سوائے مرزا ایوب بیگ کے انہوں نے البتہ میری ایسی رفاقت کی کہ اپنی قدامت کا حق ادا کر دیا اگر یہ شخص میری رفاقت نہ کرتا تو آج مجھ کو بھیک تک نہ ملتی یہ اسی شخص کا حسن انتظام تھا کہ اس وقت میرے قرضے کا کہ جو چار ہزار روپیہ کا میرا خاوند چھوڑ کر مرا تھا بندوبست کیا علاوہ دشمنوں کی زد سے مجھ کو بچایا اور آج تک آبرو کے ساتھ گھر میں بیٹھی ہوں اور جو کارخانہ میرے خاوند کے وقت میں تھا اس وقت تک بدستور موجود ہے اگر اس شخص کا شکریہ میرا ایک ایک رونگٹا ادا کرے تو نہیں ہو سکتا'' (صفحہ ۱۲۹)۔ یوں اس وضع دار نواب زادی کی داستان اختتام کو پہنچتی ہے۔ بعد کے حالات معلوم نہیں نہ ہی صاحب تحشیہ نے ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

ہمارے ہاں پاٹودی کے نواب زادہ شیر علی خاں کی خودنوشت موجود ہے اس میں شہر بانو بیگم کا کوئی ذکر اذکار نہیں ہے سچ ہے غریب رشتہ داروں کو کون یاد رکھتا ہے؟ اور یہی دنیا کا دستور ہے۔

✓

شاد کی کہانی شاد کی زبانی

خان بہادر مولانا سید علی محمد شاد عظیم آبادی کی خودنوشت ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' انجمن ترقی ءاردو ہند علی گڑھ نے شائع کی۔ کتاب پر سن اشاعت درج نہیں مگر مرتب کے دیباچہ پر نومبر ۱۹۵۸ کی تاریخ درج ہے۔ یہ خودنوشت شاد کے شاگرد پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی نے مرتب کی ہے مگر ہدیہ ءتشکر کے عنوان سے مرقوم ہے کہ ''یہ کہانی خبر نہیں کب تک ان کہی رہ جاتی اگر اس پر فضیلت مآب ڈاکٹر ذاکر حسین گورنر بہار کی جوہر شناس نظر نہ پڑ جاتی اور آپ کی خاص توجہ نصیب نہ ہوتی۔ آپ نے اپنے زیرِ نگرانی اس کتاب کے فرسودہ مالیدہ ژولیدہ مسودہ کی تبییض صرف کاتب کے حوالہ نہ کی بلکہ اکثر منتشر اجزاء کو بدقت نظر دستِ خاص سے نقل کیا۔ اس کتاب کی تدوین و اشاعت سراسر آپ کی علم دوستی ادب نوازی اور ایثار کی رہین منت ہے۔ فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔ مانمانیم ایں بماند پائیدار''۔

مرتب کا کہنا ہے کہ ''آخر ۱۹۲۱ کے لگ بھگ سید صاحب نے خود ایک مبسوط سوانح حیات میری طرف سے صیغہ غائب میں لکھ کر اس کا نام کمالِ عمر رکھا اور یہ غیر صاف شدہ مسودہ سینکڑوں صفحوں پر محیط میرے حوالہ کر دیا مجھے بڑا سکون اور اطمینان ہوا کہ ایک بڑی مشکل حل ہو گئی۔ اپنے قلم سے حیات شاد میں واقعات تبصرہ و تنقید میں کسی اونچ نیچ پاسداری یا صاف گوئی کا الزام میرے سر نہ رہے گا بڑا بوجھ ہلکا ہو گیا'' (شاد کی کہانی شاد کی زبانی صفحہ ۴)۔ آگے وضاحت کی گئی ہے کہ ''اگرچہ یہ تبصرہ مؤلف نے میری طرف سے صیغہ ءغائب میں لکھا ہے مگر میں اسے اپنی طرف منسوب کرنا جائز و قرینِ دیانت نہیں سمجھتا۔ شروع و آخر یا درمیان میں جو مجھے شرح کرنی پڑی ہے عرض مرتب کے عنوان سے کر دی ہے اس کتاب کا نام استاد نے کمالِ عمر رکھا تھا مجھے اس نام

میں اصل موضوع کی طرف انتقالِ ذہنی کی صنعت نظر نہ آئی۔ اس لئے میں نے شاد کی کہانی شاد کی زبانی کے نام سے موسوم کیا'' (صفحہ ۵)۔ شاد کی کہانی شاد کی زبانی کا ایک نسخہ معارف پریس اعظم گڑھ میں بھی اسی سال چھپا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ۱۹۶۴ میں جب میں اردو ناول کے ابتدائی دور پر تحقیقی کام کر رہا تھا ایک آغاز وانجام سے معریٰ ایک بے سروپا نامکمل نسخہ مجھے کسی پرانے کتب فروش سے دستیاب ہوا تھا اس کا عنوان تھا ''شاد کی کہانی کچھ شاد کی کچھ میری زبانی'' میرے پرانے لکھے ہوئے نوٹس میں ان کے ناول ''صورۃ الخیال'' کے سلسلہ میں بس اتنا ہی لکھا ہوا محفوظ رہ گیا ہے۔ پھر شاد کا ایک فقرہ بھی سیاق وسباق سے ہٹ کر درج ہے کہ ''حضرت شاد کا قد مبارک پانچ فٹ سے ذرا ہی کم تھا'' اب جو مسلم صاحب کے مرتب کردہ نسخہ کو دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ وہ نسخہ شاید اس خودنوشت کا جعلی ایڈیشن تھا جو پاکستان میں کسی نے چھاپ لیا تھا۔ حیف کہ میرا کتب خانہ زمانہ کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اس نسخہ میں صیغہء غائب کے لئے حضرت شاد کا قرینہ مذکور تھا مگر اس نسخہ میں شاد کا نام نہیں سید صاحب کا قرینہ اختیار کیا گیا ہے۔ سید صاحب کے قد مبارک کے سلسلہ میں اس نسخہ میں جو فقرہ درج ہے وہ یوں ہے کہ ''سید صاحب کا قد وقامت چار فٹ اور کئی انچ ہے'' (صفحہ ٦٢) مگر اس نسخہ میں یہ فقرہ یوں مذکور نہیں تھا۔ میں نے حمید نسیم کی خود نوشت ''ناممکن کی جستجو'' کے تجزیہ کے سلسلہ میں اس بات کا ذکر از رہِ تعریض کیا تھا (پس نوشت صفحہ ٦٧) اب اصل نسخہ کی دستیابی کے بعد یہ سب کچھ بے محل معلوم دیتا ہے۔ بہر حال مجھے خوشی ہے کہ اب مجھے شاد کی کہانی شاد کی زبانی کا مستند نسخہ دستیاب ہے اور میں اس کا تجزیہ لکھ رہا ہوں۔

سید صاحب نے لکھا ہے کہ ''ان کی سوانح عمری پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ جن اوصاف کے وہ مجمع ہیں شاید قوم بھر میں چند ہی لوگ ایسے نکلیں تو نکلیں'' (صفحہ ۱۱) اور اردو زبان کی شاعری کی تکمیل کے وہ اوصاف کیا ہیں ان کی تفصیل بھی مذکور ہے ''۱۔ صحت نسب کئی پشتوں کی خوش حالی و عزت ۲۔ خود اس شخص کا فطری زکی وصاحبِ ذوقِ سلیم ہونا۔ ۳۔ اتنی خوش حالی کہ طلب معیشت سے فارغ البال رکھے۔ ۴۔ شوق تحصیل علوم ضروریہ اور قابل ولائق استادوں سے مقدمات علمیہ کا حاصل کرنا۔ ۵۔ پرانے وقت اور نئے زمانے کے سنجیدہ ماہرین کی صحبت۔ ٦۔ ہر طبقہ کے لوگوں سے واقف کاری اور ان کی خاص خاص باتوں اور اصطلاحوں پر اطلاع۔ ۷۔ خاص اس فن کی

کتابوں پر عبور۔ ۸۔ مختلف مذاق میں اور مختلف طریقہء شاعری میں قوت امتیاز۔ ۹۔ مذکورہ بالا باتوں کے حاصل ہونے پر بھی اسی کی مشق اور دھن میں ایک مدت دراز تک لگے رہنا۔ ۱۰۔ ساتھ اس کے کثرت سے معترضوں کی نکتہ چینیاں اور اعتراضوں اور نکتہ چینیوں پر انصاف سے نظر ڈالتے رہنا۔ ۱۱۔ زندگی میں ایسے واقعات کا پیش نہ آنا کہ تحصیل وتکمیل میں خلل انداز ہو جائیں۔ ۱۲۔ ساتھ اس کے طوالت عمر کیونکہ اگر باوجود ان سب باتوں کے کم عمر میں مرجائے گا تو مطلب حاصل نہ ہو سکے گا'' (صفحہ ۱۱) شاد نے اپنی کہانی میں ان تمام باتوں کو درجہ بدرجہ اپنی زندگی پر منطبق کر کے ثابت کیا ہے کہ ان کی زندگی نہایت کامیابی اور کامرانی کی زندگی ہے مگر اس بات کا اعتراف بھی موجود ہے کہ ان کی غفلت اور اپنے علمی اشغال میں حد سے زیادہ مشغولیت کے باعث ان کی وجہ معاش کو بہت نقصان پہنچا ہے جو ان کی اولاد کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوا۔ ان کے ملازم جن پر حد سے زیادہ اعتماد کرتے رہے ان کو نقصان پہنچانے کے درپے رہے اور ایک کارندہ تو ہزاروں روپیہ غبن کر کے دریا میں ڈوب کر مر گیا۔

فنی لحاظ سے میر انیس سے مرثیہ کی طرز کو بدلنے کی تجویز کی۔ میر انیس نے کہا کہ ''اگر محض روایات صحیحہ اور تاریخی واقعہ تک مرثیہ کو محدود رکھا جائے گا تو میکی (کذا؟) وموثر نہ ہوگا۔ جو صاحب ہم پر ایسی فرمائش کرتے ہیں وہ خود دس بند نظم کر کے دیکھیں تو حال معلوم ہو'' (صفحہ ۴۷) ''اس تاریخ سے لے کر بیس برس تک میں مرثیہ دس پانچ بند اپنے طور پر کہتا او جب دوسرے وقت اس پر نظر کرتا تو وہ بند لچر اور مبتذل معلوم ہوتے اور پھاڑ کر پھینک دیا کرتا اس مدت میں خدا جانے کتنے بند کہے مگر کامیاب نہ ہوا یہاںتک کہ آرزو دل ہی میں رہ گئی اور میر مونس اور میر انیس کا انتقال بھی ہو گیا'' (صفحہ ۴۸) سید صاحب کی انصاف پسندی کی داد دینا پڑتی ہے۔ یہ سب کچھ ان کے بیان کردہ اصول نمبر نو کی تفسیر تام ہے۔

ابنائے وطن کی اصلاح کے لئے ''نوائے وطن'' نامی کتاب تصنیف کی مگر اس پر وہ طوفان اٹھا کہ الامان والحفیظ آخر خود ہی وہ کتاب جلا کر خاک کر دی (صفحہ ۸۳) اور دوستوں نے مشورہ دیا کہ ایک تحریر اس مضمون کی لکھ کر شائع کی جائے کہ ''ہم نے نوائے وطن میں جو کچھ لکھا ہے محض حماقت کی ہے اس کے علاوہ کوچہء شعر وشاعری وزبان دانی سے محض نابلد ہوں اور اب میں کوئی

تصنیف شائع نہ کروں گا۔۔۔یہ تحریر لکھ دیجئے یا اپنی جان و آبرو سے ہاتھ دھوئیے۔'' سید صاحب نے جواب دیا ''میں نے محض خلوص محبت سے اپنے ہم وطنوں کے لئے یہ کتاب لکھی ہے اور امید ہے کہ انشاء اللہ یہی مخالفت ثمرہ نیک دکھائے گی اگر میں ایسی عبارت لکھ دوں تو اپنے وطن کے ساتھ دشمنی کروں یہ مجھ سے ہرگز نہیں ہوسکتا چاہے میرے ہم وطن مجھ پر کسی قسم کا وار کریں مجھ کو ہرگز شکایت نہیں ہے اور نہ میں کبھی ان باتوں کا جواب دوں گا'' (صفحہ ۸۷)۔ سید صاحب ثابت قدم رہے مگر کتاب کو تلف کر دینے کا قدم انہیں اٹھانا پڑا۔

غرض شاد کی کہانی ان کی عمر بھر کی ادبی کاوشوں کی دلسوز کہانی ہے مگر اواخر عمر میں سید صاحب از حد دل گرفتہ تھے۔ ''میں نے اپنی سوانح تمیں جزو میں لکھ کر اپنے ایک قابل شاگرد کو سپرد کر دی ہے اور وصیت کر دی ہے کہ میرے مرنے کے بعد ضرور چھپوا کر عبرت کے لئے مشتہر کرنا خدا کرے آپ زندہ رہیں اور یہ کتاب آپ کے اور میرے مشہور روزگار بھائی رائٹ آنریبل مسٹر سید امیر علی صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کی نظر سے گذرے موصوف الیہ میرے بہنوئی مولوی سید وارث علی کے چھوٹے بھائی اور مجھ پر بہت مہربان تھے'' (صفحہ ۲۴۸)۔

اس خود نوشت میں ان کے بھانجے نواب نصیر حسین خیال کا ذکر بھی نہ ہونے کے برابر ہے اسی طرح سید علی امام کا ذکر بھی محض ذکر کے طور پر ہے۔ انگریزوں اور ملکہ برطانیہ کے ساتھ البتہ اپنی وفاداری کا ذکر مبالغہ کے ساتھ ہے مگر حیف کہ انہیں اس سے یا نظام دکن کی مدح سے کوئی مالی منفعت حاصل نہ ہوئی۔ وفات کے وقت ان کی اولاد ضعیف تھی مگر ان کا سایہ اٹھ جانے کے بعد اسی واحد ''ضعیف الخلقت'' بیٹے نے اپنی اولاد کو اچھی تعلیم دلائی اور اپنے پاؤں پر کھڑا کیا۔ گویا سید صاحب اپنی زندگی میں اس بیٹے پر حد سے زیادہ اور ناروا طور پر مستولی و مسلط رہے کہ اسے اپنی مرضی سے کچھ کرنے کہنے کا موقعہ ہی نہ ملا۔ باپ کا سایہ اٹھ جانا اس کے لئے باعث رحمت و برکت ہوا اور اس نے اسی ضعیف و نقصان شدہ معیشت کو سلیقہ سے استعمال کر کے خاندان کی عزت و آبرو بچالی۔

تیسرا جنم

معذور مگر جواں ہمت ڈاکٹر خالد جمیل اختر کی خود نوشت ''تیسرا جنم'' کے عنوان سے زیب پبلشرز، اردو بازار لاہور نے ۲۰۰۵ میں شائع کی ہے۔ ڈاکٹر خالد جمیل اختر ڈاکٹری کی تعلیم کے دوران ہی موٹر کے ایک حادثہ میں ریڑھ کی ہڈی پر ناقابل علاج چوٹ کے نتیجہ میں جسمانی طور پر معذور ہو گئے مگر ہمت نہیں ہاری تعلیم مکمل کی۔ ہمارے ہاں جسمانی طور پر معذور افراد جن مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں ان کا بڑی پامردی سے مقابلہ کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد معذور افراد کی مدد کو اپنا مشن بنایا اور اسی شعبہ کے ایک خاص میدان میں سپیشلائزیشن کی اور اب خدمت خلق پر مستعد ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ہمت اور حوصلہ میں برکت دے اور انہیں دکھی انسانیت کی خدمت کی توفیق دیتا چلا جائے۔ تعلیم کے دوران ان کی ایک ہم جماعت طالبہ شانزے نے جس ہمدردی اور محبت سے ان کی دیکھ ریکھ کی وہ بھی اپنی مثال آپ ہے۔ شانزے فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے گلاب۔ شانزے کی ہمدردی کی خوشبو گلاب کی خوشبو کی طرح کتاب میں رچی بسی ہوئی ہے۔ اور ان کی رفیقہ حیات فرح تو مسلسل ان کی قربانی میں شریک ہے۔ دنیا ایسے ہی باہمت لوگوں کی وجہ سے خوبصورت لگتی ہے۔

اسی طرح کا ایک حادثہ ہمارے ایک عزیز اور بزرگ دوست کے بیٹے کو پیش آیا تھا وہ پیدائش کے چند مہینے کے اندر پولیو جیسی موذی مرض کا شکار ہوا۔ اس وقت ابھی پاکستان میں اس موذی مرض کا کوئی علاج میسر نہیں تھا مگر ماں باپ نے ہمدرد ڈاکٹروں کی مدد سے دن رات ایک کر کے اس بچے کو پالا پوسا پڑھایا۔ ڈاکٹر بنایا۔ اس کی شادی کی اور وہ بھی ماشاء اللہ بال بچوں والا

ہو کر انسانیت کی خدمت پر مستعد رہا مگر ستم ظریفی کہ ایک معمولی سی قابل علاج بیماری کے نتیجہ میں رہگزائے قضا ہو گیا۔ اس کی بیگم اب اس کے بچوں کو اسی پیار سے پرورش کر رہی ہے۔ اس کے ابا ائیر مارشل ظفر احمد چوہدری نے جو پاکستان کی فضائیہ کے چیف آف سٹاف بھی رہے اس بچے کی شفایابی پر اللہ تعالیٰ کی شکر گذاری میں انگریزی میں ایک کتاب بھی لکھی ہے جس کا عنوان تھا Miracles do Happen اور اس کتاب کو عام اشاعت کی غرض سے بلا معاوضہ تقسیم کیا تھا۔ ہم نے ڈاکٹر خالد جمیل اختر کی خود نوشت کو بھی اسی زمرہ میں رکھا ہے۔ دیباچہ نگار ڈاکٹر اجمل نیازی کا خیال ہے کہ یہ کتاب ''خواب اور انقلاب کی سرحد پر بیٹھ کر لکھی گئی ہے'' (تیسرا جنم صفحہ ۳) مگر ایسی کتابیں خوابوں میں نہیں لکھی جاتیں جیتے جاگتے ہوش و حواس میں تصنیف ہوتی ہیں۔ اسی سلسلہ کی ایک اور کتاب ڈاکٹر فاطمہ شاہ کی کتاب ''دھوپ چھاؤں'' ہے۔ ڈاکٹر فاطمہ شاہ بھی متذکرۃ الصدر دونوں افراد کی طرح ڈاکٹر تھیں۔ شومیٔ قسمت کہ جوانی ہی میں بینائی کھو بیٹھیں مگر حوصلہ نہیں کھویا۔ نابینا افراد کے ملکی غیر ملکی اداروں کے ساتھ خدمت پر مستعد رہیں۔ افراد تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ نیکی کو دوام رہتا ہے۔

ڈاکٹر خالد جمیل اختر کی تعلیم کیڈٹ کالج پٹارو میں ہوئی۔ پاکستان کے صدر جناب آصف علی زرداری بھی ان کے ساتھ پٹارو میں زیر تعلیم تھے اور ''۱۹۷۲ میں سندھ میں اردو کے خلاف مہم چلی تو ان میں علامہ مشرقی کا پوتا بھی شامل تھا۔۔۔ انہی میں ایک اور نام آصف علی زرداری کا بھی تھا'' (صفحہ ۹۸)۔ مگر اس دور میں جب سارا میڈیا صدر کے خلاف صف بستہ ہے ڈاکٹر خالد جمیل اختر ان کے باب میں رطب اللسان ہیں ''آصف کھیلوں اور دوسری سرگرمیوں میں زیادہ حصہ نہیں لیتا تھا البتہ اسے گھڑ سواری کا بہت شوق تھا دوستی کا بہت پاس کرنے والا شخص تھا بعد کی زندگی میں جب زرداری کی محترمہ بے نظیر بھٹو سے شادی ہوئی تو آپ دیکھیں کہ اسے زیادہ بدنام اس کے دوستوں نے ہی کیا۔ میرا خیال ہے میڈیا نے اس کی ذات کو بہت مسخ کر کے پیش کیا ہے۔ اس کے برعکس وہ ایک ذہین اور بہادر انسان ہے اور جیل کے اندر ہو یا باہر مردانگی سے سب کچھ برداشت کرتا ہے۔ میرے خیال میں وہ وقت آنے پر دوستوں کی مدد کرنے کی وجہ سے

مشکلات کا شکار ہوا ہے۔'' (صفحہ ۹۹)۔

ڈاکٹر خالد جمیل نے معذور بچوں خاص طور سے ایسے بچوں کو جنہیں میڈیکل کی اصطلاح میں منگول بچے کہا جاتا ہے کی بہبود پر بہت کام کیا ہے۔ اتفاق یوں ہے کہ ہم نے کچھ عرصہ پہلے ابوالامتیاز ع۔ س۔ مسلم صاحب کی خود نوشت لمحہ بہ لمحہ زندگی پڑھی ہے جس میں ان کے ایسے ہی معذور بچے کا ذکر ہے اور جس کی تعلیم پر مسلم صاحب نے خاص توجہ دی ہے تیسرے جنم میں بھی اس کا ذکر خیر ہے۔ ''مسلم صاحب کا اپنا بیٹا نیاز مسلم ذہنی طور پر معذور تھا۔ مسلم صاحب ایک ممتاز صنعت کار ہیں وہ چاہتے تو اسے مہنگے سے مہنگے ادارے میں داخل کروا سکتے تھے لیکن انہوں نے ایک تنظیم SINOZA قائم کی جس کے تحت انہوں نے اپنے بیٹے کے لئے ایک سکول قائم کیا سائی نوزا اس وقت کراچی کا فعال ترین ادارہ ہے'' (صفحہ ۴۸۰)۔ بہر حال نیک کام کی خوشبو دور دور تک پھیلتی ہے۔

ڈاکٹر خالد جمیل میو ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں ڈیوٹی دے رہے تھے تو قتیل شفائی صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی (صفحہ ۳۴۱) فیض صاحب نے تو ایک شعر بھی انہیں سنایا ''اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں۔ ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں'' (صفحہ ۲۸۷) مگر سب سے دلچسپ ملاقات طفیل ہوشیارپوری صاحب کی ہے اس کی روداد انہی سے سنئے۔ طفیل ہوشیارپوری پیٹ کی تکلیف کی وجہ سے ہسپتال میں آئے۔ یہ انہیں سپیشلسٹ ڈاکٹر نصرت اللہ چوہدری کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ''دیوار پر لگی ہوئی ایک بڑی سی نالی کی طرف اشارہ کیا اس نالی سے معائنہ کرنا پڑے گا

کوئی مضائقہ نہیں۔

پھر کچھ دیر ٹھہر کر (طفیل صاحب کہنے لگے) کیا اسے حلق میں اتاریں گے؟

نہیں اسے پاخانہ والی جگہ سے اتاریں گے تاکہ انتڑیوں کا معائنہ کیا جا سکے۔

طفیل ہوشیارپوری پوری طرح خاموش ہو گئے پھر کہنے لگے کیا یہ معائنہ ایک دو ماہ لیٹ ہو سکتا ہے؟

کیوں؟

"میری شاعری کی ایک کتاب زیر طباعت ہے مکمل ہونے دیں۔ کیونکہ اس معائنہ کے بعد میری شاعرانہ حس تو ختم ہو جائے گی۔ اور پھر یہ کتاب مکمل کرنا ناممکن ہو جائے گا" (صفحہ ۳۴۶)۔ خدا معلوم طفیل صاحب کی کلونوسکوپی ہوئی یا نہیں؟ اور اگر ہوئی تو ان کی شاعری کی کتاب کا کیا بنا؟

غرض یہ کتاب دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی اور سب سے بڑھ کر یہ ایک مخلص اور ہمدرد ڈاکٹر نے انسانوں کی بہبود کے جذبہ سے سرشار ہو کر لکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی سعیٔ کو سعیٔ مشکور بنائے اور ان کو اور ان کے شرکاء کو جزائے جزیل عطا فرمائے۔ آمین۔

✔

کچھ یادیں کچھ باتیں

مولانا محمد اسلم جیراج پوری کے پوتے اور مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر ڈاکٹر شمیم جیراج پوری کی خودنوشت "کچھ یادیں کچھ باتیں" کے عنوان سے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی کی طرف سے ۲۰۰۲ میں شائع ہوئی ہے۔ ڈاکٹر شمیم جیراج پوری اپنے دادا کے برعکس اسلامیات کی بجائے حیاتیات کے ایک خاص شعبہ کے ماہرین اختصاص میں شمار ہوتے تھے اور علی گڑھ یونیورسٹی کے سب سے کم عمر ڈی ایس سی یعنی ڈاکٹر آف سائنس کی اعلیٰ ترین ڈگری کے حامل تھے۔ یہ ڈگری آپ نے اٹھائیس برس کی عمر میں حاصل کر لی تھی۔ دادا کا علمی ذوق کسی نہ کسی رنگ میں پوتے نے وراثت میں پایا تھا اور انہیں ایسے بڑے عالم کا نبیرہ ہونے پر بجا طور پر فخر تھا۔ ہمارے ہاں تو علامہ اقبال کے صاحبزادے ڈاکٹر جاوید اقبال کی خودنوشت "اپنا گریباں چاک" چھپی ہے جس کے مطالعہ سے یوں معلوم دیتا ہے کہ ان کے صاحبزادے اقبال کے گھر پیدا ہو جانے پر بے حد ناخوش ہیں۔ اگر کوئی انہیں اقبال سے منسوب کر کے ان کا تعارف کروا دے تو آگ بگولا ہو جاتے ہیں مگر باپ کے نام پر دنیاوی فوائد و مراعات حاصل کرنے کا موقع آئے تو ایک لمحہ کے لئے بھی توقف نہیں فرماتے۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

ڈاکٹر شمیم جیراج پوری عمر بھر علی گڑھ یونیورسٹی سے وابستہ رہے وہیں تعلیم پائی وہیں تدریس کا فریضہ سرانجام دیا بلکہ خود ان کا کہنا ہے کہ "اگر میں کوئی صنعتی چیز ہوتا تو مجھ پر Made in AMU (یعنی ساختہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کی مہر لگی ہوتی" (کچھ یادیں کچھ باتیں صفحہ ۶۰۲)

اس خودنوشت کا اسلوب احوال الرجال کا اسلوب ہے مگر ڈاکٹر صاحب نے واضح کیا ہے

کہ میں نے ''کسی شخصیت کا وہی پہلو نمایاں کیا ہے جس میں میں خود شامل رہا ہوں'' (صفحہ ۱۷) اور یہی درست بات ہوتی ہے کہ صرف وہ رجال احوال الرجال کا حصہ بنیں جن سے مصنف کو براہ راست تعلق رہا ہو اور اس نے انہیں جانا جانچا اور برتا ہو۔

اپنے بارہ میں لکھنے کے بعد ان کا زیادہ زور مولانا اسلم جیراج پوری اور مولانا عبدالسلام ندوی کے احوال پر ہے۔ ہم نے پہلی بار یہ بات مولانا اسلم جیراج پوری کے احوال میں دیکھی ہے کہ آپ ''۱۹۰۳ میں لاہور کے پیسہ اخبار میں عربی کے مترجم کی حیثیت سے وابستہ رہے'' (صفحہ ۷۳) برصغیر میں مولانا اسلم جیراج پوری کا وہ احترام تھا کہ جسٹس سلیمان جیسے لوگ ان کے سامنے چٹائی پر دوزانو بیٹھتے تھے'' (صفحہ ۸۶) دوسرے رجال میں مولانا عبدالسلام ندوی، ہمدرد والے حکیم عبدالحمید کے علاوہ علی گڑھ یونیورسٹی کے مختلف اساتذہ اور وائس چانسلرز کا ذکر ہے اور ذکر خیر ہے۔ کہیں کسی شخص کے بارہ میں تعریض وطنز کا شائبہ تک نہیں حالانکہ انسان صرف دوست ہی پیدا نہیں کرتا دشمن بھی بنتے چلے جاتے ہیں۔ جن اساتذہ سے مستفیض ہوئے ہیں ان کے تبحر پر انہیں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ ایک وقت میں انہیں کل ہند ادارہ زووآلاجیکل سروے آف انڈیا کے سربراہ رہے اس افسری نے بھی ان کی گردن میں کوئی تناؤ پیدا نہیں کیا اور جونہی ان کی مادر علمی کو ضرورت پڑی فوراً واپس اپنے تدریسی مقام پر آ گئے۔ انگلستان میں بھی ممتاز سائنسی ادارہ سے وابستہ اور مقیم رہے۔ غرض ان کی خودنوشت سے ایک علمی اور احسانمند و احسان شناس شخصیت کا تاثر ابھرتا ہے۔

حیدرآباد کے ڈاکٹر عبدالحق صاحب کو آپ نے حیدرآباد کا سرسید قرار دیا ہے۔ ان کی فرض شناسی کی ایک مثال بیان کی ہے کہ ''کسی ضروری سرکاری کام میں مصروف تھے۔ گھر پر بیٹے کی میت رکھی تھی مگر جب تک کام سے فارغ نہ ہوئے گھر کا رخ نہیں کیا کہ تدفین تو میرا ذاتی معاملہ ہے'' (صفحہ ۱۹۳) اسی طرح ان کی انسان دوستی کا احوال بیان کیا ہے کہ ''اپنی بیٹی کی شادی کے ساتھ چھ غریب اور ضرورتمند لڑکیوں کی شادی کی'' (صفحہ ۱۹۶)

ڈاکٹر شمیم جیراج پوری صاحب کو نئی قائم ہونے والی اردو یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنانے کا فیصلہ ہؤا تو اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ حیدرآباد تو ابتدا ہی سے اردو کا مرکز رہا ہے اور عثمانیہ یونیورسٹی

اردو کی تدریس کا واحد ادارہ رہی ہے۔ ایسے ادارہ کو نئے سرے سے زندہ کرنا مردے کو زندہ کرنے والی بات تھی مگر ڈاکٹر جیراج پوری نے اپنے علمی مرتبہ اور وراثتی علمی پس منظر سے کام لیتے ہوئے اس مردہ کو زندہ کرنے کا کام کر دکھایا۔ وزیراعظم اندر کمال گجرال تک نے ان کے کمالات کا اعتراف کیا ''ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں پروفیسر شمیم جیراج پوری کی شکل میں ایسا وائس چانسلر نصیب ہو گیا ہے جو ایک بلند پایہ سائنسدان اور سکالر ہونے کے ساتھ اردو تہذیب میں رچا بسا ہؤا ہے'' (بیک ٹائیٹل) کتاب کا دیباچہ بھی سابق وزیراعظم ہند اندر کمال گجرال کا لکھا ہؤا ہے۔

کتاب کی زبان شستہ رفتہ زبان ہے کیونکہ علی گڑھ کے ساتھ ان کا گہرا رابطہ رہا ہے اس لئے علی گڑھ ان کے ظاہر و باطن سے ظاہر ہے۔ آپ نے علی گڑھ میں بعد کے دنوں میں پیدا ہو جانے والی کسی افراتفری یا مناقشت کا ذکر نہیں کیا غالباً اس لئے کہ آپ علی گڑھ کے دامن کسی قسم کا کوئی دھبہ دیکھنے کے روادار نہیں۔ یہ سرگزشت ایک عالم فاضل علیگ کا علی گڑھ یونیورسٹی کو عملی خراج تحسین کا حکم رکھتی ہے اور اسی ناطہ سے علمی حلقوں میں احترام سے پڑھی جائے گی۔

✓

سفرنامۂ حیات

ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی پھلواری معتمد تعلیمات ندوۃ العلماء لکھنؤ کی خودنوشت ''سفر نامۂ حیات'' خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ نے ۲۰۰۵ میں شائع کی ہے۔ اس کے ساتھ ان کے سفر نامے چند دن دیار غیر میں ضمیمے کے طور پر شامل ہیں۔ مولانا موصوف کی ابتدائی زندگی ''بہت محدود اور محتاط اقتصادی ماحول میں بسر ہوئی۔۔۔صرف ایک بات اللہ تعالیٰ نے بہت گراں بخش اور قوی ترین نعمت کے طور پر عطا فرمائی تھی وہ تھی قناعت اور خودداری۔ مدد تو الگ رہی کسی سے قرض کا ایک پیسہ بھی نہیں لیا جاتا تھا پیغمبرانہ دن بھی گذر جاتے تھے صبر شکر کی پوری فضا پورے آب وتاب اور پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ قائم رہتی تھی کوئی گلیوں میں کھیلنے والے بچے یا مجلسوں میں شریک ہونے والے بڑے دور سے بھی بھنک محسوس نہیں کرتے کہ ہمارے گھر پر آج کیسا دن گذرا ہے اور کسی محرومی کا احساس کسی کو نہیں ہوتا اور یوں کسی کو ضرورت بھی نہ تھی کہ وہ ہمارے خشک چہروں اور سوکھی آنکھوں کے پردے میں جھانک کر میرے اقتصادی حالات کا اندازہ لگائے'' (سفر نامہء حیات صفحہ ۲۰)۔ بعد کو اللہ تعالیٰ نے کشائش بھی دی مگر قناعت کی دولت سے مالا مال رہے۔ تعلیم فرنگی محل لکھنؤ میں ہوئی پھر ندوہ میں پڑھے اور وہیں معلمی اختیار کی ندوہ والوں نے ہی انہیں ان کے مرشد علی میاں کے ہمراہ حج کے لئے اس نیت سے بھیجا کہ اپنے علم میں اضافہ کر کے آئیں گے اور ندوہ میں پڑھائیں گے۔ اتفاق سے انگلستان جانے کا موقع مل گیا پی ایچ ڈی کی اور پھر رابطہء عالم اسلامی سے وابستہ ہو گئے مگر ندوہ کے لئے ہر حال میں ہر کام اور ہر خدمت کرتے رہے۔

رابطہ عالم اسلامی کی تاسیس کا حال بڑا دلچسپ ہے۔ مصر کے ایک اخبار میں ایک کارٹون چھپا۔ ایک بڑے مرغ کی تصویر تھی۔ نیچے لکھا تھا ''یہ محمد آفندی ہیں شادیاں بہت کرتے ہیں''

(صفحہ ۱۳۷) اس کارٹون میں جو نام استعمال ہؤا تھا وہ رسول پاک کا اسم گرامی تھا اسی نے لوگوں کو تحریک کی کہ ایسی باتوں کا قلع قمع ہونا چاہیے اور مسلمانوں کو مل جل کر ایسی باتوں کا تدارک کرنا چاہئیے۔ گویا یہ کارٹونوں کی وبا یورپ سے نہیں چلی مصر سے چلی تھی۔ شہزادہ سعود بن عبدالعزیز نے اس تاسیسی جلسہ کی صدارت کی تھی جس میں دنیا بھر سے علما بلائے گئے تھے پاکستان کی نمائندگی مولانا مودودی صاحب نے کی تھی۔ ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی صاحب عربی بھی جانتے تھے انگریزی بھی اس لئے ان کے لئے روزگار میں کشائش کے دروازے کھلتے چلے گئے۔ رابطہء عالم اسلامی کے مقاصد میں وسعت آتی چلی گئی دنیا بھر میں جہاں مسلمانوں کو کسی مدد کی ضرورت پیش آتی رابطہ ان کے کام آتا مگر بہت بعد کو اس رابطہ نے بھی مسلمانوں کی تکفیر کا پیشہ اپنا لیا۔

مدرسہ فرنگی محل جو لکھنؤ کے بدنام زمانہ ''چوک'' کے محلّہ ٹکسال میں واقع تھا۔ ''چوک ایک بہت حقیر قسم کی تنگ سی سڑک کا نام ہے۔ جس کے دونوں جانب چکن کی دوکانیں چاندی کے ورق کوٹنے والے ململ اور کڑھائی کے پٹے اور کرتے بیچنے والے بیٹھا کرتے تھے۔ اوپر کی منزلوں میں طوائفیں رہا کرتی تھیں اسی سڑک سے شرفا بھی گذرتے ان کی نگاہیں نیچی رہتیں اور اگر کبھی نظر اٹھی بھی تو عجیب قسم کی عورتیں کوٹھوں کے چھجوں پر بیٹھی نظر آتیں'' (صفحہ ۳۹) اور یہ زمانہ مولانا کی نوخیزی اور لاعلمی کا زمانہ تھا جب ابھی انہیں لفظ نکاح تک کے معنی نہیں آتے تھے ''شرح وقایہ ثانی میں کتاب النکاح کا ایک سبق ہو رہا تھا۔ جو جلد ثانی کا پہلا باب ہے میں نے شبیر سے پوچھا اس کا کیا مطلب ہے۔ انہوں نے ذرا ہمت افزائی کے انداز میں مگر شوخ مزاجی سے اشارہ کیا کہ استاذ سے پوچھو۔ استاذ درس مولانا مفتی سعید صاحب اعظمی تھے میں نے پوچھا یہ کیا لفظ ہے؟ وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر خاص انداز میں سر جھکا کر کہنے لگے ''کہاں سے جانور آ جاتے ہیں'' ان کو ان مسائل کو سمجھنے کی بھی عقل نہیں اچھا سن۔ ہندی کی چندی کرتا ہوں اور انہوں نے بتایا۔ اور ادھر حواس گم ادھر لڑکے زیر لب تمسخرانہ انداز میں ہم کو دیکھتے'' (صفحہ ۴۴)

فرنگی محل میں جن مسائل سے واسطہ پڑا ندوہ میں وہ نہیں تھے۔ فرنگی محل میں ایک کتاب اردو میں عقیدہ کی تھی جس کا نام شرح عقائد تھا میرے لئے اس کا سمجھنا بہت دشوار تھا جس میں لکھا

تھا ''حرام مال بھی اللہ کا رزق ہے'' جب میں نے ڈرتے ڈرتے استاذ سے پوچھا کہ حرام مال اللہ کا رزق کیسے ہو سکتا ہے؟ تو انہوں نے ڈانٹ کر جواب دیا تو پھر کیا تیرا ہے؟'' (صفحہ ۴۷) پاکستان میں کسب حرام کی فراوانی کے دوش بدوش کرنسی نوٹوں پر لکھے ہوئے لفظ ''رزق حلال'' کی بلاغت اب سمجھ میں آئی ہے۔

علامہ صاحب کی کتاب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر علاقہ میں کسی نہ کسی شخص کو اس کی خطابت اور علم کی وجہ سے امیر شریعت کا خطاب دے دیا جاتا تھا۔ پنجاب میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو امیر شریعت کا خطاب ودیعت ہوا تو اس وقت کے ایک لیگی شاعر نے جو نظم کہی وہ پہلی بار ہماری نظر سے گذری ہے جو نذر قارئین ہے۔

''بنے جا رہے ہیں امیر شریعت
بنارس کی تہذیب کے جل پجاری
عقیدت ہے پیپل کے بھتنوں سے ان کو
ہے سایہ فگن ان پہ لونا چماری
سنا ہے کہ کہتے تھے کل ایک مفتی
الہ آباد کی پوریاں ہیں کراری
اڑا لے نہ جائیں کہیں لیگ والے
سنا ہے کہ بی کانگریس ہے کنواری''

چوتھے شعر میں جن مفتی صاحب کا حوالہ ہے وہ مفتی کفایت اللہ ہیں۔ (صفحہ ۷۰) بی کانگریس کی ''کنواریوں'' کے قرب کی خواہش تو ہمارے پہلے آڈیٹر جنرل پاکستان مشتاق احمد خاں وجدی بھی رکھتے تھے۔ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں آ کاش وانی سے وجے لکشمی کی آواز سنتے ہی دل مچلنے لگا ''وہ زمانہ یاد آیا جب ہم ان کا ''تماشائے بیک کف بردن صد دل'' دیکھنے کانگریس کے جلسوں میں جایا کرتے اور دل کو سمجھاتے کہ ''من کیستم کہ خواہم در پہلوش نشستم'' (ہنگاموں میں زندگی۔ صفحہ ۶۵)۔

نواب بہادر یار جنگ ندوہ آئے تو بزرگوں کے سامنے گنگ ہو کر رہ گئے کہنے لگے ''حضرات اس مجمع میں میرے استاذ و مخدوم تشریف فرما ہیں جن کی کتابیں پڑھ کر جن کے جملے رٹ کر میں مقرر بنا ہوں ان کے سامنے کس طرح زبان کھولوں یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئے''۔۔۔ مگر شام کو گنگا پرشاد ہال میں اقبال پر تقریر کی تو ان کے ایک ایک لفظ پر پبلک جھوم رہی تھی۔ نواب صاحب نے جوش خطابت میں کہا ایک نوجوانو! اے لیلیٰ چٹنس کی آنکھوں پر چٹنی بن جانے والو! سنو! اقبال کیا کہتا ہے تو پورا مجمع قہقہوں سے اور جوش سے بے اختیار معلوم ہو رہا تھا۔ لیلیٰ چٹنس اس زمانہ کی کوئی مشہور ایکٹریس تھی'' (صفحہ ۵۹)

مولانا احمد علی لاہوری حج کے لئے گئے تو سفیر کی دعوت میں تو شریک ہوئے مگر ''اپنی روٹی نمک سے کھالی پانی کا گھونٹ بھر لیا دعوت کا کھانا نہیں کھایا'' (صفحہ ۱۵۳)۔

سب سے دلچسپ واقعہ مالی کے جزیرہ کا ہے۔ ''میں مسجد جانے کے لئے باہر نکلا ایک مقامی شخص سے پوچھا مسجد کدھر ہے۔۔۔ انہوں نے کہا میرے ساتھ آؤ میں دکھا دیتا ہوں اس نے مسجد کے گیٹ تک پہنچا دیا اور پوچھا کہ تم مسلمان ہو؟ میں نے کہا الحمد للہ مسلمان ہوں اسی لئے تو مسجد کا راستہ معلوم کر رہا ہوں۔ اس نے اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں کے قریب کرتے ہوئے کہا اس کو چومو۔ میں گھبرا گیا کہ یہ کیا سوال ہے۔ اس نے کہا میں پیغمبر اسلام کے اولاد میں ہوں۔ یہ ایک نیا تجربہ ہوا'' (صفحہ ۱۹۹)۔ سیدوں کی تکریم تو ہر کوئی کرتا ہے لیکن اس حد تک جانا واقعی نیا تجربہ تھا۔

غرض علامہ عبداللہ عباس کی خودنوشت ایک عالم کی دلچسپ خودنوشت ہے اگرچہ ان کے اندر کا مولوی کبھی نہ کبھی باہر نکل پڑتا ہے۔ ریسرچ کے لئے انگلستان گئے تو مشہور مستشرق منٹگمری واٹ نے انہیں اپنی رہنمائی میں کام کروانے کا عندیہ دیا مگر آپ نے رد کر دیا کہ ''یہ شراب پینے والے سؤر کھانے والے مجھ کو قرآن و حدیث میں رہنمائی دیں گے''؟ (صفحہ ۱۶۰) حالانکہ یہ بات صریحاً قول رسول کے خلاف ہے کہ ''اطلبو العلم لو کان بالسین'' حصول علم کے لئے کوئی شرط سوائے حصول دانش و علم کے نہیں ہے۔ ایسا ہو تو علم ایک تنگنائے میں محصور ہو کر رہ جائے۔

✓

چند خوشگوار یادیں

مسجد فضل لندن کے سابق امام، ہمارے استاد بھائی، تعلیم الاسلام کالج کے اولڈ بلکہ ''بولڈ'' بوائے امام بشیر احمد رفیق کی خودنوشت ''چند خوشگوار یادیں'' کے عنوان سے قادیان سے شائع ہوئی ہے اور ہمیں امام صاحب کے اس ارشاد کے ساتھ موصول ہوئی ہے کہ اگر ہمیں اس میں کوئی خوبی نظر آئے تو اس کا ذکر کریں اور اگر کوئی فنی سقم نگاہ پڑے تو اسے اپنے ''پاس'' ہی رکھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس کتاب پر تقریظ لکھیں گے تنقید سے کلی پرہیز روا رکھیں گے ورنہ بشیر احمد رفیق جیسے ''بولڈ بوائے'' کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔

ہم نے امام بشیر احمد رفیق کو التزام سے اس لئے امام لکھا ہے کہ امامت ثالثہ کے دور میں حضرت امام جماعت احمدیہ نے بیرونی مشنوں کے رئیس التبلیغ مربیان کو امام کہنا شروع کیا تھا پھر بوجوہ اس عمل کو ترک کر دیا (اگرچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بات سوئٹزرلینڈ کے اس وقت کے امام نسیم مہدی تک پہنچی تو تبشیر والوں نے سوچا کہ لوگ امام نسیم مہدی کی بجائے انہیں ''امام مہدی'' نہ کہنا شروع کر دیں تو حضرت صاحب نے یہ سنت ہی ترک فرما دی) مگر امام رفیق کے نام کے ساتھ یہ سابقہ ابھی تک چل رہا ہے۔ امام کا لفظ بھی سوچتا ہوگا کہ کس رفیق سے سابقہ پڑ گیا ہے۔ پھر ہم نے انہیں اولڈ بوائے کی بجائے بولڈ بوائے لکھا ہے اور بجا لکھا ہے اس لئے کہ وہ اپنے اساتذہ کو امتحان میں ڈالنے سے باز نہیں رہ سکتے تھے تو ہم کس باغ کی مولی ہیں۔ ایک باران کے استاد حضرت مولانا ابوالعطا صاحب نے کلاس میں فرما دیا کہ وہ اپنے اساتذہ میں حضرت حافظ روشن علی سے اتنے بے تکلف تھے کہ ان سے قرض بھی مانگ لیا کرتے تھے اور وہ بھی ایسے مہربان

تھے کہ قرض لینے کی وجہ بھی نہیں پوچھتے تھے۔ رفیق صاحب مولانا کے پاس گئے اور دس روپے قرض مانگے۔ مولانا نے رقم تو دے دی مگر سوال کر دیا ''تمہیں یہ رقم کیوں چاہیے؟'' رفیق صاحب نے عرض کیا کہ ''حضرت مولوی روشن علی صاحب تو آپ سے یہ سوال نہیں کیا کرتے تھے۔ خوب ہنسے اور فرمایا کہ تم میرا امتحان لینے آئے تھے''۔ (چند خوش گوار یادیں صفحہ ۹۰)۔ پھر خدام کے اجتماعات میں عام معلومات کے مقابلوں میں ممتحنین سے ان کے جو مکالمے، مکالمے کیا ''مچیٹے'' ہوتے تھے وہ ہمیں ابھی تک یاد ہیں۔ سوال کرنے والوں کو بھی دانتوں پسینہ آ جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے سب ذرا ذرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔

استاذی المحترم چوہدری عبدالرحمن صاحب، صاحب مدینہ ریاضی، نے انہیں ذواضعاف اقل میں اتنا طاق کر دیا ہے کہ انہوں نے بعض مقامات پر واقعات کا بھی ذواضعاف اقل نکال دیا ہے یعنی بیان میں اتنا اختصار روا رکھا ہے کہ پڑھنے والوں کو بلا کی (بلکہ کربلا کی) تشنگی محسوس ہوتی ہے۔

صاحب کتاب نے خوب بات کہی ہے کہ یہ کتاب تاریخ نہیں سوانح ہے اور ''تاریخ الگ چیز ہے اور سوانح الگ چیز دونوں کا رنگ جدا جدا ہے'' (صفحہ ۱۲) اس لئے یہ کتاب ان کی خود نوشت تو ضرور ہے مسجد فضل لندن اور اس کے وابستگان کی تاریخ نہیں ہے۔ اتفاق یوں ہے کہ جن دنوں کتاب ہم تک پہنچی لندن کے ایک پرانے دوست اور لندن مسجد کے ایک مخلص خادم یہاں ٹورنٹو ہمیں ملنے کو آئے ہوئے تھے۔ ایک رات کے لئے کتاب مانگ کر لے گئے اور صبح واپس کر دی فرمانے لگے خوردبین سے مطالعہ کر کے دیکھا ہے بہت سے مخلص کارکنان کا نام تک موجود نہیں۔ ہم نے ان کی تسلی کے لئے امام صاحب کا فرمودہ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا کہ یہ ان کی سوانح حیات ہے مسجد فضل لندن کی تاریخ نہیں۔ مسجد کی تاریخ مرتب ہوگی تو جس کا گھر ہے وہ گھر والا کسی کی خدمت کو نظر انداز نہیں ہونے دے گا۔ امام صاحب نے وضاحت کر دی ہے کہ ''یہ کسی رنگ میں بھی جماعت احمدیہ انگلستان کی تاریخ کا حصہ نہیں ہے اور نہ ہی اسے تاریخی سند کے طور پر لینا چاہیے'' (صفحہ ۱۱) ہم نے تو اتفاق سے مسجد فضل لندن کے ایک اور امام کی خودنوشت بھی پڑھ رکھی ہے اس لئے ہمیں امام رفیق کی بات زیادہ سمجھ میں آئی ہے۔ بہ قلم خود توصیفئے لکھنا آسان ہوتا

ہے مگر خودنوشت لکھنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا۔

عجیب تر اتفاق ہے کہ جس بچے کے باپ کو استاد نے قرآن پڑھتے ہوئے سوال کرنے والے کو کافر کہنا سکھایا تھا (صفحہ ۵۱) اسی دانشمند باپ کا بیٹا قرآن کا عالم بنا اور دیارِ کفر میں اسلام پھیلاتا پھرا۔

۶۳ میلر وز روڈ لندن کا پتہ تو ہر احمدی کو یاد تھا کیونکہ یہی مسجد فضل لندن کا پہلا پہلا پتہ تھا مگر بعد کو جب توسیع کی ضرورت پیش آئی تو مشن ہاؤس کا رخ گریسن ہال روڈ کی جانب ہو گیا اور مشن ہاؤس کی پرانی اور تاریخی عمارت کے ساتھ پرانا پتہ بھی منہدم ہو گیا۔ ہم جب بھی لندن جاتے ہیں میلر وز روڈ کے اس حصہ کی طرف ضرور جاتے ہیں کیونکہ یہ پتہ ہمارے لاشعور میں بسا ہؤا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ منتظمین انگریزوں کی قدامت پسندی کا یہ اچھا رخ اختیار کرتے اور تاریخی پتہ کو تاریخ کا حصہ نہ بننے دیتے۔ اس تاریخی پتہ پر ورود فرما ہونے والے مشاہیر اور مدبرین کی فہرست بھی امام صاحب نے دی ہے ''۶۳ میلر وز روڈ کا مشن ہاؤس بہت تاریخی عمارت تھی اس میں ۱۹۶۷ کے دورہ انگلستان کے موقع پر حضرت خلیفۃ المسیح الثالث نے قیام فرمایا مسلم دنیا کے مشاہیر سکالرز اور لیڈر یہاں تشریف لائے جن مین پریذیڈنٹ ٹب مین آف لائبریریا شاہ فیصل آف سعودی عرب، شاہ ادریس آف لیبیا، سر محمد اقبال، سر فیروز خان نون قائداعظم محمد علی جناح اور سر ایف ایم سنگھاٹے گیمبیا کے (احمدی) پریزیڈنٹ وغیرہ شامل ہیں'' (صفحہ ۱۱۸)۔ تاریخ انسانوں سے ہی نہیں اینٹوں سے بھی وابستہ ہوتی ہے۔ مکان یاد کیا کرتے ہیں مکینوں کو۔

ہم نے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کا بہت سا ریکارڈ کھنگالا ہؤا ہے ہم نے بھی وہ ''کاغذی پیرہن'' دیکھا ہے جس کا ذکر ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کے حوالہ سے امام صاحب نے کیا ہے۔ یہ وہ تاریخی معاہدہ غلامی ہے جو شاہ عبد العزیز اور شاہ برطانیہ کے مابین ہؤا تھا کہ برطانوی حکومت شاہ عبد العزیز کو ایک لاکھ پاؤنڈ سالانہ وظیفہ دے گی اور سعودی حکومت کی حفاظت کرے گی اس کے بدلہ میں شاہ عبد العزیز برطانوی حکومت کے وفادار رہیں گے حجاج کی حفاظت کی ضمانت دیں گے اور خارجہ امور میں برطانوی حکومت کے فیصلوں کے ہر حال میں پابند

ہوں گے۔ (صفحہ ۲۴۵)۔ امام صاحب نے خود کاشتہ پودہ کے الزام کا ذکر تو فرمایا ہے معاہدہ بالفور کو نظر انداز کر گئے ہیں جس کے نتیجہ میں اسرائیل قائم ہؤا اور مشرق وسطیٰ کا امن ہمیشہ کے لئے برباد ہو گیا۔ کیا یہ کیا دھرا اسی ایک لاکھ پاؤنڈ کا نہیں؟ کہ سعودی عرب کی زبان پر تالے پڑے ہوئے ہیں؟

امام صاحب اپنے علاقہ کے روٹری کلب کے صدر بھی رہے اس ضمن میں ہم بھی ایک روٹیرین سے اپنی ملاقات کا ذکر کر دیں۔ لاہور میں ہمارے شوگر کے معالج ڈاکٹر آئی حسن تھے جو لاہور روٹری کلب کے صدر تھے۔ ہماری غذا کے بارہ میں استفسار فرما رہے تھے کہ ہمیں شرارت سوجھی کہنے لگے آپ چاول تو نہیں کھاتے؟ ہم نے کہا نہیں سر میں روٹیرین ہوں۔ ڈاکٹر صاحب اچھل پڑے اور کہنے لگے ایک روٹیرین سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ جب ہم نے وضاحت کی کہ ہم تو اس لئے روٹیرین ہیں کہ چاول نہیں کھاتے صرف روٹی کھاتے ہیں تو ان کی شکل مبارک دیکھنے والی تھی۔

نئے مشن ہاؤس کی تعمیر کا سارا خرچ حضرت چوہدری ظفر اللہ خاں نے ادا کیا (صفحہ ۲۱۲) اور صرف یہ پابندی لگائی کہ ان کی زندگی تک اس کارِ خیر کا اعلاء نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے جماعت کو کیسے کیسے مخیّر لوگ دئے ہوئے ہیں۔ ربوہ کی بیت الاقصیٰ بھی ایسے ہی گمنام مخیّر سیٹھ محمد صدیق نے بنوائی تھی جن کے نام کا اعلاء بھی ان کے گذر جانے کے بعد ہؤا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی قربانیوں کو قبول فرمائے۔

۱۹۷۸ میں لندن میں کسر صلیب کانفرنس ہوئی (صفحہ ۳۰۶) اس کا چرچا لندن کے پریس مین تو ہؤا سو ہؤا میری معلونات کے مطابق اس کا سب سے زیادہ چرچا جاپان میں ہؤا عزیزم مولانا عطاء المجیب راشد موجودہ امام مسجد فضل لندن اس زمانہ میں جاپان میں مربی تھے۔ (امام رفیق کو راشد صاحب کے لندن کے ورود کے باب میں تسامح ہؤا ہے) ہم دونوں نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق سے اخباروں میں کسر صلیب کے موضوع پر خطوط کا ایک سلسلہ شروع کیا اور اس سلسلہ میں ساٹھ سے زیادہ خطوط اخباروں میں چھپے۔ امام جماعت احمدیہ نے اس پر بہت خوشنودی

کا اظہار فرمایا تھا۔

حضرت مولانا نذیر احمد علی نے سیرالیون میں تبلیغ حق کے لئے جس طرح سر دھڑ کی بازی لگا دی اس کا بجا طور ذکر ہے (صفحہ ۲۷۰)۔ لائبیریا کے پریزیڈنٹ ٹب مین کی جانب سے سرکاری مہمان بن کر لائبیریا جانے کا تذکرہ بھی ہے (صفحہ ۲۶۰) سپین جاتے ہوئے حضرت امام جماعت احمدیہ نے طارق کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنیں تھیں (صفحہ ۲۷۵) اللہ تعالیٰ نے سات سو سال کے بعد جماعت احمدیہ کو سپین میں مسجد بنانے کی توفیق دی اس طرح حضور اقدس کا خواب پورا ہو گیا مگر مسجد بشارت کا افتتاح چوتھے امام کے عہد مبارک میں ہوا۔ مجھے یاد ہے جب جماعت کو مسجد بنانے کی اجازت ملی تو پاکستان ٹائمز لاہور کے منافق ایڈیٹر زیڈ اے سلہری نے اسے بھی انگریز کی سازش قرار دیا تھا کہ سات سو سال کے بعد سپین میں مسجد بنانے کی اجازت بھی ملی ہے تو جماعت احمدیہ کو ملی ہے۔ اس اداریہ کے خلاف پاکستان ٹائمز میں جو پہلا خط شائع ہؤا وہ راقم الحروف کا خط تھا جس کا لب لباب یہ تھا کا مل اس فرقہ ءزہاد سے اٹھا نہ کوئی۔ کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے۔ استاذی المحترم صاحبزادہ مرزا مجید احمد صاحب نے پاکستان ٹائمز میں یہ خط پڑھا تو خلاف معمول سیدھے غریب خانہ پر تشریف لائے اور خوشی کا اظہار فرمایا اور کہا اے کاش یہ خط میرا ہوتا۔ مسجد بشارت اہل یورپ کے لئے واقعی نئی بشارت کا موجب ہوئی۔

ان باتوں کے علاوہ اپنے مرشد کی مقبول دعاؤں کا ذکر ہے (صفحہ ۴۲۳) جماعت احمدیہ کے طفیل قوموں پر نازل ہونے والی برکات کا تذکرہ ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام کی اپنے والد صاحب سے محبت اور عقیدت کا بیان ہے (صفحہ ۲۳۶) مگر اس سلسلہ میں پروفیسر کے کے عزیز مرحوم کی بات ہمیں نہیں بھولتی جو انہوں نے اپنی یادداشتوں کی کتاب ''لاہور کا کافی ہاؤس'' میں لکھی ہے کہ میں ڈاکٹر سلام کے پٹنی والے گھر میں حاضر تھا۔ ان کے ابا بھی تشریف رکھتے تھے۔ جونہی ابا کے منہ سے کوئی بات نکلتی دوسرے بیٹوں کے اٹھنے سے پہلے ڈاکٹر سلام لپک کر اٹھتے اور اپنے ابا کے حکم کی تعمیل کر کے واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھتے۔

شیخ عبداللہ نے امام جماعت احمدیہ اور ان اکابر کا ذکر احترام سے کیا ہے جن لوگوں نے کشمیر کی جد جہد آزادی میں ان کا ہاتھ بٹایا تھا۔ (صفحہ ۱۹۱) آتش چنار کے پہلے ایڈیشن میں یہ سب کچھ لکھا ہؤا موجود ہے بعد میں تحریفیں روا رکھی گئیں تو ان میں شیخ صاحب کا کیا قصور ہے؟

ہمارے لئے نئی بات یہ تھی کہ حضرت امام جماعت احمدیہ بنفس نفیس علیل صدر ایوب کی عیادت کے لئے ان کے ہاں تشریف لے گئے۔ غیر از جماعت شریف النفس افراد کی عیادت تو ہماری جماعت کے خلفاء کی روایت ہے۔

غرض امام رفیق کی یہ خود نوشت بہت سی خوبیوں والی خود نوشت ہے اور پڑھنے والوں کے لئے دلچسپی کا موجب ہوگی۔ اور یہ بات کہہ دینے میں کیا حرج ہے کہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جو میں نے امام رفیق کے ارشاد کے تحت اپنے ''پاس'' ہی رکھی ہیں جب ملاقات ہوگی انہیں واپس دے دوں گا۔

دیکھی تیری دنیا

پنجابی کی معروف ادیبہ، کالم نگار اور ماہر تعلیم پروفیسر افضل توصیف کی خودنوشت ''دیکھی تیری دنیا'' فیروز سنز والوں نے ۲۰۰۹ میں شائع کی ہے۔ یہ خودنوشت ایک پڑھی لکھی حساس اور حالات کے جبر کے سامنے سینہ سپر ہو جانے والی خاتون کی خودنوشت ہے جس میں اردو کے شانہ بشانہ پنجابی کے محاورے، فقرے اور روزمرہ کی بول چال کی چاشنی پڑھنے والے کو لطف دیتی ہے اور پنجابیوں کو تو یقیناً مزا دیتی ہے مگر ان کے وطن ثانی بلوچستان والوں کو شاید اتنی دلچسپ معلوم نہ دیتی ہو۔ افضل توصیف پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوئیں مگر ابا کی ملازمت کے سلسلے میں بلوچستان جا بسیں۔ اور اب تک بلوچستان کی شہریت رکھتی اور بلوچستان کے حقوق کے لئے لڑتی ہیں۔

اس خودنوشت کا آغاز افسانوی رنگ میں ہوتا ہے۔ اپنی پیدائش پر گاؤں کی ان پڑھ دایہ کا نوحہ آپ نے یوں روایت کیا ہے جیسے سب کچھ اپنے کانوں سے سن رہی تھیں ''دنیا میں آ کر پہلا سانس لینے سے پہلے ہی میں نے کئی عورتوں کو مایوس کیا تھا پہلی تو ماں جھنڈو تھی اس نے میرے لڑکی ہونے پر دہائی دے ڈالی'' (صفحہ ۷) پھر اسی سانس میں آپ نے اردگرد کھڑی عورتوں کی سازش بھی بیان کر ڈالی ہے کہ اسے گڑھتی نہ دو بھاری دودھ پلاؤ خود ہی مر جائے گی یا یہ کہ افیون دے دو۔ یہ ساری راجپوتوں والی پرانی رسمیں تھیں کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہہ دینگے لڑکا پیدا ہوا تھا مر گیا۔ (صفحہ ۸) اس صورت حال میں ان کی منہ بولی ماں کاکی نے سہارا دیا اور انہیں گود لے لیا۔ پالا پوسا لاڈ پیار دیا مگر قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے انہیں چھ سال پال پوس کر وہ بھی

رہگزائے قضا ہوئی۔ یہ خودنوشت ماں کاکی اور اپنے چھوڑے ہوئے گاؤں کا مسلسل نوحہ ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ حالات کا جبر ہے۔

پروفیسر افضل توصیف کی ساری عمر پڑھنے پڑھانے اور لکھنے لکھانے میں گذری ہے اس لئے تھیوری کے لحاظ سے تو یہ خودنوشت بڑے عالمانہ احساس و انداز کے ساتھ شروع ہوئی کہ ''بائیوگرافی لکھنا آسان کام نہیں آٹو بایوگرافی اور بھی مشکل کام ہے'' (صفحہ ۱۸) ''میں نے کئی آپ بیتیاں پڑھی ہیں اوپری اوپری یا ادھوری باتیں'' (صفحہ ۲۰) ''آٹو بایوگرافی لکھنے والے کوئی ہوں ۔۔۔ اپنے جیون اور شخصیت کی ساری جہتیں نہیں ڈھونڈ سکتے'' (صفحہ ایضاً) مگر خود اپنے جیون کی ساری جہتیں ڈھونڈنے میں مصروف ہو گئیں اور اپنی خودنوشت کو اس عیب سے مملو کر لیا جسے یادوں کی مکمل بازگشت کہا جاتا ہے اور جس کی زد میں آ کر انسان بڑی اور چھوٹی بات اہم یا غیر اہم بات کی تمیز گنوا بیٹھتا ہے۔ مجھے وثوق ہے کہ افضل توصیف اس مسودہ کو چھپنے سے پہلے ایک بار پھر دیکھتیں تو امرتا پریتم کی طرح اپنے ''رسیدی ٹکٹ'' کو ضرور ''ریوائز'' کرتیں۔ افضل توصیف نے صرف خیالات و احساسات کو ہی بار بار نہیں دہرایا واقعات و حالات بلکہ بعض مقامات پر فقرے کے فقرے دوبارہ لکھ دئے ہیں۔ کتاب میں جگہ جگہ اپنی کتابوں کے مندرجات کی تکرار ہے حتیٰ کہ سب کتابوں کا خلاصہ تک درج کر دیا ہے (صفحہ ۱۷۰) مگر اس سے ان کی تسلی نہیں ہوئی اختتام کتاب پر پھر کتابوں کی تفصیل درج کر دی ہے (صفحہ ۳۳۱) یہ غیر ضروری تفصیل آسانی سے قلم زد کی جا سکتی تھی مگر یادوں کی وہی مکمل بازگشت ان کا راستہ روکے کھڑی ہے۔

''ہاتھیوں (سیاست کاروں) اور اونٹوں (مذہبی جنونیوں) کے ساتھ ان کی مسلسل جنگ رہی'' (صفحہ ۲۷) مگر تفصیل میں جانے کا نقصان یہ رہا کہ اب یہ ''اپنے موہنجوڈارو کی کھدائی کر رہی ہیں'' (صفحہ ۳۷) اور وہاں سے سوائے دکھ، درد اور محرومی اور مایوسی کے ٹوٹے ٹھیکروں کے اور کچھ بر آمد نہیں ہو رہا۔

وہ عورت جو جنرل ٹکا خان کے مشرقی پاکستان کے مظالم پر لکھتے ہوئے اسے جنرل ڈائر کہنے کا حوصلہ رکھتی تھی (صفحہ ۱۰۴) اور لیبیا سازش کیس میں قید و بند سہہ جانے کا ولولہ رکھتی تھی

(صفحہ ۱۰۶ اکبر صفحہ ۱۷۳) وہ اب عاصمہ جیلانی کی تنظیم اور دوسری این جی اوز کو طعنے تشنے دے کر اپنے دل کا غبار نکالتی ہے؟ اور فیمنسٹ تحریک کو ناگن کا خطاب دیتی ہے۔ (صفحہ ۲۹۴) اور ان کے عہدیداروں کے لئے تو نہایت سخت لفظ استعمال کر گئی ہیں جو کسی پروفیسر کے قلم سے زیب نہیں دیتے۔ درست کہ ان کے بیٹے کا گھر اجڑ گیا مگر اس خانہ خرابی کا سارا الزام بہو پر اور اس کے ساتھ ہیومن رائٹس کی تنظیموں پر ڈال دینا جانبداری کی انتہا ہے۔ آج تک تالی دونوں ہاتھ سے بجتی آئی ہے یہاں تو ان کے بیٹے نوید کے ہاتھ کے ساتھ ایک تیسرا ہاتھ بھی تھا۔ میرے منہ میں خاک کہیں وہ تیسرا ہاتھ افضل توصیف کا تو نہیں تھا؟ بات دور نکل جائے گی مگر جاپان کے مذہب شنتو کا ایک ''کو آن''، یعنی آیت یا شبد یا مقولہ بیان کر دینے میں کیا حرج ہے'' تالی بجنے میں دونوں ہاتھ بولتے ہیں۔ ایک ہاتھ کی آواز سنو''۔ شنتو کے سارے گیان دھیان کی بنیاد ایک ہاتھ کی آواز سننے پر ہے۔

ہمیں تو مصنفہ کے اس الزام پر حیرت ہوئی کہ ان کے بھتیجوں نے ''بھابی کو ٹریک سوٹ پہنے جوگنگ کرتے دیکھا'' (صفحہ ۲۹۲) گویا ان کے نزدیک جوگنگ کرنا غیر اسلامی تھا؟ حالانکہ خود یونیورسٹی میں اسلامی جمعیت طلبہ کے نافذ کردہ قوانین کا ذکر کر چکی ہیں'' وہ لوگ جو فقط کتابی تھے محبت میں فاصلہ پسند کرتے اتنا فاصلہ جتنا ایک زمانہ میں یونیورسٹی کی اسلامی یونین نے ایک جوان لڑکے لڑکی کے درمیان مقرر کیا تھا یعنی جب بیٹھیں تو درمیان میں تین فٹ کا فاصلہ ہو اور جب بات کریں تو اتنی دور سے کہ ایک کے منہ کی بھاپ دوسرے کی ناک میں نہ جائے'' (صفحہ ۲۶۱) جوگنگ میں تو کوئی ایسا خدشہ غالباً نہیں ہوتا۔

اپنی یونیورسٹی کالج کے زمانہ کی دو ساتھیوں کا ذکر پڑھا تو خوشی ہوئی عارفہ سیدہ کا جنہیں آپ نے نہایت مضبوط پرنسپل کہا ہے اور یہ بات عارفہ سیدہ کے مزاج کے عین مطابق ہے (صفحہ ۲۹۲) اور اپنے اورئینٹل کالج کی نہایت معصوم معذور اور خوبصورت وضع دار لڑکی نصرت کا۔ جس کا نام اور ذکر آج پچاس برس کے بعد کہیں نظر پڑا ہے تو اس کا معصوم مگر پرعزم چہرہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا ہے۔ (صفحہ ۱۲۳) ربوہ سے جا کر سبی میں بس جانے والی استاد امتل کا ذکر بھی خوش آیا جس نے وہاں بھی اپنی خوش اطواری سے اچھا نام پیدا کیا۔ (صفحہ ۱۳۳) ربوہ میں تو امتل

نام کی بہت سی لڑکیاں تھیں جو تعلیم و تعلم سے وابستہ تھیں۔ اور اب ڈاکٹر کنیز یوسف یاد آئیں جن کے باب میں خوب بات افضل توصیف نے لکھی ہے کہ ڈکٹیٹر شپ میں جمہوریت کی سخت دشمن تھیں مگر جمہوریت آئی تو اس کی سب سے بڑی چیمپئن ٹھہریں (صفحہ ۱۶۱) دہلی میں امرتا پریتم اور امروز کے گھر کا ذکر بھی اچھا لگا اور انوکھا (صفحہ ۲۰۶)۔

اور اب ان کی ایک دیہاتی قصباتی ہوسٹل کی ساتھی کی حیرت کا قصہ۔ اس نے توری کی بیل درخت پر چڑھی ہوئی دیکھی تو اس میں ایک توری لٹک رہی تھی۔ کہنے لگی خدایا! پہلی بار معلوم ہوا ہے کہ توریاں درختوں پر لگتی ہیں۔ (صفحہ ۱۵۴) ایک تجربہ ہمارا بھی ہے۔ ہم لوگ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے گاؤں وزیر کوٹ میں کسی تقریب میں جمع تھے لاہور سے ایک خاتون بطور مہمان تشریف لائی ہوئی تھیں۔ فرمانے لگیں ڈاکٹر صاحب ہم نے کنو مالٹے تو درختوں پر لگے ہوئے دیکھ لئے۔ ہمیں تو گندم کا درخت دکھایئے ساری عمر کھاتے گذری ہے اس کا درخت نہیں دیکھا۔ کوئی'' دکھلاؤ'' کہ ہم'' دکھلائیں'' کیا؟

غرض افضل توصیف کی یہ خودنوشت اگر total recall of memory کے عیب سے مملو نہ ہوتی تو اچھی اور دلچسپ خودنوشتوں میں شمار کی جاتی۔ اس کی اردو پنجابی کی ملی جلی کھٹی میٹھی زبان بعض بعض جگہ تو بہت لطف دیتی ہے۔ اس خودنوشت کے آخری ابواب تو خودنوشت کا حصہ نہیں لگتے اخباری کالم لگتے ہیں جن سے لکھنے والی کی شخصیت ایک گرتی ہوئی دیوار دکھائی دیتی ہے۔ اتنی حوصلہ مند اور بہادر عورت کا یوں ڈھے جانا ہمیں تو خوش نہیں آیا۔

کھلی کتاب

پاکستان بلکہ دنیا بھر کے انسانیت کے معروف خدمت گذار عبدالستار ایدھی کی سوانح حیات ''کھلی کتاب'' کے عنوان سے محترمہ تہمینہ درانی نے تالیف کی ہے۔ پیش لفظ میں ایدھی صاحب نے لکھا ہے کہ ''میں اگرچہ گجراتی زبان میں لکھنا پڑھنا جانتا ہوں لیکن اردو اور انگریزی میں لکھنے کے لئے تمام حالات و واقعات ۴۰ آڈیو کیسٹوں میں بیان کر کے ریکارڈ کرائے جنہیں تہمینہ درانی نے ترتیب دے کر انگریزی میں منتقل کیا اور بعد ازاں اردو کے قالب میں ڈھالا گیا'' (کھلی کتاب۔ صفحہ ۶) ''قومی زبان اردو میں میری سوانح حیات پر مبنی یہ کتاب میری اب تک کی زندگی اور کام کے حوالے سے ایک مکمل دستاویز ہے یہ ایک چلتے پھرتے فقیر کے ان تمام لمحات کی واضح تصویر ہے جنہیں میں نے کبھی کسی سے نہیں چھپایا'' (صفحہ ۵)

عبدالستار ایدھی قصبہ بانٹوا کے ایک متوسط درجہ کے میمن گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ نہایت خدا ترس اور مخیّر خاتون تھیں جنہیں بھوکوں معذروں بے سہارا لوگوں کی مدد کا شوق تھا ننھے عبدالستار نے اپنی ماں سے یہ شوق ورثہ میں پایا اور اسے اپنی ماں کا صدقہ جاریہ بنا دیا سکول جاتے وقت ماں دو پیسے دیتی ان میں ایک پیسہ لازماً خیرات کے لئے ہوتا اور واپسی پر پرسش ہوتی کہ خیرات کا پیسا کسی حقیقی ضرورت مند کو دیا یا نہیں؟۔ خوش نصیبی سے انہیں بلقیس ایدھی جیسی رفیقہ حیات میسر آگئیں اور دونوں میاں بیوی اس کار خیر میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ اللہ اپنے وعدہ کے مطابق انہیں لمبی اور فعال اور پر خیر زندگی عطا فرمائے۔ فاما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض!

ایدھی صاحب نے اس کار خیر کے لئے کسی سرکاری امداد کی توقع رکھی نہ مانگی نہ اس کا

سہارا لیا۔ بازاروں میں کھڑے ہو کر بھیک مانگی مگر بھٹو ہو یا ضیاء الحق، بے نظیر ہو نواز شریف کسی سے مشروط عطیات قبول نہ کئے۔ ایوب کے زمانہ میں اس امید پر بنیادی جمہوریت کا انتخاب لڑا اور جیتا کہ شاید اس طرح ان کے کام میں آسانی ہو جائے مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدے۔ ضیاء الحق نے اپنی ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' کا رکن نامزد کیا (صفحہ ۱۶۰) مگر اس کی غیر افادیت سے ہمیشہ بیزار اور مایوس رہے۔ ''ضیاء الحق نے پانچ لاکھ روپے کا عطیہ دیا مگر قبول نہیں کیا'' (صفحہ ۱۶۹)۔ ضیاء الحق کے نام نہاد اسلامی نظام اور حدود آرڈیننس کے تحت عورتوں پر جو ظلم ہوئے ان کے خلاف برملا اظہار تنفر و مذمت کیا۔ (صفحہ ۱۹۷) ''ایک فتویٰ کے مطابق ایک مسجد کے سامنے ایک لاوارث بچے کو سنگسار کیا گیا'' (صفحہ ۱۵۷) تو ان کی نیند اڑ گئی۔

ایدھی صاحب نے اپنی زندگی کو آسائشوں سے بالکل مبرا کر لیا خود کو ایک ''خبطی سوشل ورکر ہی سمجھتے رہے'' (صفحہ ۱۸۱) سفر پر جانا ہوتا تو ہمارے مولانا حسرت موہانی کی طرح ایک تھیلے میں اپنا ساز و سامان رکھتے اور روانہ ہو جاتے۔ ساز و سامان بھی کیا تھا؟ ایک دو رسید بکیں۔ ایک دو وقت کی روکھی روٹی۔ ہاں زخمیوں دکھی لوگوں کی امداد کا طبی سامان مرہم پٹیاں دوائیاں وغیرہ۔ ان کا زیادہ تر کام لاوارث مردہ متعفن لاشوں کو سنبھالنے کا رہا یعنی وہ کام جس سے دوسرے جی چراتے ایدھی صاحب سامنے آجاتے۔ نام نہاد سماجی بہبود کی تنظیموں سے انہیں ہمیشہ چڑ رہی اور ضیاء الحق کے دور میں زمین سے اگ آنے والی سوشل ورک تنظیمیں تو ان کی نفرت کا ہدف رہیں (صفحہ ۲۰۹) کیونکہ ان لوگوں کا مقصد وحید نام و نمود اور عیش و عشرت کے سامان مہیا کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔

مجلس شوریٰ کے رکن بنائے گئے تو سرکاری مراعات سے فائدہ اٹھانے سے انکار کر دیا۔ تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو صدر کی موجودگی میں کھری کھری کہہ سنائیں۔ فلپائن والوں نے ان کی انسانی خدمات کے صلہ میں انہیں ایوارڈ دیا تو میاں بیوی ایک ایک جوڑا کپڑا تھیلے میں ڈال کر پہنچ گئے اور ہوٹل میں پہنچتے ہی اپنے پہنے ہوئے کپڑے دھو کر سوکھنے کو ڈال دئے کہ اگلے روز پہنے جا سکیں۔ یہ کوئی دکھاوا نہیں تھا عمر بھر ان کا یہی رویہ رہا۔ خان عبدالغفار خان کی خدائی خدمت گار تحریک اور علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی کی خاکسار تحریک سے انہیں اس لئے ہمدردی رہی کہ

خدمت خلق میں پیش پیش ہیں۔ (صفحہ ۴۰) عالیشان مسجدیں دیکھ کر انہیں ہمیشہ یہ خیال آتا کہ اتنی بڑی مسجدیں تعمیر کر دینے سے کہیں زیادہ بہتر تھا کہ ان کی زیبائش و آرائش پر خرچ ہونے والی رقوم خدمت خلق کے کاموں میں لگا دی جاتیں تو زیادہ ثواب کا موجب بنتیں (صفحہ ۵۶)

ان کا چہیتا نواسہ بلال ان کو باسی روٹی کا ناشتہ کرتے دیکھتا تو پوچھتا نانا آپ ہمیشہ باسی روٹی کا ناشتہ کیوں کرتے ہیں ان کا جواب ہوتا ''اس طرح میں خود کو بھوکوں کی یاد دلاتا ہوں'' (صفحہ ۱۲) اپنے اس عملی نمونہ پر ہمیشہ قائم رہے۔ مگر حاسدوں کی طعن و تشنیع کا نشانہ بنتے رہے۔ ایدھی فاؤنڈیشن کا سرمایہ بڑھتا ہی گیا مگر ان کی ذاتی زندگی اسی طرح سادہ رہی۔ مشرقی پاکستان سے لٹ پٹ کر آنے والے لوگوں کو ان کے عطا کردہ عطیات واپس کر دئے کہ اب یہ لوگ خود مستحق اور مظلوم اور زخم رسیدہ ہیں۔ (صفحہ ۱۲۶)۔

ہمارے ہاں کون ہے جو کفر کے فتووں کا مورد نہیں بنا۔ ایدھی صاحب بھی بنے مگر اس کافر کا ایمان متزلزل نہیں ہوا۔ ایک مسجد کے باہر ایک بینر پر لکھا گیا یہ غیر مسلم ہیں (صفحہ ۲۵۸) اسلام آباد کی ایک مسجد کے امام نے انہیں خط لکھا کہ ''آپ اچھے آدمی ہیں لیکن آپ کے خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ آغا خانی گروپ سے تعلق رکھتے ہیں میرے پاس آ جائیں کہ میں آپ کو سچا مسلمان بنا دوں'' (صفحہ ۲۵۹)

ان کی نگرانی میں پلنے والی بے سہارا اور لاوارث بچیوں پر بوالہوسوں کی نظر رہتی۔ ایک عمر رسیدہ صاحب ان کے پاس آئے اور کہا کہ ''وہ ادارہ کی کسی سولہ سالہ لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے صاف انکار کر دیا انہوں نے کہا میں نیک نیتی سے کسی بے سہارا لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا جو لڑکی بھی تم سے شادی کرے گی وہ خود بخود بے سہارا ہو جائے گی'' (صفحہ ۲۳۶)۔ اس پر ہمیں مجاز لکھنوی یاد آئے۔ اپنے بہنوئی جاں نثار اختر سے ایک بار کہنے لگے میں کسی بیوہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اختر نے کہا ''مجاز بھائی آپ کسی سے بھی شادی کر لیں وہی بیوہ ہو جائے گی''۔

ایدھی صاحب نے حج کے موقع پر کیسی مناسب دعا کی تھی جو قبول درگاہ الٰہی ہوئی کہ اے

خدا میری انا کو مکمل طور پر فنا کر دے (صفحہ ۱۳۳) اور یہ لاکھوں کروڑوں روپے کے سرمایہ سے خدمت خلق کے کام کرنے والا بے نفس شخص ''پرلے درجے کا خاکروب ہی رہا'' (صفحہ ۷۲)۔ سماجی خدمت کے کاموں پر بے دریغ خرچ کرنے والا شخص اپنی ذاتی زندگی میں کنجوس اور حد درجہ کفایت شعار رہا۔

اس کتاب کا خلاصہ گویا یوں ہے کہ ''میں کسی سیاست دان سے وابستہ نہیں تھا کسی سے عداوت بھی نہ تھی۔ کوئی غرض نہ تھی کون اقتدار میں ہے اور کون اقتدار سے محروم نہ ہی مجھے کسی مارشل لاء کا دھڑکا تھا۔۔۔ میرا کام توڑ پھوڑ آمریت اور اس کے اثرات کے باوجود اپنے ہی انداز میں چلتا رہا۔ کرپشن اور دوسری واضح برائیاں راستے کا پتھر نہ بن سکیں'' (صفحہ ۲۸۷) اور یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہوا کہ اس کام کی بنیاد نیک نیتی پر تھی۔ خدا کسی کے نیک کام کو ضائع نہیں کرتا۔ خدا کرے ایدھی صاحب کا صدقہ جاریہ ان کے بعد بھی جاری رہے اور امید واثق ہے کہ جاری رہے گا۔

کتاب کے اسلوب میں جگہ جگہ تہمینہ درانی کا اسلوب جھلکتا نظر آتا ہے۔ ''مینڈا سائیں'' لکھ کر جو نیک نامی یا بدنامی آپ نے کمائی تھی ایدھی صاحب کی سوانح مرتب کر کے گویا آپ نے اس کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔

✓

بیتے لمحوں کی چاپ

پچھلے برس ہمارے تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے زمانہ کے ساتھیوں دوستوں میں سے جسٹس ریٹائرڈ محمد اسلام بھٹی کی خودنوشت چھپی تھی جس کے تعارفیہ میں ہم نے لکھا تھا یہ بارش کا پہلا قطرہ ہے دیکھئے اب اور کون اس میدان میں اترتا ہے اب کے برس ۲۰۰۹ میں پروفیسر سمیع اللہ قریشی کی خودنوشت ''بیتے لمحوں کی چاپ'' بک ہوم لاہور والوں کی جانب سے چھپی ہے۔ اتفاق یوں ہے کہ یہ دونوں دوست ہمارے ہم عمر ہیں سمیع اللہ پانچ مہینے بڑے اور اسلام بھٹی ایک مہینہ چھوٹے ہیں۔ ہم کالج کے مجلّہ المنار کی ادارت میں ان کے جونیئر شریک بھی رہے ہیں۔ جونیئر یوں کہ ہم نے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد دوسال تک کالج میں داخلہ نہیں لیا کہ ربوہ میں کوئی کالج تھا ہی نہیں اور ہمارے ابا کے وسائل اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ لاہور میں ہمیں داخل کرواسکیں۔ اگر ہماری بھی ان دو دوستوں کی طرح فرسٹ ڈویژن ہوتی تو تعلیم الاسلام کالج ہمیں وظیفہ دے دیتا۔ اور ہم تینوں دوست کالج میں یکجا رہتے۔ مگر ہماری سیکنڈ ڈویژن تھی ہم کسی طور سے کسی وظیفہ کے مستحق نہ تھے۔ اس لئے ہم کالج میں ان سے دوسال جونیئر ہو گئے۔

دو تین برس پہلے پروفیسر سمیع اللہ قریشی کی ذات اور ان کے اوصاف کے بارہ میں ان کے دو تین شاگردوں کی مرتب کردہ کتاب ''استاد محترم'' ہمیں ملی تھی (جس کے بیشتر مندرجات اس خودنوشت کا حصہ ہیں)۔ اس میں گورنمنٹ کالج جھنگ کے اساتذہ کے ایک پینل نے اپنے پرنسپل کی زندگی کے کوائف کے باب میں ان سے انٹرویو کیا تھا۔ اس میں پروفیسر سمیع اللہ قریشی نے فرمایا تھا کہ ۱۹۵۱ میں میٹرک کے بعد وہ اسلامیہ کالج سول لائنز میں داخل ہوئے تھے اور دو

سال وہاں زیرِ تعلیم رہے تھے۔ (استاد محترم صفحہ ۲۰) ہم نے سمیع اللہ قریشی کو لکھا تھا کہ بھائی میرے تم تو تعلیم الاسلام کالج لاہور میں داخل ہوئے تھے اسلامیہ کالج سول لائنز کا تو اس وقت کوئی وجود ہی نہیں تھا قیام پاکستان سے قبل یہ عمارت ڈی اے وی کالج کی عمارت تھی۔ پھر تعلیم الاسلام کالج اس میں مہمان ہؤا۔ ۱۹۵۴ میں جب ربوہ میں کالج کی اپنی عمارت تعمیر ہوگئی تو وہ عمارت ۱۹۵۴ میں اسلامیہ کالج سول لائنز کے حصہ میں آئی۔ مگر سمیع اللہ نے اپنی عادت کے خلاف اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ دوسری بات سمیع اللہ نے یہ کہی تھی کہ وہ ''گورداسپور کے ایک قصبہ اسلام پور قاضیاں میں پیدا ہوئے تھے'' (صفحہ ۱۷)

جماعت احمدیہ کے مرکز قادیان کا یہ صدیوں پرانا نام تھا۔ ہم نے اس کی زیادہ پروا نہیں کی کہ سمیع اللہ کو تاریخِ قدیم کا بڑا شوق ہے اس نے اپنی تاریخ دانی کا ثبوت دینے کے لئے یہ نیا طریق اختیار کیا ہوگا۔ اب ان کی خودنوشت سامنے آئی ہے تو اندازہ ہؤا ہے کہ یہ سارے پاپڑ سمیع اللہ قریشی کو اس لئے بیلنا پڑے کہ انہیں جماعت احمدیہ کے مسلک سے اپنی بریت کا اظہار کرنا تھا۔ بسم اللہ! ہمیں تو دوست کی دوستی عزیز ہے اس کے نو تصنیف کردہ عقائد سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ اب تک ہم یہی سمجھتے چلے آرہے تھے کہ سمیع اللہ قریشی ہمارا دوست ہے کالج فیلو ہے اور قادیان کے ایک مخلص احمدی گھرانے کا فرد ہے۔ عقیدہ کے لحاظ سے ہمارا ہم مسلک ہے۔ ربوہ کا ہمارا محلّہ دار ہے ہمارا اس کا بہت اٹھنا بیٹھنا رہا ادب کے ناطہ سے ہم ہم خیال بلکہ ''بزم خیال'' کے رکن رہے۔ پھر فلکِ تفرقہ پرداز نے سنگ تفرقہ پھینکا کہ ہم بکھر گئے کوئی کہاں گیا کوئی کہیں کہ یہی زندگی کا دستور ہے۔ مگر اس خودنوشت نے دو حوالوں سے ہمیں بہت رنجور کیا۔ پہلا رنج تو اس بات کا ہے کہ ایک استاد ہوتے ہوئے سمیع اللہ قریشی نے اپنی مادر علمی تعلیم الاسلام کالج کا وہ احترام روا نہیں رکھا جس کا یہ عظیم ادارہ مستحق تھا۔ اس ادارہ نے کڑے وقت میں ان کی دستگیری کی۔ چار سال ان کی فیس معاف رہی۔ دوسرے واجبات کے لئے انہیں وظیفہ ملتا رہا۔ اس ادارہ نے ان کی علمی ادبی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ اس کالج کے وقیع میگزین ''المنار'' کے حلقہء ادارت میں رہے۔ انہیں اعتراف ہے کہ اسی کالج میں ''قومی سطح پر ہونے والی

کل پاکستان اردو کانفرنس میں انہیں مقالہ پڑھنے کا موقعہ ملا'' (بیتے لمحوں کی چاپ صفحہ ۱۳۸) یہ تعلیم الاسلام کالج ہی تھا جس نے انہیں پہلی بار قومی سطح کا فورم مہیا کیا۔ ان کے ساتھ ہی استاذی المحترم سید سجاد باقر رضوی تشریف لائے تھے وہ جب تک زندہ رہے اس بات کا ذکر کرتے رہے کہ تعلیم الاسلام کالج ربوہ نے انہیں پہلی بار قومی سطح پر مقالہ پڑھنے کی اعزاز بخشا تھا ادھر کالج کا ایک سابق طالب علم یہ اعزاز مہیا کرنے والے کالج سے تعلق ہی سے منکر ہے۔

سمیع اللہ قریشی تو خود ایک ادارہ کے سربراہ رہے کیا انہیں اس بات کا خیال نہیں آیا کہ مادر علمی کا احترام کرنا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ پھر وہ اپنے بہاولنگر گوجر خان اور جھنگ کے رفقاء اور اپنے شاگردوں کے اوصاف بیان کرنے میں تو رطب اللسان رہے اپنے اساتذہ کا انہیں خیال نہ آیا جن کے علم سے وہ فیضیاب ہوتے رہے؟ انہیں ربوہ کے ان علماء کے نام کیوں بھول گئے جن سے وہ اپنے ایم اے کی تیاری کے دوران استفادہ کرتے رہے؟ انہیں خلافت لائبریری کیوں یاد نہ آئی جس کے بے پناہ علمی خزانے کے سامنے پاکستان کے دوسری لائبریریاں ہیچ بلکہ محض ہیچ ہیں؟ اور جس سے انہیں جماعت احمدیہ کے سکول کا استاد ہونے کی وجہ سے کتابیں حاصل کرنے کا استحقاق میسر رہا؟ ان کے ذہنِ رسا سے اپنی وہ نظمیں کیوں محو ہو گئیں جو جماعت احمدیہ کے اکابر و عقائد کے بارہ میں جماعت احمدیہ کے پرچوں کی زینت بنتی رہیں؟

بے آب وگیہ وادیٔ ربوہ کے نظارے۔

بے چین مچلتے ہوئے دریا کے کنارے۔

جا جا کے جہاں بستے ہیں اللہ کے پیارے۔

بہتے ہیں جہاں دین کے اسلام کے دھارے۔۔۔۔۔۔ اے وادیٔ ربوہ!

گونج اٹھتی ہیں اطراف میں ربوہ کی اذانیں۔

اسلام کے اس نغمۂ توحید کی تانیں۔

ہر سمت جہاں پھیلی ہیں پتھریلی چٹانیں۔

ملتی ہیں چٹانوں ہی میں بس نور کی کانیں۔۔۔ اے وادیٔ ربوہ!''

انہیں جماعت احمدیہ کے خدا رسیدہ بزرگوں کی دعائیں کیوں بھول گئیں جن کی برکت سے وہ کامیابی پر کامیابی حاصل کرتے چلے گئے؟ کیا وہ حضرت مولانا راجیکی صاحب کے در پر دعاؤں کے لئے حاضر ہونا بھول گئے ہیں؟

دوسری بات جس نے ہمیں بہت رنجور کیا وہ قریشی صاحب کا وہ خط ہے جو ۱۹۶۵ میں زندگی میں چھپا کہ'' بیس برس سے اوپر کا عرصہ ہونے کو آیا ہے میرا مرزائیت احمدیت قادیانیت یا لاہوریت سے کوئی تعلق نہیں'' (صفحہ ۲۹)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ تقسیم ملک سے قبل ہی ۱۹۴۵ میں احمدیت سے لاتعلق ہو چکے تھے۔ ۱۹۴۵ سے ۱۹۶۵ تک جو کچھ انہوں نے احمدی رسائل و جرائد میں لکھا یا جماعت کے ادارہ جات و وسائل سے فائدہ اٹھایا وہ محض سوئے اتفاق کے زمرہ میں آتا ہے۔ ہیں ستارے کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ میں اپنے کسی دوست کے لئے دوسرا مصرعہ لکھنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا کہ ''دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا۔''

سمیع اللہ قریشی اسلامیات کے مضمون میں پبلک سروس کمشن سے چنے گئے۔ نوکری پکی ہو گئی تو انہیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ بدلتے ہوئے حالات میں کسی احمدی کا اسلامیات کے استاد کے عہدے پر فائز ہونا ممکن نہیں رہے گا تو ہمارے اس ذہین دوست نے اس طوق کو گلے سے اتار پھینکنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۹۶۵ کی حد فاصل اس لئے لگائی ہے کالج کے پرنسپل مرزا ناصر احمد اس سال خلافت کے مرتبہ پر سرفراز ہو گئے تھے۔ اور مرزا ناصر احمد سمیع اللہ قریشی کو ''کسی صورت میں حیثیت میں قبول نہیں تھے۔ امتحان میں نقل کروانے کے جرم میں پرنسپل نے انہیں بند کمرہ میں بدنی سزا دی تھی'' (صفحہ ۱۰۳) اگر ایسا ہی کوئی کیس پرنسپل سمیع اللہ قریشی کے سامنے آتا تو ان کا کیا ردعمل ہوتا؟ خود قریشی صاحب کا فرمودہ ہے کہ ''استاد کبھی اپنے شاگرد کا دشمن نہیں ہوتا'' (صفحہ ۳۳۴)

سمیع اللہ قریشی نے نہ صرف خود احمدیت سے لاتعلقی کا اظہار کیا ہے بلکہ اپنے نیک متقی باپ دادا کے ایمان کو بھی ناقص کہنے کی جرات کی ہے۔ ''دادا بریلوی ڈھب کے احمدی تھے'' (صفحہ ۴۰) ''ابا جی عقائد میں متشدد تھے۔ ۲۰۰۵ کے رمضان سے کچھ پہلے میرے پاس آ گئے میں نے

ایک دن بے وجہ ہی ان سے پوچھ لیا "ابا جی کیا اب بھی آپ اپنے عقائد پر راسخ ہیں؟ وہ دو چار لمحے چپ رہے پھر کہا "یار تم بھی سچے ہو مگر میں بھی غلط نہیں" (صفحہ ۵۳) ایک ایسا متقی پرہیز گار شخص جس نے عمر بھر تقویٰ کو ہر چیز پر اولیت دی ہو ایسا مداہنت بھرا جواب کیسے دے سکتا ہے؟" میرے بہادر، ان تھک محنتی، دیانت دار اپنے عقائد کی صحت پر پکا یقین رکھنے والے۔۔۔ ابا جی ۹۱ برس کی عمر میں ہم سے رخصت ہو گئے" (صفحہ ۴۴۱) تو نیک اور سعادت مند بیٹے نے مداہنت کا تمغہ اپنے مرحوم باپ کے سینہ پر سجا دیا۔ تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو! یار تم نے بزعم خود اپنی عاقبت سنوار لی اپنے باپ دادا کی عاقبت کیوں خراب کرتے ہو؟

ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ "میرا اس مسلک سے سن شعور میں آنے کے بعد سے کوئی بھی اعتقادی واسطہ نہ تھا" (صفحہ ۳۱۱) حیرت ہے ہمارا ان سے ان کے سن شعور میں آنے کے بعد مدتوں واسطہ رہا ہم نے تو کبھی ان کے منہ سے کوئی ایسی بات نہ سنی جس سے ان کی اس بات کی تصدیق ہوتی۔ یا ہم اتنے گئے گذرے تھے کہ ہمیں ایک دوست کے اندرونے کا علم نہ ہو سکا یا ہمارا دوست اتنا گہرا تھا کہ اس کا باطن ہم پر آشکارا نہ ہو سکا۔

سمیع اللہ قریشی کی اس خودنوشت میں واقعاتی غلطیاں بہت ہیں۔ قادیان کی مسجد اقصیٰ کے صحن میں جو سنگ مرمر کے تعویذ والی قبر تھی اس پر لکھا تھا کہ وہ قبر مرزا غلام قادر صاحب کی ہے جو مرزا صاحب کے والد تھے (صفحہ ۱۲)۔ مرزا غلام احمد صاحب کے والد گرامی کا نام مرزا غلام مرتضیٰ تھا یہ ان کی قبر تھی جن کی وصیت یہ تھی کہ انہیں ان کی بنائی ہوئی مسجد میں دفن کیا جائے تا کہ اذان کی آواز مرنے کے بعد بھی کانوں میں پڑتی رہے۔ اپنے ابا کے دوستوں میں انہوں نے زیڈ اے سلہری کا نام لیا ہے۔ (صفحہ ۴۹) اور انہیں ظہیر احمد سلہری کہا ہے۔ ان کا نام ضیاء الدین احمد سلہری تھا۔ ان کی والدہ آخری عمر میں ربوہ کی گلیوں میں مرزا صاحب کا نعتیہ کلام گاتی پھرتی رہتی تھیں۔

ربوہ میں ایک فاتر العقل شخص مرزا اچھو گلیوں میں گھومتا رہتا تھا اس نے سمیع اللہ قریشی کو بتایا تھا کہ "مرزا سلطان احمد نے اپنے چھوٹے بھائی کی بیعت نہیں کی تھی" (صفحہ ۲۳) تاریخ میں تواتر کے ساتھ ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ وہ اواخرِ عمر میں اپنے چھوٹے بھائی سے بیعت ہو گئے

تھے مگر قریشی صاحب نے اس فاتر العقل کی بات کو سند جانا ہے اور اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کو لکھا ہے "وہ اپنے [illegible] رد سمیٹے گھومتا رہتا تھا مگر اس کے ہوش و حواس قائم تھے" (صفحہ ایضاً) اس کے ہوش و حواس [illegible] ر قائم ہوں گے کہ اس نے چن کر ایسے شخص سے اپنا خاندانی راز کہا جس کی دوسروں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ولی را ولی می شناسد۔

قریشی صاحب نے اپنے سکول کے نیک اور متقی اساتذہ کا ذکر بھی بہت سرسری انداز میں کیا ہے۔ سید محمود اللہ شاہ ہیڈ ماسٹر سوٹ بوٹ پہننے والے مغربی طرز رہائش کے دلدادہ شخص تھے مگر حافظ قرآن تھے۔ ہر صبح سکول کی اسمبلی میں خود ایک دن قرآن کا اور ایک دن حدیث رسول کا درس دیا کرتے تھے۔ سکول کے ان اساتذہ سے قریشی صاحب نے جو فیض پایا وہ اس بات کا متقاضی تھا کہ ان کا ذکر شکر گزاری سے کیا جاتا۔ من لا یشکر الناس والی بات انہیں یاد نہیں؟

ڈاکٹر سید معین الرحمن کے باب میں بھی انہیں تسامح ہوا۔ اِن کا پی ایچ ڈی کا مقالہ پنجاب یونیورسٹی کا نہیں سندھ یونیورسٹی کا تھا (صفحہ ۱۴۴) استاذی المکرّم سید وقار عظیم صاحب کی نگرانی میں آپ نے غالب صدی کے سلسلہ میں غالب پر لکھی گئی کتب کا اشاریہ مرتب کیا تھا۔

ظہور نظر کے بارہ میں آپ نے لکھ دیا کہ مولویوں نے ان کا جنازہ نہیں پڑھایا اور ان کی بیوی ان کی لاش تدفین کے لئے ربوہ لے کر آئی (صفحہ ۱۴۹)۔ ظہور نظر کی لاش کی بے حرمتی کا ذکر پہلے پہلے قتیل شفائی نے اپنی خودنوشت میں کیا تھا (گھنگرو ٹوٹ گئے صفحہ ۴۲۲)۔ پھر بزرگوارم حمید اختر صاحب نے اپنے کالم (ایکسپریس لاہور مورخہ ۸ دسمبر ۲۰۰۹) میں اس کا ذکر کیا تو امریکہ سے تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے میرے ایک شاگرد عزیزم طاہر نیاز نے ہیوسٹن ٹکساس سے ۱۰ دسمبر کو ای میل بھیجی کہ "ظہور نظر صاحب کے جنازہ میں تاخیر تو ضرور ہوئی مگر کسی سنی مولوی نے طوعاً کرہاً ان کا جنازہ پڑھایا اور وہ بہاولپور میں اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہیں جہاں ان کے دو تین بھتیجے بھی آسودہ خاک ہیں ان کا بیان ہے کہ وہ خود بھی ان کی تدفین میں شریک تھے۔ ان کا جنازہ ربوہ نہیں لے جایا گیا۔" قریشی صاحب نے سنی سنائی لکھ دی ہے۔

عجیب تر بات یہ ہے انہیں جن جن لوگوں سے واسطہ پڑا یہ پہلے ان کے احمدی یا لاہوری

احمدی ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ پروفیسر محبوب الٰہی (صفحہ ۱۱۸) حبیب اللہ بھٹی (صفحہ ۱۸۲) عبد الباسط (صفحہ ۱۰۸) مقبول الٰہی (صفحہ ۹۹) اور پھر ان کے تائب ہونے کا قصہ لے بیٹھتے ہیں یا ان کے مبینہ طور پر تائب ہو جانے کے باوجود احمدی ہونے کی وجہ سے ان کے ظلم وتشدد کا شکار ہونے کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اس سے یہی بات آشکار ہوتی ہے کہ یہ خود اپنی بریت کا شدومد سے اس لئے چرچا کرتے ہیں کہ کہیں لوگ ان کو بھی احمدی جان کر تشدد کا نشانہ نہ بنا دیں مگر قادیانی ہونے کا داغ ان کے دامن سے مٹایا نہ جا سکا۔ اور کیسے مٹتا؟ آپ تو پیدا ہی قادیان میں ہوئے تھے اور سب کچھ قادیانی اساتذہ کے فیض سے پایا تھا۔ پروفیسر محمد عبد السعید ڈی پی آئی، پروفیسر جیلانی کامران، شیر محمد اختر، عارف عبد المتین، ان لوگوں کو تو اپنے آباؤ اجداد سے اختلاف کے باوجود ان کے عقائد پر کبھی اعتراض نہ ہوا؟ نفسیات دان کہا کرتے ہیں کہ اپنی اصل کو چھپانا احساس کمتری کی بدترین قسم ہوتی ہے جو شکار ہونے والوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی؟ واللہ اعلم بالصواب۔ اللہ نے انہیں اتنا کچھ دیا اتنی عزت دی اس پر شکر گزار ہوں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ حج بیت اللہ کی برکت ہے کہ قریشی صاحب نے اپنی خودنوشت میں قادیان کا نام لے لیا ہے اور اپنے باپ دادا کے نیک اور متقی ہونے کا اعتراف کر لیا ہے۔ میں انہیں یقین دلاتا ہوں کہ ان کے شاگرد اور دوست ان کے قادیان میں پیدا ہونے کا جان کر کبھی برہم نہیں ہونگے نہ اس بات پر شکوہ کناں کہ قریشی صاحب عمر بھر قادیان کا نام لینے سے کیوں کتراتے رہے۔

اپنی خودنوشت میں قریشی صاحب نے تصاویر تو بجا طور پر شامل کیں مگر ضروری غیر ضروری سرٹیفکیٹوں کی بھرمار کی ہمیں سمجھ نہیں آئی؟ یہ سرٹیفکیٹ ''ان کے توصیفیے'' ''استاد محترم'' میں بھی موجود تھے خودنوشت میں بھی مکرر موجود ہیں۔ خدا جانے ان کی لم کیا ہے؟

صاف ستھری زبان میں لکھی گئی یہ خودنوشت مشتاق احمد یوسفی صاحب کی مشہور زمانہ اصطلاح میں پروفیسر سمیع اللہ قریشی کی ''ضدوجہد'' کی آئینہ دار ہے۔

✓

ہم کہاں کے دانا تھے

میرے بزرگ دوست اور دیرینہ کرمفرما قبلہ شیخ منظور الٰہی مرحوم ومغفور کی خودنوشت ''ہم کہاں کے دانا تھے'' کئی برس قبل علامت میں قسط وار چھپنا شروع ہوئی مگر خدا جانے شیخ صاحب کی علالت آڑے آئی یا سعید شیخ کی اچانک وفات کہ علامت بند ہو گیا ساتھ میں شیخ صاحب کی خودنوشت بھی چھپتے چھپتے رہ گئی۔ ایک خط میں شیخ صاحب نے لکھا تھا کہ سنگ میل والوں کے اصرار پر خودنوشت لکھنے کا ڈول تو ڈال دیا ہے دیکھئے یہ کام تکمیل تک پہنچتا ہے کہ نہیں؟ وہی ہوا۔ علامت کی بندش کے ساتھ شیخ صاحب کی خودنوشت کا سلسلہ رک گیا مگر ادب دوست احباب کا اصرار جاری رہا کہ اسے مکمل کیجئے۔ پھر شیخ صاحب لمبا عرصہ بیمار رہے۔ ٹھیک ہوئے تو یہ سلسلہ جہاں ٹوٹا تھا وہاں سے اس کا سرا دوبارہ پکڑا۔ اور مکمل کر کے اپنی وفات کے قبل مسودہ اپنی رفیقہء حیات محترمہ زہرا منظور الٰہی کے حوالے کر دیا کہ اسے مکمل جانئے اور چھپنے کو دے دیجئے۔ ادھر اردو کی خودنوشت سوانح عمریوں پر میری تیسری کتاب پس نوشت سوم کے عنوان سے چھپنے کو تیار تھی میری خواہش تھی کہ شیخ صاحب کی خودنوشت چھپ جائے تو اس کا تجزیہ بھی اس کتاب کا حصہ بنے تاکہ میری کتاب کو ادبی حلقوں میں وقعت ووقار حاصل ہو۔ مگر شیخ صاحب کی وفات کے صدمہ سے سنبھلتے سنبھلتے محترمہ زہرا منظور الٰہی کو بہت وقت لگا۔ اس دوران مجھ جیسے چند دوستوں کا اصرار جاری رہا۔ محترمہ زہرا کو شیخ صاحب کے لکھے ہوئے آخری باب کو کتاب کا حصہ بنانے میں حجاب تھا۔ یوسفی صاحب نے بھی یہی مشورہ دیا کہ جس باب کو شیخ صاحب خود آخری باب قرار دے گئے ہیں اسے اسی صورت میں کتاب کا حصہ بننا چاہیے۔ مجھ سے ہیچ مدان نے بھی بہ اصرار ان سے مسودہ

مانگا (شیخ صاحب وقتاً فوقتاً مسودہ کے بعض حصے مشورہ کے لئے اس حقیر غریب الوطن دوست کو بھجواتے رہتے تھے اس لئے محترمہ زہرا منظور الٰہی کو بھی مسودہ بھیجنے میں کوئی انقباض نہ ہوا) مگر مجھے مسودہ عطا کرتے ہوئے آپ نے یہی خیال ظاہر کہ آخری باب کی شمولیت کے باب میں انہیں شرح صدر نہیں۔ مگر مسودہ پڑھنے کے بعد میں بھی اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ باب جو زندگی بھر کی رفیقہ محترمہ زہرا منظور الٰہی کے ذکرِ خیر و تشکر پر مشتمل ہے شیخ صاحب کی خودنوشت کا لابدی جزو ہے اس لئے اسے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ زہرا منظور الٰہی کی خودستائی سے اباء، ایک طرف شیخ صاحب نے زندگی کے احوال میں کسی جگہ بھی زہرا کو علیحدہ تشخص شمار نہیں کیا تو خودنوشت میں انہیں جدا کیوں سمجھا جائے۔ میری خواہش یہی ہے کہ جب یہ خودنوشت چھپے تو اس میں شیخ صاحب کی قائم کردہ ترتیب و تہذیب قائم رہے۔

شیخ منظور الٰہی ہماری سول سروس کے نیک نام ترین افسر تھے اور معاشرہ میں اپنی افسری کے ناطے نہیں اپنی شرافتِ نفس، علمیت، بردباری اور فروتنی کی وجہ سے ہر دل عزیز تھے۔ ان کی تحریر میں انوکھا بانکپن تھا۔ ایجاز و اختصار ان کا امتیاز تھا۔ وہ نثر میں بھی شعروں جیسا بانکپن پیدا کر دیتے تھے اس پر برمحل اردو فارسی اشعار ان کے لکھے کو صیقل کر دیتے تھے۔ مشتاق احمد یوسفی نے آب گم میں فارسی شعروں کے بے محابا استعمال پر انہیں دوستانہ طعنہ دیا تھا کہ ایک فارسی شاعر کا شعر لکھتے ہی انہیں دوسرا فارسی شاعر یاد آ جاتا ہے "وقت ضائع کرنے پر شیخ سعدی نے کیا خوب کہا ہے۔۔۔ مگر بیدل نے اسی مضمون کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا" (آبِ گم صفحہ ۲۵) مگر شیخ صاحب اپنی طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہیں خودنوشت میں بھی ان کا یہ انداز قائم ہے۔ "غالب نے یہ کہہ کر اپنی برات کر لی تھی کہ رد و قبول کے درمیان سرگرداں مجھ رند کو سجدہ کرنے میں کیا عذر ہوتا مگر صنم کی ضد آڑے آئی اس نے وفاداری بشرط استواری کا طعنہ دے دیا:

رند ہزار شیوہ را طاعت حق گران نبود

لیک صنم بہ سجدہ در ناصیہ مشترک نخواست

نظیری بتکدہء تصورات مسمار کرنے کے درپے تھے انہیں ایسی بے یقینی کہاں گوارا تھی:

باز خواہی آمدن از نقش بازیہا خیال

ایں دو چشم بت گر من بت شکن خواہد شدن"

(ہم کہاں کے دانا تھے صفحہ ۴۳)

انہیں عربی شاعری پر بھی یکساں دسترس حاصل تھی مگر اس خودنوشت میں کوئی عربی شعر آپ نے درج نہیں کیا حالانکہ انہیں عربی شعروں کی ایمائیت بہت کشش کرتی تھی۔

یہ خودنوشت کسی بلند مرتبہ افسر کی خودنوشت نہیں لگتی پھلوں سے لدی پھندی جھکی شاخوں والے کسی ثمر آور پیڑ اور پھولوں سے مہکتے کسی پودے کی سرگزشت لگتی ہے۔ ہمارے ہاں فروتنی اور عاجزی کے اوصاف معاشرہ سے یوں عنقا ہیں گویا ان کا کبھی کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ شیخ منظور الٰہی کی خودنوشت انہی اوصافِ نایاب و کمیاب سے بھری پڑی ہے۔

ان کی تحریر کا بنیادی وصف ان کی ثقاہت ہے۔ میں "ابتذال سے کبھی سمجھوتا نہ کر سکا" (صفحہ ۶۱) یہ اوصاف انہیں جہاں بھی نظر آئے ان کی قدر کی۔ احوال الرجال میں محمد طفیل صاحب کے ذکر میں بھی اس بات کا خاص طور سے ذکر کیا ہے کہ "وہ ابتذال سے نفور تھے" (صفحہ ۱۴۹) مشہور افسانہ نگار رام لعل کو پیش آنے والی واردات بیان کرتے ہوئے بھی ثقاہت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا "رام لعل کا تعلق میانوالی سے تھا بٹوارے کی افراتفری میں اپنے دوست کے ساتھ راجپورہ اسٹیشن پر پانی پینے کے لئے گاڑی سے اترے۔ شلوار قمیص دیکھ کر بلوائیوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ انہیں ہم مذہب ہونے کا یقین دلا رہے تھے مگر وہ مان کے نہیں دئے ستم یہ ہوا کہ جان چھڑانے کے لئے انہوں نے قرآن کی قسم کھا لی۔ بلوائی غضبناک ہو گئے "ہم نہ کہتے تھے یہ مسلے ہیں" چاروناچار اثبات دعویٰ میں انہیں وہی کچھ کرنا پڑا جس میں حجاب مانع تھا" (صفحہ ۳۶) حالانکہ رام لعل نے اپنی خودنوشت "کوچہء قاتل" میں صاف لکھا ہے کہ بلوائیوں کو تب تک اطمینان نہ ہوا "جب تک انہوں نے ہماری شلواریں کھلوا کر اطمینان نہ کر لیا" (کوچہء قاتل صفحہ ۱۶۰) رام لعل نے جو بات لکھ دی منظور الٰہی کو وہی بات کہنے میں حجاب مانع رہا۔

ہمارے سی ایس پی افسران کی انانیت سے بھرپور خودنوشتوں کے دشت بے اماں میں

پچھلے چند برسوں میں انسانیت کی سطح پر اتر کر جو خودنوشتیں لکھی گئیں ان میں جسٹس صمدانی کی جائزہ، منصور کاظم کی میری داستان، جیون خاں کی جیون دھارا اور مسعود کھدر پوش کی خودنوشتیں نمایاں ہیں مگر شیخ صاحب کی خودنوشت ان سب سے اس طرح بھی بازی لے گئی ہے کہ آپ نے اپنی خود نوشت میں اپنی افسریت اور حاکمیت کا ذکر تک نہیں آنے دیا۔ حالانکہ وہ ایک صوبے کے چیف سکرٹری رہے۔ وزارت علیا کا مزا بھی چکھا۔ سیٹلمنٹ کے محکمہ کے سربراہ بھی رہتے۔ اپنی ایمانداری اور دیانت داری کی پاداش میں وقت سے پہلے فارغ کر دئے جانے کا دکھ بھی اٹھایا مگر ہر حال میں صابر وشاکر رہے۔

ان کی خودنوشت میں زیادہ تر ذکر ادبی لوگوں سے میل جول کا ہے۔ احوال الرجال میں بھی ادیب شاعر نمایاں ہیں سیاست دان کمتر۔ قائداعظم کا ذکر ان سے ایک ملاقات تک محدود ہے مگر اس دکھ کا ذکر بھی ہے کہ مسلمانوں کے پاس وسائل نہیں تھے اور قائداعظم پنجاب کے مسلمانوں سے چندہ کی اپیل کرتے تھے تو چونیاں اٹھنیاں ملتی تھیں اس پر ہندو کارٹونسٹ طنزیہ کارٹون بناتے تھے ''رسیدوں پر قائداعظم دستخط خود کر رہے تھے۔ لاؤڈ سپیکر پر معطی اور عطیہ کا علان ہو رہا تھا۔ روزنامہ ٹربیون نے ایک کارٹون میں قائد کو منگتے کے روپ میں دکھایا بدن پر برائے نام لباس گلے میں ڈھول جس میں سے چندہ چندہ کی صدا آ رہی تھی مسلم لیگ اور مسلمانوں کی کم مائیگی پر یہ ایک اور طنز تھا کہاں گاندھی جی کی تحویل میں سیٹھ برلا کی بلینک چیک بک کہاں چونیوں اٹھنیوں کا شمار'' (صفحہ ۱۱۰) اس عبارت میں صرف صورت حال کا بیان نہیں لکھنے والے کے دل کا درد بھی نمایاں ہے۔ سیٹھ برلا کی بلینک چیک بک کا ہی تذکرہ نہیں ہم کہاں کے دانا تھے کے صفحہ ۱۰۹ پر اس بات کا ذکر بھی ہے کہ ''سیٹھ برلا نے ڈاکٹر اختر حسین جیسے نابغۂ روزگار شخص کو ڈاکٹر ذاکر حسین کی سفارش کے باوجود اپنے اخبار میں لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ انہیں اپنے اخبار سے کسی مسلمان کی وابستگی پسند نہیں'' (گرد راہ صفحہ ۶۰)۔

یہ واحد خودنوشت ہے جس میں لکھنے والے نے دوستوں عالموں اور ادیبوں شاعروں کو اولیت واہمیت دی ہے۔ مولوی محمد شفیع صاحب کی علم دوستی اور تنہائی میں دلجمعی سے بیٹھ کر کام کرنے

کا ذکر ہے (صفحہ ۵۲) جگر صاحب کی ''باوقار شخصیت انکساری وضع داری فن پر کڑی گرفت جذبات واحساسات کے اظہار میں ملائمت ولطافت تجربے کی آفاقیت اور اس پر مستزاد ان (کے) مخصوص ترنم'' (صفحہ ۶۸) کا بیان ہے۔ ''شاہنامۂ اسلام سے پہلے کے حفیظ ہیں۔۔۔ بذلہ سنجی ضلع جگت ان کے گھر کی باندی تھی'' (صفحہ ۶۹) احسان دانش کی جوانی اور ان کی پاٹ دار آواز سے زیادہ ہمیں ان کی اس بات نے متاثر کیا کہ ''سردیوں میں گیروا کھدر اور پرانا کوٹ ان کا لباس تھا۔۔۔ میں نے کہا شام کو ماحضر ہمارے ہاں ہوگا۔ تشریف لائے مگر کوئی چیز چکھ کے نہ دی۔ آپ کا حکم تھا حاضر ہو گیا ہوں۔ غربت کے زمانہ سے صرف ایک وقت کھانا کھاتا ہوں'' (صفحہ ۷۰) اور یہ بات خود ہمارے تجربے میں بھی آئی ہے۔ ہمارے ہاں تعلیم الاسلام کالج میں کئی مرتبہ مہمان ہوئے مگر کھانا ایک وقت ہی کھاتے تھے۔

عابد علی عابد کی علمیت کا اعتراف ہے (صفحہ ۷۵) اسی کی دہائی کے اسلام آباد کے ادبی منظر نامے کا احوال ہے۔ (صفحہ ۱۲۹) شہاب صاحب کے مرید ممتاز مفتی کا بیان ہے ''لوگ کہتے ہیں آپ سلسلۂ شہابیہ سے منسلک ہیں؟ شہاب صاحب کے مریدوں میں سے ہیں۔'' میں نے پوچھا۔ جواب تھا ''No Sir , the only mureed'' (صفحہ ۱۳۱) جوش صاحب کے ساتھ قریبی رابطہ کا سلسلہ ہے مگر ان کے جنازہ کی تفصیل میں نے پہلی بار ان کے ہاں دیکھی ہے ''وہ بڑا سرد دن تھا سہ پہر کو خبر ملی کہ جوش صاحب انتقال کر گئے۔ کوئی بیس موٹر ہوں گے جب ایک کارواں کی صورت میں ہم میت لے کر چلے۔ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اس وقت دیکھا افتاں خیزاں فیض صاحب چلے آ رہے ہیں۔ اہلِ تشیع اپنے مسلک کے مطابق صف باندھے کھڑے تھے فیض صاحب اس نماز میں شامل ہو گئے۔ وہ صاحبِ صدر سے مل کر آ رہے تھے'' (صفحہ ۱۳۷) حجاب امتیاز علی کے من وسلویٰ اور ادا جعفری کے سلسلہ کا ذکر ہے۔ نور الحسن جعفری کی بے نفسی اور دوست نوازی بھی مرقوم ہے اور ضمیر جعفری کے اوصاف حسنہ بھی ''جہاں جاتے شگفتگی بکھیر دیتے منکسر المزاج، نیک خو، کم آزار، استغنا کی رمق وراثت میں آئی تھی'' (صفحہ ۱۳۲)

یوسفی صاحب کی ہاتھ سے کام کرنے کی عادت (صفحہ ۱۶۴) شفیق الرحمن اور کرنل محمد خان

کا ماحضر۔ غرض کتنے ہی ادیبوں کا تذکرہ اس خودنوشت میں ہے۔ حفیظ کاردار کی کسر نفسی اور علمیت کا بھی ذکر ہے۔ (صفحہ ۵۴) مگر ہم لوگ بھولنے میں فرد ہیں۔

ہلکے سے مزاح کا چھینٹا بھی۔ سر شہاب الدین نے کوین میری کالج کو تین لاکھ روپے کا عطیہ دیا۔ ان کے ابا ناراض ہو گئے کہا میں اس کے جنازہ میں شریک نہیں ہونگا۔ اسے عیسائیوں کے قبرستان میں دفناؤ۔ شملہ میں آمنا سامنا ہو گیا تو سر شہاب دین نے کہا محبوب الٰہی تم نے کہا ہے تم میرا جنازہ نہیں پڑھو گے۔ جواب ملا ''میرا دماغ پھرا ہے کہ تین من کی لاش اٹھانے آؤں؟'' (صفحہ ۱۰۱) مگر ان کے انتقال پر شیخ محبوب الٰہی تعزیت کے لئے پسرور پہنچے۔

سابق سکرٹری تعلیم کا یہ کہنا بھی کتنا معنیٰ خیز ہے کہ حکام سمجھتے ہیں کہ علم بجائے خود بڑی دولت ہے اس لئے اساتذہ کو اچھی تنخواہیں دینے کی کیا ضرورت ہے۔ (صفحہ ۵۹)

اس کتاب کا آخری باب زہرا منظور الٰہی کی شخصیت کے بارہ میں ہے۔ میرے دوست ڈاکٹر داؤد رہبر کو اردو خودنوشت نگاروں پر ہمیشہ اعتراض رہتا تھا کہ وہ اپنے اور اپنے احباب کے بارہ میں تو فراخ دلی سے لکھتے رہتے ہیں مگر اپنے ازدواج کا پہلو نظر انداز کر جاتے ہیں حالانکہ انسانوں کی زندگی کامیابی ناکامی کے اتار چڑھاؤ میں سب سے زیادہ شریک ان کی شریکہء حیات ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی یہ باب اس خودنوشت کا لازمی جزو ہے۔ زہرا کا پہلا فقرہ ہی جو میاں بیوی کے رشتہ میں منسلک ہونے کے بعد ان کے منہ سے ادا ہوا ''بسم اللہ'' کا مبارک کلمہ تھا اور اسی کلمہ کی برکات ان کی عمر بھر کی رفاقت میں جاری وساری رہیں۔

پھر ہمارے داؤد رہبر کو مجھ سے شکایت تھی کہ میں خودنوشتوں کو ایسے کڑے معیاروں پر جانچتا ہوں کہ نمونۃً مجھے خود اپنی خودنوشت لکھ کر دکھانی چاہئے کہ خودنوشت یوں لکھی جاتی ہے۔ خود تو خدا معلوم میں ایسی جرأت کر سکوں یا نہ کر سکوں۔ میں اپنے اس دوست کو ایک عزیز تر دوست کی خودنوشت ''ہم کہاں کے دانا تھے'' یہ کہہ کر دکھا سکتا ہوں کہ دیکھئے اس طرح کہتے ہیں سخن ور سہرا!

کتابیات سوم

۱۔ کچھ دیر پہلے نیند سے۔ سجاد نقوی۔ العصر پبلیکیشنز۔ ۱۴ مزنگ روڈ لاہور۔ پہلا ایڈیشن مارچ ۲۰۰۹

۲۔ ایک ادھوری سرگزشت۔ انیس ناگی۔ جمالیات۔ لاہور ۱۹۹۸

۳۔ روداد قفس۔ حفیظ نعمانی۔ تنویر پریس لکھنؤ۔ نومبر ۲۰۰۰

۴۔ سفیر اور سفارت کاری ایک دور کی کہانی۔ سمیع اللہ قریشی۔ پیرا ماؤنٹ پبلشنگ انٹر پرائز کراچی نومبر ۲۰۰۶

۵۔ تیسرا جنم۔ ڈاکٹر خالد جمیل اختر۔ زیب پبلشرز اردو بازار لاہور۔ ستمبر ۲۰۰۵

۶۔ یادوں کی دھنک۔ بریگیڈیئر ظفر اقبال چوہدری۔ اذان سحر پبلیکیشنز لاہور۔ فروری ۲۰۰۱

۷۔ کچھ لمحے مرے نصیبوں کے۔ محمد اعظم سبزواری۔ کراچی لائبریری پروموشن بیورو۔ ۲۰۰۷

۸۔ کاروان حیات۔ مولانا قاضی اطہر مبارک پوری۔ فرید بک ڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ دہلی نومبر ۲۰۰۳

۹۔ آشرم۔ شکیل الرحمٰن۔ عصمت پبلیکیشنز دہلی۔ مارچ ۱۹۹۲

۱۰۔ مرد آہن۔ خودنوشت حق نواز اختر مرتبہ عبادت اللہ خان دانیال اکادمی کراچی۔ مئی ۲۰۰۶

۱۱۔ مرد آہن دوسرا حصہ خودنوشت حق نواز اختر مرتبہ عبادت اللہ خان دانیال اکادمی کراچی اگست 2006

۱۲۔ قصہ بے سمت زندگی کا۔ وہاب اشرفی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ۲۰۰۸

۱۳۔ یاد ہے سب ذرا ذرا، عبید الرحمٰن ایڈووکیٹ، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی مارچ ۲۰۰۳

۱۴۔ شاد کی کہانی شاد کی زبانی۔ شاد عظیم آبادی۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ۔ نومبر ۱۹۵۸

۱۵۔ کچھ دھاگے سے بندھی یادیں۔ توصیف چغتائی۔ نتاشا کامنیکیشن کراچی ۱۹۹۵

۱۶۔ دھوپ چھاؤں۔ ڈاکٹر فاطمہ شاہ۔ عشبہ پبلشنگ انٹرنیشنل۔ کراچی ۲۰۰۶

۱۷۔ ذوق پرواز۔ محمد صدیق تہامی۔ شرکت المتیاز۔ اردو بازار لاہور سن اشاعت درج نہیں

۱۸۔ مبالغہ نہ مغالطہ۔ میاں محمد ارشد۔ رحمان جی پبلشرز۔ ٹرنر روڈ لاہور جولائی ۲۰۰۶

۱۹۔ بیتی کہانی۔ شہر بانو بیگم۔ القمر انٹر پرائز ز لاہور۔ ۲۰۰۶

۲۰۔ زندگانی کی گذرگاہوں میں۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز۔ تسنیم پبلیکیشنز اردو بازار لاہور۔ ستمبر ۱۹۹۴

۲۱۔ اور میں پاکستان آ گیا۔ ڈاکٹر سید منظر حسنین کاظمی۔ شیخ شوکت علی اینڈ سنز کراچی۔ ۲۰۰۵

۲۲۔ جہادِ زندگانی۔ مولوی فیروز الدین۔ فیروز سنز ۱۹۵۹

۲۳۔ سفر نامہ حیات ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی۔ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ۔ بار اول ۲۰۰۵

۲۴۔ بلاکم وکاست۔ مہدی علی صدیقی۔ شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ کراچی یونیورسٹی۔ جنوری ۲۰۰۲

۲۵۔ بلبلیں نواب کی۔ موسیٰ رضا۔ فضلی سنز کراچی۔ اشاعت اول ۱۹۹۸

۲۶۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ سیف الدین بوہرہ۔ شاد پبلیکیشنز کوئٹہ۔ ۲۰۰۵

۲۷۔ معین بیتی۔ ڈاکٹر سید معین الحق۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی۔ کراچی ۱۹۹۳

۲۸۔ سفر جاری ہے۔ ملک مقبول احمد۔ مقبول اکیڈمی لاہور۔ جنوری ۲۰۰۷

۲۹۔ معراج نامہ۔ ملک معراج خالد۔ جہانگیر بکس۔ لاہور کراچی ۲۰۰۸

۳۰۔ ان کی باتیں ہماری یادیں۔ ایس این خان۔ کراچی دسمبر ۱۹۹۵

۳۱۔ کچھ باتیں کچھ یادیں۔ محمد شمیم جیراجپوری۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۰۲

۳۲۔ ہوک۔ خودنوشت سوانح عمری از سکے دار۔ حکایات ٹمپل روڈ لاہور ۲۰۰۳

۳۳۔ میرے شب وروز۔ ڈاکٹر طٰحہٰ حسین۔ بک ہوم لاہور ۲۰۰۵

۳۴۔ پرواز۔ خودنوشت اے پی جی عبدالکلام۔ بک ہوم لاہور ۲۰۰۶

۳۵۔ گہر ہونے تک خودنوشت مالکم ایکس بک ہوم لاہور ۲۰۰۵

۳۶۔ انوار السادات کی خودنوشت۔ فیکٹ پبلیکیشنز ٹمپل روڈ لاہور۔ سن اشاعت درج نہیں۔

۳۷۔ کیا دن تھے۔ قاضی جلیل عباسی۔ دانش محل بک سیلرز لکھنؤ۔ دسمبر ۱۹۸۵

۳۸۔ My days at Aligarh Prof MN Farooqi. 1995

۳۹۔ A Princess remembers by Gyatri Devi. Rupa & co. New Delhi. 1965

۴۰۔ فضائیہ میں گذرے ماہ وسال۔ ایئر مارشل ریٹائرڈ ظفر چوہدری۔ آتش فشاں پبلیکیشنز لاہور ۲۰۰۵

۴۱۔ تماشا گاہِ عالم۔ خودنوشت زبیدہ سلطانہ۔ مقبول اکیڈمی لاہور ۲۰۰۷

۴۲۔ ایک دل ہزار داستان۔ خودنوشت آغا اشرف۔ آتش فشاں پبلیکیشنز ۱۹۸۹ لاہور

۴۳۔ حکایت ہستی۔ ڈاکٹر صغرا مہدی۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس گولا مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی۔ ۲۰۰۶ پہلا ایڈیشن

۴۴۔ نوشاد۔ موسیقار اعظم۔ مرتبہ فاروق ارگلی۔ فرید بک ڈپو۔ دریا گنج نئی دہلی۔ ۲۰۰۶

۴۵۔ آپ بیتی سید امیر علی۔ مکتبہ اسلوب کراچی ۱۹۸۴

۴۶۔ داستاں میری۔ تصدق حسین راجا۔ مکتبہ دانیال اسلام آباد۔ اشاعت اول ۱۹۹۵

۴۷۔ محمد کاظم کی سوانح عمری۔ ترجمہ از فارسی۔ جریدہ ۳۷۔ مشفق خواجہ کراچی

۴۸۔ سرگزشت کرنل سید حسنین احمد۔ سن طباعت ومقام نامعلوم

۴۹۔ آہنگِ بازگشت۔ مولوی محمد سعید۔ قومی ادارہ برائے تحقیق وتاریخ ثقافت اسلام آباد ۱۹۸۹

۵۰۔ چاہِ یوسف سے صدا۔ یوسف رضا گیلانی۔ نگارشات پبلشرز لاہور ۲۰۰۶

۵۱۔ عدالتِ عالیہ تک کا سفر۔ جسٹس (ریٹائرڈ) محمد اسلام بھٹی۔ نیاز مانہ پبلیکیشنز۔ ٹمپل روڈ لاہور، ۲۰۰۹

۵۲۔ جو بچے ہیں سنگ۔ تجمل حسین۔ سنگ میل پبلشرز لاہور۔ ۲۰۰۶

۵۳۔ آپ بیتی/ پاپ بیتی۔ ساقی فاروقی۔ اکیڈمی بازیافت کراچی جنوری ۲۰۰۸

۵۴۔ گھونگرو ٹوٹ گئے۔ قتیل شفائی۔ الحمد لاہور ۲۰۰۷

۵۵۔ سچا گیت گایا۔ ملکہ پکھراج۔ کالی برائے خواتین دہلی ۲۰۰۳

۵۶۔ میں تو بھارتی جاسوس نہیں تھا۔ میجر محمد اکرم خاں۔ آکسفرڈ یونیورسٹی پریس۔ ۲۰۰۲

۵۷۔ ایوان اقتدار کی جھلکیاں۔ گوہر ایوب خاں۔ آکسفرڈ یونیورسٹی پریس۔ ۲۰۰۶

۵۸۔ میری آخری منزل۔ جنرل محمد اکبر خاں رنگروٹ۔ لاہور ۲۰۰۶

۵۹۔ تین صدور کا ایڈی کانگ۔ امبیسیڈر ارشد سمیع خان۔ پینٹا گان پریس دہلی۔ ۲۰۰۸

۶۰۔ ہنگاموں میں زندگی۔ مشتاق احمد خاں وجدی۔ لاہور ۱۹۷۴۔ طبع دوم ۱۹۸۰

۶۱۔ نربدہ سے مہران تک۔ فتح اللہ عثمانی فکشن ہاؤس لاہور ۲۰۰۳۔

۶۲۔ واقعہء بھٹو سمیت۔ جنرل راحت لطیف۔ جنگ پبلشرز لاہور ۱۹۹۳

۶۳۔ جیون دھارا۔ جیون خاں۔ سنگت پبلشرز۔ ۶۲ سی لوئر مال روڈ۔ لاہور ۲۰۰۶

۶۴۔شناسائیاں رسوائیاں۔کشور ناہید۔سنگ میل پبلشرز لاہور ۲۰۰۷

۶۵۔لخت لخت داستان۔بریگیڈیئر اسمٰعیل صدیقی۔دوست پبلیکیشنز اسلام آباد ۲۰۰۱

۶۶۔ In the land of invisible women از ڈاکٹر قانتہ احمد۔امریکہ ۲۰۰۰

۶۷۔تجربات جو ہیں امانت حیات کی۔خودنوشت ثاقب زیروی۔لاہور ۲۰۰۸

۶۸۔کھلی کتاب۔خودنوشت عبدالستار ایدھی۔مرتبہ تہمینہ درانی۔نیشنل بیورو آف پبلیکیشنز اسلام آباد ۱۹۹۸

۶۹۔چند خوشگوار یادیں۔خودنوشت امام بشیر احمد رفیق۔قادیان۔۲۰۰۹

۷۰۔دیکھی تیری دنیا۔افضل توصیف۔فیروز سنز لاہور ۲۰۰۹

۷۱۔نایاب ہیں ہم۔حمیدہ اختر حسین۔دانیال کراچی۔بار سومِ جنوری ۲۰۰۳

۷۲۔ Daughter of Destiny. Benazir Bhutto. Simon and shuster, Simon and Shuster Building, Rockfeller center. 1230, Avenue of the Americas, New York 10020. 1989.

۷۳۔ Flight of the Falcon. Air Commodore Syed Sajjad Haider. Vanguard, Lahore. 2009

۷۴۔بیتے لمحوں کی چاپ۔خودنوشت پروفیسر سمیع اللہ قریشی۔بک ہوم لاہور ۲۰۰۹

۷۵۔ہم کہاں کہ دانا تھے۔شیخ منظور الٰہی۔سنگ میل لاہور ۲۰۱۰

✓

ضمیمہ

کتابیات پس نوشت اور پس پس نوشت

۱۔''سرگزشت''۔عبدالمجید سالک' الفیصل ناشران۔اردو بازار لاہور ۱۹۹۳ء

۲۔''سرگزشت''۔ذوالفقار علی بخاری۔غالب پبلشرز لاہور۔

۳۔''آشفتہ بیانی میری''۔رشید احمد صدیقی۔مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۸۹ء

۴۔''زرگزشت'' مشتاق احمد یوسفی دانیال کراچی۔

۵۔''خواب باقی ہیں'' آل احمد سرور۔ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۹۱ء

۶۔''تحدیثِ نعمت'' سر محمد ظفر اللہ خان۔ڈھاکہ بینیو ولینٹ ایسوسی ایشن۔۱۹۷۱ء

۷۔''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں''۔خواجہ غلام السیدین۔سیدین میموریل ٹرسٹ دہلی ۱۹۷۴ء

۸۔''شام کی منڈیر سے''۔وزیر آغا۔مکتبہ فکر و خیال لاہور ۱۹۸۶ء

۹۔''ناممکن کی جستجو''۔حمید نسیم۔فضلی سنز کراچی ۱۹۹۰ء

۱۰۔''جنرل کی آپ بیتی''۔میجر جنرل شاہد حامد۔جنگ پبلشرز لاہور ۱۹۹۲ء

۱۱۔''یادوں کی بارات'' جوش ملیح آبادی۔مکتبہ شعر و ادب لاہور ۱۹۷۵ء

۱۲۔''یادوں کی دنیا'' ڈاکٹر یوسف حسین خاں۔فکشن ہاؤس لاہور ۱۹۹۴ء

۱۳۔''اعمال نامہ''۔سر رضا علی۔خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ ۱۹۹۲ء

۱۴۔''آپ بیتی''۔عبدالماجد دریابادی۔مکتبہ فردوس لکھنؤ۔۱۹۸۸ء

۱۵۔''گردِ راہ''۔اختر حسین رائے پوری۔المسلم پبلشرز کراچی ۱۹۹۳ء

۱۶۔''شہاب نامہ''۔قدرت اللہ شہاب۔سنگ میل لاہور ۱۹۹۰ء

۱۷۔''میری داستانِ حیات'' ڈاکٹر غلام جیلانی برق۔غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۸۲ء

۱۸۔ ''جہانِ دانش'' ۔احسان دانش۔المسلم پبلشرز کراچی ۱۹۹۵ء

۱۹۔ ''سلیوٹ'' صدیق سالک۔مکتبہ سرمد بکس راولپنڈی ۱۹۸۹ء

۲۰۔ ''ناقابلِ فراموش'' ۔دیوان سنگھ مفتون۔مکتبہ اردو ادب لاہور ۱۹۵۷ء

۲۱۔ ''مٹی کا دیا'' ۔مرزا ادیب۔سنگ میل لاہور ۱۹۸۴ء

۲۲۔ ''جو رہی سو بے خبری رہی'' ۔ادا جعفری بدایونی۔دانیال کراچی ۱۹۹۵ء

۲۳۔ ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' شہرت بخاری۔سنگ میل لاہور ۱۹۸۷ء

۲۴۔ ''بری عورت کی کتھا'' ۔کشور ناہید۔سنگ میل لاہور ۱۹۹۳ء

۲۵۔ ''آتشِ چنار'' ۔شیخ محمد عبداللہ۔چوہدری اکیڈمی اردو بازار لاہور ۱۹۸۵ء

۲۶۔ ''خوں بہا'' ۔احمد شجاع۔آتش فشاں پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۱ء

۲۷۔ ''بوئے گل نالہء دل دودِ چراغِ محفل'' ۔شورش کاشمیری۔مکتبہ چٹان لاہور ۱۹۹۴ء

۲۸۔ ''یادِ ایام '' ۔عبدالرزاق کانپوری۔آتش فشاں پبلیکیز ۔۱۹۹۳ء (مضامین' یادداشتیں' خاکے)

۲۹۔ ''جو ملے تھے راستے میں'' ۔احمد بشیر۔مرتبہ یونس جاوید۔گورا پبلشرز لاہور ۱۹۹۶ء۔(خاکے)

۳۰۔ ''میرا سیاسی سفر'' مخدوم زادہ حسن محمود۔ جنگ پبلشرز لاہور ۱۹۸۸ء

۳۱۔ ''رو میں ہے رخشِ عمر'' ۔عبدالسلام خورشید۔آتش فشاں پبلیکیشنز لاہور۔

۳۲۔ ''آئینہء ایام'' کرنل غلام سرور۔نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی ۱۹۸۱ء

۳۳۔ ''مرقاۃ الیقین'' حکیم نورالدین۔مرتبہ اکبر شاہ خان نجیب آبادی۔احمدیہ انجمن اشاعت اسلام۔
لاہور ۱۹۱۵ء

۳۴۔ ''حیاتِ قدسی'' ۔مولانا غلام رسول راجیکی۔سیٹھ علی محمد الہ دین۔سکندر آباد دکن۔۱۹۵۱ء

۳۵۔ ''بہ یادِ صحبتِ نازک خیالاں'' ۔آفتاب احمد خان۔دانیال کراچی ۱۹۹۷ء۔(شخصی خاکوں کا مجموعہ)

۳۶۔ ''اس آباد خرابے میں'' ۔اختر الایمان۔اردو اکادمی دہلی ۱۹۹۶ء

۳۷۔ ''گفتنی ناگفتنی'' ۔وامق جونپوری۔خدا بخش اورئینٹل لائبریری پٹنہ۔۱۹۹۳ء

۳۸۔ ''دیواروں کے بیچ'' ۔ندا فاضلی۔معیار پبلیکیشنز نئی دہلی۔۱۹۹۲ء

۳۹۔ ''دیواروں کے باہر'' ۔ندا فاضلی۔معیار پبلیکیشنز دہلی

۴۰۔ ''گیان سنگھ شاطر'' ۔گیان سنگھ شاطر۔حیدر آباد۔انڈیا۔۱۹۹۶ء

۴۱۔ ''دردر ٹھوکر کھائے'' ڈاکٹر مبارک علی۔فکشن ہاؤس لاہور

۴۲۔ ''چراغوں کا دھواں'' انتظار حسین۔سنگ میل لاہور ۱۹۹۹ء

۴۳۔ '' شورشِ دوراں'' ۔حمیدہ سالم۔ادب پبلیکیز نئی دہلی ۱۹۹۵ء

۴۴۔ ''ڈگر سے ہٹ کر'' سعیدہ بانو احمد۔دہلی ۱۹۹۸ء

۴۵۔ ''گرداب کی شناوری'' زہرا داؤدی۔جاوداں کراچی ۱۹۹۶ء

۴۶۔ ''آپ بیتی'' ڈاکٹر میر محمد اسمٰعیل۔شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی لاہور۔۱۹۶۴ء

۴۷۔ ''ورودِ مسعود'' ڈاکٹر مسعود حسین خاں۔دہلی ۱۹۹۲ء

۴۸۔ ''گردشِ پا'' زبیر رضوی۔دہلی ۱۹۹۹ء

۴۹۔ ''ہماری منزل'' (انگریزی) سید ہاشم رضا۔کراچی ۱۹۹۸ء

۵۰۔ ''پاکستان: قیادت کا بحران'' ۔ جنرل جہانداد خان۔الشفا ٹرسٹ اسلام آباد ۲۰۰۰ء

۵۱۔ ''اپنا گریباں چاک'' جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال۔سنگ میل لاہور ۲۰۰۳ء

۵۲۔ ''جست بھر زندگی'' اکبر حمیدی۔رابطہ اسلام آباد ۱۹۹۷ء

۵۳۔ ''متاعِ کارواں'' سردار محمد چوہدری۔لاہور ۱۹۹۷ء

۵۴۔ ''غبارِ زندگی'' حسن نواز گردیزی۔لاہور۔۱۹۹۹ء

۵۵۔ ''عشرتِ فانی'' ۔عشرت رحمانی۔لاہور ۱۹۹۴ء

۵۶۔ ''انوکھا لاڈلا'' ۔محسن مگھیانہ۔لاہور ۱۹۹۷ء

۵۷۔ ''آپ بیتی'' خواجہ حسن نظامی دہلوی۔دہلی ۱۹۱۴ء

۵۸۔ ''اپنی تلاش میں'' کلیم الدین احمد۔پٹنہ۔۱۹۹۸ء

۵۹۔ ''میرے ماہ و سال'' جاوید شاہین۔لاہور ۱۹۹۹ء

۶۰۔ ''یادِ عہدِ رفتہ'' ۔ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ادارہ ادب و تنقید لاہور ۱۹۹۸ء

۶۱۔ ''عبدالغفور نساخ کی خودنوشت'' مرتبہ ڈاکٹر عبدالسبحان۔ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۹۸۹ء

۶۲۔ ''خامہ بگوش کے قلم سے'' ۔مرتبہ مظفر علی سید۔کراچی ۱۹۹۰ء (مضامین)

۶۳۔ ہم سفر از حمیدہ اختر حسین کراچی ۱۹۹۵ء

۶۴۔ نقشِ حیات از حسین احمد مدنی' دارالاشاعت اردو بازار کراچی اشاعت اول سن نامعلوم

۶۵۔ گنجینۂ گوہر از شاہد احمد دہلوی (خاکے)

۶۶۔ ''خبر گیر'' خودنوشت قیصر تمکین۔ دہلی

۶۷۔ ''مشتِ غبار'' چوہدری اقبال احمد گوندل۔ جنگ پبلشرز لاہور ۱۹۹۳ء

۶۸۔ ''دلی یاد آتی ہے''۔ روح افزا حیدر۔ ملٹی گرافکس اسلام آباد۔ ۲۰۰۲

۶۹۔ '' داستانِ غدر''۔ ۱۸۵۷ء کے چشم دید واقعات۔ خودنوشت راقم الدولہ سید ظہیر الدین ظہیر دہلوی داروغہ ماہی مراتب بہادر شاہ ظفر۔ مکی دارالکتب لاہور ۲۰۰۲ء

۷۰۔ ''میرا کوئی ماضی نہیں''۔ سحاب قزلباش۔ فضلی سنز۔ کراچی ۱۹۹۵ء (خاکے)

۷۱۔ ''میرا بیان'' اخلاق احمد دہلوی۔ مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۹۵ء

۷۲۔ ''میری کہانی'' اویس احمد دوراں۔ دہلی ۱۹۹۹ء

۷۳۔ خودنوشت ابوالکلام آزاد، مرتبہ ملیح آبادی دہلی ۲۰۰۲ء

۷۴۔ ''لاہور کا جو ذکر کیا''۔ گوپال متل، موڈرن پبلشنگ ہاؤس دہلی

۷۵۔ ''کوچۂ قاتل'' رام لعل۔ لکھنؤ ۱۹۹۵ء

۷۶۔ دل بھٹکے گا۔ احمد بشیر۔ فیروز سنز لاہور ۲۰۰۳

۷۷۔ میری داستان فرحت اللہ بیگ۔ حیدر آباد دکن ۱۹۷۰

۷۸۔ خاطرات۔ ظفر حسن آئبک۔ سنگ میل لاہور ۱۹۹۰

۷۹۔ خودنوشت سوانح حیات۔ مسعود کھدر پوش۔ کھدر پوش ٹرسٹ لاہور ۲۰۰۳

۸۰۔ جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی۔ کلیم عاجز۔ عرشی پبلیکیشنز دہلی 1981

۸۱۔ یہ لاہور ہے۔ ابوالحسن نغمی۔ سنگ میل۔ لاہور

۸۲۔ میرے ہمسفر۔ احمد ندیم قاسمی۔ اساطیر لاہور

۸۳۔ جہان حیرت۔ سردار محمد چوہدری لاہور ۲۰۰۲

۸۴۔ آپ بیتی یا ایم اے او کالج علیگڑھ کی کہانی۔ میر ولایت حسین۔ علیگڑھ ۱۹۴۶

۸۵۔ کتاب زندگی۔ فضلی سنز۔ کراچی ۲۰۰۴

۸۶۔ اور بستی نہیں یہ دلی ہے۔ رفعت سروش۔ دہلی ۱۹۹۳

۸۷۔ باغی شہزادی کی یادداشتیں۔ شہزادی عابدہ سلطان۔ Memoirs of a rebel

Princess آکسفرڈ پریس ۲۰۰۲

۸۸۔ گوہر گزشت۔ الطاف گوہر کراچی ۲۰۰۳

۸۹۔ پراگندہ طبع لوگ۔ داور رہبر سنگ میل لاہور۔ ۲۰۰۰

۹۰۔ زندگی زنداں دلی کا نام ہے۔ ظفر اللہ پوشنی۔ لاہور ۲۰۰۰

۹۱۔ خیمہ میں واپسی۔ جنرل عتیق الرحمن۔ Back to the Pavillion آکسفرڈ پریس کراچی

۹۲۔ یادداشتیں اور تاثرات۔ چیف جسٹس نسیم حسن شاہ۔ Reflections and Memoirs الحمراء اسلام آباد ۲۰۰۲

۹۳۔ جہانِ دگر احسان دانش۔ خزینۂ علم و ادب لاہور ۲۰۰۱

۹۴۔ اور پھر بیاں اپنا۔ اخلاق احمد دہلوی مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۹۵

۹۵۔ تماشائی کی یادداشتیں۔ اقبال اخوند۔ Memoirs of a Bystander آکسفرڈ پریس ۱۹۹۷

۹۶۔ سفر آدھی صدی کا۔ عبدالکریم عابد۔ ادارہ معارف اسلامی کراچی ۲۰۰۳

۹۷۔ لمحات۔ خرم مراد۔ منشورات لاہور ۲۰۰۴

۹۸۔ عدالتیں کانچ کے گھر میں۔ چیف جسٹس سجاد علی شاہ۔ Law Courts in a Glasshouse آکسفرڈ پریس ۲۰۰۱

۹۹۔ میرا افسانہ۔ افضل حق۔ لاہور ۱۹۹۱

۱۰۰۔ گم شدہ لوگ۔ آغا ناصر۔ سنگ میل۔ ۲۰۰۳

۱۰۱۔ یادداشتیں۔ پروفیسر حبیب الرحمن۔ بہادر یار جنگ اکیڈمی کراچی

۱۰۲۔ خاک کے پردے۔ آغا سہیل۔ لاہور ۲۰۰۴

۱۰۳۔ جائزہ۔ جسٹس محمد احمد خاں صمدانی۔ سنگ میل لاہور ۲۰۰۳

۱۰۴۔ ایک جج بولتا ہے۔ چیف جسٹس اجمل میاں۔ A Judge Speaks Out آکسفرڈ پریس کراچی

۱۰۵۔ دیر پا محبت۔ سابق ملکہ فرح پہلوی۔ An Enduring Love. Miramaax Books, New york 2004

١٠٦۔ آپ بیتی جگ بیتی۔ سعد راشد الخیری۔ فکشن ہاؤس لاہور ٢٠٠٤

١٠٧۔ گئے دنوں کا سراغ۔ نثار عزیز بٹ۔ سنگ میل۔ لاہور

١٠٨۔ کار جہاں دراز ہے۔ قرۃ العین حیدر۔ سنگ میل ٢٠٠٣

١٠٩۔ میری داستان محمد منصور کاظم۔ کراچی ٢٠٠٢

١١٠۔ ہاں میں باغی ہوں۔ مخدوم جاوید ہاشمی ساگر پبلیکیشنز لاہور ٢٠٠٥

١١١۔ میں کیا میری حیات کیا۔ پروفیسر اطہر صدیقی ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ ٢٠٠٣

١١٢۔ نامہ اعمال۔ نواب سر یامین خاں۔ آئینہ ادب لاہور ١٩٧٠

١١٣۔ غبار کارواں۔ بیگم انیس قدوائی۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ ١٩٨٣

١١٤۔ امرتسر کی یادیں۔ اے حمید۔ لاہور ١٩٨٤

١١٥۔ منزلیں گرد کی مانند۔ خلیق ابراہیم خلیق۔ فضلی سنز کراچی۔ ١٩٩٩

٦١١۔ یاد خزانہ۔ جمیل زبیری۔ دانیال کراچی ١٩٩٣

١١٧۔ زندگی کی شہراہیں اور پگڈنڈیاں۔ چیف جسٹس محمد منیر۔ High ways and Byways of Life لاہور ١٩٧٨

١١٨۔ رسیدی ٹکٹ۔ امرتا پریتم۔ لاہور پبلشر اور سن اشاعت نامعلوم۔

١١٩۔ یادوں کے سائے۔ عتیق صدیقی۔ مکتبہ جامعہ دہلی ١٩٧٤

١٢٠۔ شاد کی کہانی شاد کی زبانی۔ شاد عظیم آبادی۔ معارف پریس اعظم گڑھ۔ ١٩٥٨

١٢١۔ اردو میں خودنوشت سوانح عمریاں۔ مقالہ پی ایچ ڈی۔ لکھنؤ یونیورسٹی ڈاکٹر صبیحہ انور۔ نامی پریس لکھنؤ ١٩٨٢

١٢٢۔ آشنائیاں کیا کیا۔ حمید اختر۔ جنگ پبلشرز لاہور۔ ٢٠٠٣

١٢٣۔ احوال واقعی اخباری کالم۔ بک ہوم لاہور ٢٠٠٥

١٢٤۔ کال کوٹھری (زنداں نامہ) حمید اختر۔ جنگ پبلشرز ١٩٩٣

١٢٥۔ احوالِ دوستاں۔ حمید اختر۔ لاہور ١٩٩٨

١٢٦۔ گلشنِ یاد۔ آغا ناصر۔ سنگ میل لاہور ٢٠٠٥

١٢٧۔ گولیوں کی زد میں۔ پرویز مشرف۔ فری پریس نیویارک۔ .In the Line of Fire ٢٠٠٦

١٢٨۔ ڈھلتے سائے۔ منیر الدین احمد۔ قوسین لاہور

١٢٩۔ آپ بیتی مولانا زکریا کاندھلوی مہد الخلیل الاسلامی بہادرآباد کراچی۔

١٣٠۔ کالا پانی۔ مولانا جعفر تھانیسری۔ طارق اکیڈمی فیصل آباد ٢٠٠١

١٣١۔ چہرے۔ سحاب قزلباش۔ اشارات پبلیکیشنز مارچ ٢٠٠٢

١٣٢۔ گمنام و بے ہنر۔ محمد سعید احمد لاہور ٢٠٠٥

١٣٣۔ پاکستان خواب پریشان۔ روئیداد خان۔ Pakistan a Dream Gone Sour
آکسفرڈ یونیورسٹی پریس ١٩٩٧

١٣٤۔ یاد ایام۔ نواب احمد سعید خاں چھتاری۔ مسلم ایجوکیشنل پبلشرز علیگڑھ۔

٥٣١۔ گئے دنوں کا سراغ۔ مظفر وارثی۔ خزینۂ علم و ادب۔ لاہور مارچ ٢٠٠٠

٦٣١۔ یادوں کی مالا رمیض احمد ملک۔ تخلیقات مزنگ روڈ۔ لاہور ٢٠٠١

٧٣١۔ ڈی سی نامہ۔ محمد سعید شیخ۔ سنگ میل لاہور ٢٠٠٤

٨٣١۔ پریم چند کی آپ بیتی مدن گوپال۔ موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ٢٠٠١

٩٣١۔ ان دیکھی گہرائیاں۔ ہارون ابن علی۔ ایون بکس لندن۔ بزم تخلیق ادب پاکستان کراچی ٢٠٠٦

١٤٠۔ یادوں کی نگری۔ حافظ بدرالدین۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ٢٠٠٢

١٤١۔ چھتیس برس۔ ایم ایم حسن۔ انجمن علم و دانش کراچی ١٩٩٣

١٤٢۔ دیدہ شنیدہ۔ سید شہاب الدین دسنوی۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ١٩٩٣

١٤٣۔ لخت لخت داستان۔ بریگیڈیر اسماعیل صدیقی۔ دوست پبلیکیشنز اسلام آباد۔ ٢٠٠١

١٤٤۔ تمنا بیتاب۔ رشید امجد۔ حرف اکیڈمی پشاور روڈ راولپنڈی ٢٠٠٣

١٤٥۔ عمر رفتہ۔ نقی محمد خاں خورجوی۔ ادارہ علم و فن کراچی ٢٠٠٣

١٤٦۔ داستان امیر حمزہ شنواری (گفتگو خاطر غزنوی) سنڈیکیٹ آف رائٹرز پشاور ١٩٩٦

١٤٧۔ کہانی مختصر کوئی نہیں ہے۔ غوث متھراوی۔ ظہوریہ اکیڈمی خیابان بدر کراچی ٢٠٠٣

١٤٨۔ جگر لخت لخت۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ مکتبہ خیابان ادب لاہور ٢٠٠٥

١٤٩۔ زندگی کی یادیں۔ جہاں آرا حبیب اللہ۔ آکسفرڈ پریس کراچی ٢٠٠٣

١٥٠۔ پاپ بیتی۔ اشفاق نقوی۔ نیو لائن کیولری گراؤنڈ لاہور

۱۵۱۔ عمر گزشتہ۔ سمیع محمد خاں۔ بزم تخلیق ادب پاکستان کراچی ۲۰۰۶

۱۵۲۔ بتیس برس امریکہ میں۔ ابوالحسن نغمی۔ سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۲۰۰۶

۱۵۳۔ حیات بقا اور کچھ یادیں۔ محمد مظہر بقا زوار اکیڈمی پبلیکیشنز کراچی ۲۰۰۶

۱۵۴۔ دنیا ساری خواب۔ شیخ ایاز۔ الفاظ پبلیکیشنز لاہور ۱۹۹۸

۱۵۵۔ جنت سے نکالی ہوئی حوا۔ نفیس بانو شمع۔ آبشار پبلیکیشنز جامعہ نگر دہلی۔ ۱۹۹۸

۱۵۶۔ کاروانِ حیاتِ نواب مشتاق احمد خاں۔ ۱۸۰ ڈی ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۹۷۴

۱۵۷۔ سفر زندگی۔ مہاراجہ کرن سنگھ سابق مہاراجہ کشمیر سرینگر

۱۵۸۔ نشانِ جگر سوختہ۔ ڈاکٹر سلیم اختر۔ سنگ میل لاہور ۲۰۰۵

۱۵۹۔ کارنامہء سروری۔ علی گڑھ یونیورسٹی پریس، ۱۹۲۹

۱۶۰۔ ایم ایف حسین کی کہانی اپنی زبانی۔ احمد مقصود حمیدی۔ خیابان باغبان کراچی ۲۰۰۴

۱۶۱۔ یاد کی رہگزر۔ شوکت کیفی۔ دانیال کراچی ۲۰۰۶

۱۶۲۔ داستاں کہتے کہتے۔ صبیح محسن۔ مکتبہ جمال گلستان جوہر کراچی ۲۰۰۶

۱۶۳۔ داستان حافظ بزبان حافظ۔ خودنوشت حافظ قدرت اللہ۔ لانگ ول کیوبیک کینیڈا ۲۰۰۶

۱۶۴۔ حیات مستعار۔ جلیل قدوائی۔ کراچی ۱۹۹۸

✓

ڈاکٹر پرویز پروازی

نام: ناصر احمد خاں

قلمی نام: پرویز پروازی

جائے پیدائش: قادیان

تاریخ پیدائش: 20 اکتوبر 1936

1958۔ تعلیم: بی اے آنرز۔ تعلیم الاسلام کالج ربوہ

1960۔ ایم اے، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

1968۔ پی ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی

تدریس:

1960۔ گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ

1961 تا 1969 تعلیم الاسلام کالج ربوہ، لیکچرار

1969 تا 1975 تعلیم الاسلام کالج، پروفیسر

1975 تا 1979 وزیٹنگ پروفیسر، اوساکا یونیورسٹی آف فارن سٹڈیز، جاپان

1979 تا 1982 انٹر کالج کمالیہ، اسسٹنٹ پروفیسر

1982 تا 1986 مسلم انٹر کالج چک 41 ج ب فیصل آباد، اسسٹنٹ پروفیسر

1986 تا 1990، گورنمنٹ کالج فیصل آباد، اسسٹنٹ پروفیسر

1991 تا 2001 (دوسری ہجرت کے بعد) پروفیسر ریسرچ ایٹ اپسالا یونیورسٹی سویڈن

تصنیفات و تالیفات:

1964۔ ذکر اردو، تعلیم الاسلام کالج کی پہلی کل پاکستان اردو کانفرنس کے مضامین کا مجموعہ،

1977۔ خوبصورت جاپان اور میں، کاوا باتا یاسوناری کی نوبل سپیچ کا اردو ترجمہ

1978۔ یوکی گونی، کاوا باتا کے نوبل ناول کا اردو ترجمہ،

1980۔ جاپان کا سب سے لمبا دن،

1980۔ جاپان کی ہائیکو شاعری کا انتخاب اور ترجمہ،

1981۔ سورج کے ساتھ ساتھ، جاپان کا سفر نامہ

1997۔ صدائے آب، ہائیکو پر تنقیدی مضامین،

2002۔ آ کی مے، ہیروشیما کے المیہ کے پس منظر میں ناول

2003۔ احمدیہ کلچر

2003۔ سر ظفر اللہ کا تحریک آزادی میں حصہ

2003، پس نوشت۔ اردو کی خودنوشت سوانح عمریوں کا جائزہ

2005۔ سر ظفر اللہ کی یاداشتیں،

Reminiscences of Sir Zafarullah 2006

2008۔ پس نوشت اور پسِ پس نوشت (مزید خودنوشت سوانح عمریوں کا تجزیہ)

2010۔ پس نوشت سوم (مزید خودنوشتوں کا جائزہ)

خودنوشتوں کے تجزیہ کا کام جاری ہے، جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

حاصل عمر: ''حبل الورید'' قرآن حکیم کا اردو ترجمہ (غیر مطبوعہ)

تیسری ہجرت کے بعد 2003 سے کینیڈا میں مقیم ہیں